

ناہید

www.FreePdfBooks.org



رضیہ بیٹ



وہ کھڑکی میں کھڑکھری متھکر نظروں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کا دماغ بوجھل تھا۔ اور اترے ہوئے اداس چہرے پر حتمی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی۔ سہتی ہوئی آنکھوں کو بند کر لیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ بے ربطی سوچ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ سنگار میز کے پاس پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گئی۔ آئینے میں اس نے دیکھا اس کا معصوم حسن سوگوار تھا۔ آنکھوں میں ٹھہرا ہوا اضطراب اور چہرے پر تفکرات۔ سسے پھیلے ہوئے تاریک سائے دیکھ کر وہ گھبرا گئی صبح سے وہ کئی بار رو چکی تھی۔ آنسو اب بھی اس کی پلکوں پر موتیوں کی طرح لرز رہے تھے۔ اس نے پھر آئینے میں دیکھا حسین آنکھیں آنسوؤں سے یوں جھملا رہی تھیں جیسے زیرِ آب دو شمعیں روشن ہوں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

”تم پھر رو رہی ہو“۔ فیروز نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

ناہید نے پلٹ کر روتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور اور پھر نفرت سے منہ پھیر لیا۔

فیروز بغل سے کپڑوں کا بھاری تھیلا نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔

”بڑی ضدی لڑکی ہے۔ ماں سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی ہے۔“

اس نے تھیلا ناہید کے پلنگ پر پھینک دیا۔ جیب سے سگریٹ نکالا اور لا پرواہی سے سلگاتے ہوئے بولا

”میرا نام فیروز ہے۔“ اس نے بھیجی ہوئی دیاسلائی کھڑکی سے باہر پھینک دی ”ایسی بد دماغ چمور کیوں کو ٹھیک کرنا جانتا ہوں۔“

وہ ایک شیطانی نمی ہنسا۔ اس مکروہ مسکراہٹ سے اس کا چہرہ کچھ ڈراؤنا سا ہو گیا۔ وہ پلنگ سے ہٹ کر ناہید کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا

”تم ایک رنڈی کی لڑکی ہو۔ رنڈی کا لفظ تمہاری پیشانی سے کوڑھ کے داغ کی طرح کبھی نہیں مٹ سکتا۔“

فیروز کا غیر شائستہ طرز گفتگو اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بھری ہوئی شیرینی کی طرح مزی۔ اور ترائی سے ایک تھپڑ فیروز کے منہ پر دے مارا۔
وہ اس غیر متوقع حرکت سے بھنا گیا۔ غصے سے اس کے نتھن پھڑکنے لگے۔ دانت پس کر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا ”تمہاری یہ مجال“۔
ناہید غصے سے کانپ رہی تھی ”نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ تم انسانیت کے پردے میں چھپے ہوئے شیطان ہو“۔

فیروز ایک کامیاب دلال تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھے۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر غصہ پی گیا۔ وہ کئی بھولی بھالی دو شیزاؤں کو نساوانیت کی بلندی سے گرا کر معصیت کی پستیوں میں پھینک چکا تھا۔ اس کی جچی تلی باتوں اور فریب کے سنہری جال میں پھنس کر کئی معصوم جوانیاں تباہ ہو چکی تھیں۔ اب وہ ناہید پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اسے پھنسا رہا تھا۔ برکار ہا تھا۔

فیروز اپنا گال سلانا ہوا ڈھٹائی سے ہنسا ”ظالم غصے میں تو تو اور بھی بیماری لگ رہی ہے۔ ایک بار بازار میں آؤ لے پھر دیکھنا تیری اک اک اوپر لوگ مریشیں گے“۔

”اماں“ ناہید بے بس ہو کر چلائی۔ دوسرے کمرے سے آیا دوڑتی ہوئی آئی۔

”کیا ہے بیٹی“

”اسے کہہ دو“ وہ فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اسے کہہ دو مجھے تنگ نہ کرے“۔

غصے سے بات منہ سے نہ نکل رہی تھی۔ آیا کے بچپن سالہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں۔ اس نے فیروز کی طرف دیکھا۔ جو تھیلے میں سے کپڑے نکال کر پلنگ پر پھیلا رہا تھا۔ سرخ ساٹن کا غرارہ۔ کامدانی چولی اور تاروں بھری اوڑھنی۔

”دیکھو تو کتنے خوبصورت کپڑے لایا ہوں“۔

”واقعی“ آیائے اپنی بوڑھی آنکھوں میں جوانی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”آج رات سیٹھ ہاشم آرہے ہیں“۔

وہ سیٹھ ہاشم سے ناہید کی عصمت کا سودا کر چکا تھا۔

”اچھا“ آیائی۔

ناہید پریشانی کی کیفیت طاری تھی۔ آج صبح سے گھر میں ہلچل مچل ہوئی تھی۔

صفائی ہو رہی تھی۔ گاؤں کیوں پر سائن کے نئے غلاف چڑھائے گئے تھے۔ چاندنی کا نیا فرش بچھایا گیا تھا۔

چمکتا ہوا نیا پاندان آیا تھا۔

تم کبھی وہ نہیں بن سکتی جو تم بننا چاہتی ہو۔ تمہیں میری مرضی پر چلنا ہوا گا۔

”یہ ناممکن ہے“ ناہید نے غصے سے کہا۔

”تم اپنی حیثیت بھول رہی ہو۔ تمہاری ماں طوائف تھی۔ شریفانہ زندگی بسر کرنے کا حق تم سے چھن چکا ہے“ پچاس سالہ فیروز نے دانٹائی سے اسے سمجھانا چاہا۔
”میری ماں جو کچھ بھی تھی میں“۔

”رنڈی کی لڑکی رنڈی ہی ہوتی ہے“۔ فیروز ناہید کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”کبھی نہیں“ ناہید نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کی گلابی پوروں سے رخساروں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔

”ناہید! مت بھولو کہ تم گناہ کی تخلیق ہو۔ تمہارے جسم سے وہ بدبو نکلتی ہے جس میں ساج کی لمبی ناک دور ہی سے سونگھ سکتی ہے۔ ساج تمہیں ایک شریف عورت کا درجہ کبھی نہیں دے گا۔

”تم جھوٹے ہو“ میرا پاپ..... میرا پاپ“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

فیروز نے بھدرا سا قہقہہ لگایا اس کے سانولے لبوترے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”باپ“ وہ طنز کے ساتھ بولا ”باپ کی کمائی تمہاری ماں کے دماغ کی اخراج تھی“۔

اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

ناہید نے حقارت سے اس کا ہاتھ جھک دیا۔ اس نے بھونکیں سکڑ لیں۔ فیروز دوسرے لمحے ہنستا ہوا ناہید کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”ہر ہاتھ تمہارا گلشن حسن تاراج کرنے کے لئے بڑھ سکتا ہے۔ سارا دینے کے لئے نہیں۔ میری بات مان جاؤ تمہیں کوئی مقام“۔

”میں اپنا مقام خود بناؤں گی“ ناہید اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی..... اس کی آنکھیں اک عزم سے چمکنے لگیں۔

”تم ابھی انجان ہو“۔

”اتنی انجان بھی نہیں۔ کہ اپنا اچھا پرانہ سمجھ سکوں“۔

”مجھ سے بگاڑا چھانیں۔ تمہارا مستقبل میرے سہارے ہی چمک سکتا ہے۔ تم شاید نہیں جانتی کہ میری رسائی کہاں تک ہے“۔

”فیروز“ وہ غصے سے چبئی۔ اس کی حسین آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔

”نجم اور سلیمہ سے پوچھو“۔ وہ اس کے غصے پر بے نیازی سے مسکرا دیا۔

”مجھ سے ذرا گزری تھیں۔ اب کوئی پوچھتا بھی نہیں انہیں کوٹھے دیر ان پڑے ہیں۔

”میرا انعام“ آیا نے لپٹائی ہوئی نظروں سے“ اسے دیکھا۔
 ناہید نے سراٹھا کر آیا کو دیکھا۔ چاندی کے سکوں نے آیا کا ضمیر خرید لیا۔
 ”تمہارا انعام“ فیروز خوشی سے جموتے ہوئے بولا ”پورے ایک سو روپے“
 ”بس!“
 ”اور“

”نہ ہزار نہ پانچ سو۔ نہیں بابا کچھ تو بڑھاؤ مشکل کام تو میرا ہے۔“
 ”اچھا دو سو“

”نہیں کم از کم پانچ سو تو ہوں۔“

”اچھا پانچ سو ہی سہی“

”کچھ بیشک بھی دو“۔ آیا ہنستے ہوئے بولی ”تمہارا کیا اعتبار“۔

”لو بڑھایا کیا یاد کرو گی“ فیروز نے جیب سے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
 ”جگ جگ جیو“۔

”بس تم اسے وقت پر تیار رکھنا“

”وہ سب ٹھیک ہو گا تم بالکل فکر نہ کرو“ بڑھیا نے اسے اطمینان دلایا۔

ناہید کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ ان کی آوازیں جیسے وہ بہت دور سے سن رہی ہو۔

”اب سارا معاملہ تمہارے اوپر ہی ہے۔ مجھے ذرا بازار جانا ہے۔ کچھ پینے کے لئے لاؤں گا۔ ذرا سیٹھ

صاحب ضرورت سے زیادہ ہی پیتے ہیں۔“

”ارے ہاں بازار جا رہے ہو“ آیا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”ہاں کچھ کام ہے کیا“

”کب تک لوٹو گے“

”تو بجے سے پہلے ہی آ جاؤں گا“۔

”آیا نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجتے میں دس منٹ تھے۔ کچھ سنگار

کی چیزیں چائیں تھیں۔ بیٹا کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”تم تادوس لے آؤں گا“۔

”چلو میں لکھوائے دیتی ہوں“ دونوں دوسرے کمرے میں آ گئے۔

فیروز نے جیب سے ڈائری نکالی۔ آیا لکھوا رہی تھی۔ اور وہ جلدی جلدی لکھ رہا تھا۔

”اماں..... میں کیا کروں“ ناہید نے دمکتی ہوئی نظروں سے آیا کی طرف دیکھا۔

”جو یہ کہہ رہا ہے وہی کرنا ہو گا“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

ناہید کی روح لرز گئی۔

”اماں..... یہ..... یہ تم کہہ رہی ہو“

فیروز کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”اپنی ضد چھوڑ دو بیٹی“ وہ پیار سے اسے ہسلانے لگی۔

”تم کیا کہہ رہی ہو“..... ناہید نے بوڑھی آیا کو جھنجھوڑا لیا۔

”ہم ٹھہرے نوکر..... جس کا کھائیں گے اسی کے من گائیں گے“ وہ فیروز کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

”جب تک تمہاری ماں زندہ تھی۔ اس کا کہنا نا۔ اب یہ دے رہا ہے۔ اس کے حکم پر چلوں گی۔“

آیا کے تیور دو چار دن سے بدلے ہوئے تھے۔ اور آج ناہید کو اپنی ساعت پر یقین نہ آ رہا تھا۔

”اپنی ضد چھوڑ دو اس میں تمہاری بھلائی ہے بیٹا“۔

ناہید بھونچکی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں جھیل گئی۔ وہ بچی نظروں سے آیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس

عورت کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے اسے پالا اور ساتھ اسے شرافت کے اصولوں سے روشناس کرایا تھا۔ نیکی اور

پارسائی کی تعلیم دی تھی۔ اب اب وہی عورت اس مجسم شیطان کے ہاتھوں کٹ پٹی کا ناچ ناچ رہی تھی..... ناہید

لرز رہی تھی۔ سارا زمانہ اسے اپنا دشمن نظر آ رہا تھا۔ انسانیت کا لبادہ اوڑھے خونی بھیڑیے اس کی طرف بڑھ رہے

تھے ”وہ آہلی کیا کرے گی۔ کیونکر ان ناگمانی آفتوں کا مقابلہ کر سکے گی۔ دنیا میں ایک آیا سارا تھا وہ بھی جاتا

رہا“ وہ سوچتے ہوئے بے دم سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے لاش تازی اندھیروں کا سیلاب امنڈا

چلا آ رہا ہے اور وہ تاریکیوں میں ڈوب رہی ہے۔

”آج ہی آرہے ہیں..... کیا نام لیا تھا تم نے ان کا“ آیا نے پوچھا۔

”سیٹھ ہاشم آج رات دس بجے کے بعد آئیں گے“

”بس تم بے فکر رہو بیٹی ہے گھبراہٹ میں اسے رام کر لوں گی۔“

”یہ کپڑے رات کو اسے پہناؤ نا“۔

”میری بیٹی تو چاند نظر آئے گا ان کپڑوں میں جج دیکھ کر پھڑک اٹھیں گے سیٹھ صاحب“

”بس یہی میں چاہتا ہوں۔ پانچ ہزار پر معاملہ طے ہوا ہے۔ یہ تو بنگی ہے روئے جاری ہے۔ اسے تو اپنی

قسمت پر ناز کرنا چاہئے پانچ ہزار اداری بڑھیا پانچ ہزار“

وہ اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پھیلاتے ہوئے خوشی سے بولا۔

”بالکل بالکل“ فخر نے ہوا میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
”انگہ چل دیا۔“

ناہید نے آخری نگاہ اس عمارت پر ڈالی جس کا اوپر کا حصہ رہائشی تھا۔ اور نچلا حصہ جنسی منڈی جہاں حسن کے ڈھیر پر سرمایہ بولی دیتا تھا۔ جہاں صحت سکوں کے عوض کچنی تھی۔ جہاں جذبات کو چند روپے ملی ٹھیکروں کے بدلے بیچا جاتا تھا۔ اور جہاں اس کی ماں نے زندگی کے طویل اٹھارہ سال گزارے تھے۔

”کہاں جاتا ہے“ ”تاکے والے نے پوچھا۔
”اشیش پور میں آیا ہے کالی شال کھول کر ناہید پر ڈالتے ہوئے کہا۔
”انگہ اشیش کی طرف بھاگنے لگا۔

کئی دکانیں گھومنے بعد فیروز آباد کی مطلوبہ اشیاء لے کر کوئی سوا نو بجے گھر آیا۔ وہ سیدھا ناہید کے کمرے کی طرف گیا۔

”لو بھی دیکھ لو“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ کمرہ خالی تھا۔
شام کو جو وہ کپڑے لایا تھا۔ پنگ پر بکھرے پڑے تھے۔ چلی گئے پر پڑی تھی۔ غرارہ دوپٹے میں الجھا ہوا پنگ پر سے بے ترتیبی سے لٹک رہا تھا۔
”بڑی بی“ فیروز نے کمرے میں سے باہر نکلنے ہوئے پکارا۔

”کہاں ہو“ اب وہ دوسرے کمرے میں کھڑا تھا۔ لفافے بڑی احتیاط سے اس نے میز پر رکھ دیئے۔
”آیا“ صحن میں آکر وہ زور سے چلایا گھر کی ملازمہ ڈرتی ڈرتی باورچی خانے سے نکل آئی۔ وہ کئی سال سے فیروز کے پاس کھانا پکانے پر نوکری تھی۔ اور اس بد طبیعت انسان سے بے حد ڈرتی تھی۔
”کہاں ہے بڑی بی“

”وہ تو بازار میں ہیں“ وہ سہمی ہوئی بولی۔
”بازار..... کس لئے“

”کہہ رہی تھیں بیٹا کو کچھ سنگاری چیزیں خریدنا ہیں۔“

فیروز کچھ سوچنے لگا۔ سنگاری چیزیں تو اس سے منگوائی تھیں۔ پھر بازار جانے کا مقصد۔
”ناہید کہاں ہے۔“

”وہ بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔“

فیروز کا ہاتھ ٹٹکا۔ اس کے دماغ میں سو سے رینگنے لگے۔ شے جانے لگے جلدی سے بولا۔
”کب گئی تھیں۔“

نوکلیے کانٹوں جیسی پکلیوں کی گھٹی جما لیں۔ خوبصورت ناک۔ ریلے ہونٹ۔ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا گداز جسم قیامت خیز قد..... شمالی رنگت..... وہ حسن معصومیت و قار اور سادگی کا دکھل مرقع تھی۔

”ناہید“ ”آئیے اے آواز دی۔“ چند منٹ بعد وہ غسل خانے سے تیار ہو کر نکل آئی۔ ہلکے نیلے رنگ کے کپڑوں میں وہ کوئی آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی بالوں کی آوارہ لٹیں اس کے رخ روشن پر غار ہو رہی تھیں۔ سرخ رنگ کے فیتے میں بندھے ہوئے قدرتی لمبوں والے بال اس کے شانوں پر پڑے تھے۔

”کوئی سویٹر تو پہن لو بہتر وغیرہ تو ہو گا نہیں۔ رات کو گاڑی میں ٹھنڈ ہوگی“
”اچھا“ کہہ کر اس نے الماری سے سرخ رنگ کا سویٹر نکال کر پہن لیا۔ پھوٹی سی کالی شال تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑی۔

”میرا خیال ہے کوٹ بھی لے لو“

”اچھا“

”میں فخر کو تاکنے کیلئے کہتی ہوں“ یہ کہہ کر آیا باہر صحن میں آگئی..... فخر سامنے والے کمرے کے دروازے میں بیٹھا انگہ رہا تھا۔ وہ دن رات نشتے میں دھت رہتا تھا۔

”فخر..... ارے او فخر۔“

”کیا ہے بڑی بی“ وہ بڑبڑایا

”ذرا نیچے چل کر ایک انگہ تو پکڑنا۔“

”انگہ“

ارے ہاں جلدی کرو۔ بیٹا کو بازار سے کچھ سنگاری چیزیں لانا ہیں وہ..... وہ اپنے سینٹھ صاحب آج رات کو آرہے ہیں نا!“

”ہاں ہاں“ فخر اپنے میلے میلے دانت نکال کر ہنسا۔ ”آج تو عید ہے بڑھیا۔ عید سینٹھ صاحب آرہے ہیں خود بھی پیشین گے ہمیں بھی پلائیں گے عید ہوگی۔ آج تو“ وہ خوشی سے جھومنے لگا۔

”باتیں ہی بتائے جاؤ گے جلدی بھی کرو۔ واپس بھی لوٹنا ہے ہمیں۔“

فخر نے جاکر انگہ روک لیا۔ ناہید مسرور سی آیا کے پیچھے پیچھے بیڑھیاں اتر رہی تھی اس کا دماغ تھک چکا تھا۔ نہ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ نہ سمجھ رہی تھی۔ آیا دروازے تک گھر کی نوکرائی کو کچھ تاکید کرتی رہی۔ اور پھر سارا دے کر اسے تاکنے پر سوار کرایا۔

”کب تک لوٹو گی“ فخر نے آیا سے پوچھا۔

”کوئی ایک گھنٹہ تک۔ میرے آنے تک ساری جگہ ٹھیک ہو۔ سمجھ گئے نا؟“

”کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہو گا“ ملازمہ اپنا پھٹا ہوا دوپٹہ سر پر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ ”بس آنے والی ہی ہو گی اب تو۔“

”میرے جانے کے بعد گئی تھیں کتنی دیر بعد گئی ہو گی۔“

”کوئی دس پندرہ منٹ بعد۔“

”ابھی تمہارا گھنٹہ ہی ہوا ہے۔“

وہ غصے سے گر جلا ملازمہ سم کر دیوار سے لگ گئی ”نون بج چکے ہیں۔ فحرو کہاں ہے۔“

”وہ ابھی ابھی گیا ہے۔ کتنا تھا ان کا پیہ کرنے جا رہا ہوں۔“

”ہوں“ فیروز نے غصہ سے فرش پر پیر مارا۔

فحرو باپس لوٹ آیا۔ وہ بڑے بازار اور صدر تک آیا اور ناہید کو دیکھ آیا تھا۔ اس کے واپس آنے پر فیروز کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ دونوں نوکر سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور وہ اپنا غصہ ان پر جما ڈر رہا تھا۔

”بھاگ گئیں۔ اس کے دل سے آواز اٹھ رہی تھی“ آیا جھک دے کر نکال لے گئی اسے۔“

نوکر کو صحن میں چھوڑ کر وہ کمرے میں آگیا۔ بے تابی سے ٹپکتے ہوئے وہ اس فرار کے متفق سوچنے لگا لیکن وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ ناہید کے کمرے میں آگیا۔ پتنگ پر کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ گویا اس کا منہ چڑا رہے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ رات تاریک تھی۔ اور سردی سے ٹھٹھکے ہوئے آسمان پر روشن ستارے اس کی بے قراری پر ہنس رہے تھے۔ اس نے غصے سے کھڑکی بند کر دی۔

”میں تجھے پاتال کی گھرائیوں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا میرا نام فیروز ہے۔“

اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ اپنی شکست کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ جانے والے جا چکے تھے نور خلعت کو بچاؤ چکا تھا۔ حق باطل سے ٹکرا کر دندناتا ہوا نکل گیا تھا۔

اس نے سگریٹ سلگا یا اور پتنگ پر بیٹھ کر اطمینان سے سوچنے لگا۔

اس کی نظر میز پر پڑے ہوئے پن پر پڑی۔ یونہی خیال آگیا۔ شاید کوئی تحریر چھوڑ گئی ہوں۔ دم بھر میں اس نے کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کر ڈالیں کوئی رقعہ کوئی کاغذ نہ ملا۔ ہو سکتا ہے بازار ہی گئی ہوں اور ابھی آجائیں۔ اس نے اپنے دل کو تسکین دینا چاہی۔ میز پر زرینہ کی تصویر فریم سے باہر پڑی تھی۔ بلا ارادہ اس نے تصویر اٹھالی۔ پشت پر چند سطور دیکھ کر وہ جلدی سے پڑھنے لگا۔

”میں مراد مگر آٹھ بجے کی گاڑی سے ایک سیلی کے پاس جا رہی ہوں۔ اگر تم نے میرا پیچھا کیا۔ تو اپنی حفاظت کیلئے میں عدالت کا دروازہ کھٹکناؤں گی۔“

اس کا پارہ تیز ہو گیا۔ وہ خوف ناک اڑدھے کی طرح پھینک مارنے لگا۔ ان کے فرار کی تصدیق ہو گئی تھی۔ تصویر ہاتھ میں لئے وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس نے ایک نظر تصویر پر ڈالی۔ زرینہ تصویر میں مسکرا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے تصویر نہیں خود زرینہ اس کی شکست پر طنز یہ ہنس رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی سمٹی ہوئی نفرت کے شعلے لپکتے نظر آئے اس کے ہونٹوں پر اک جانا بوجھا طنز پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ چند ثانیے وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر چیخ و نواب کھاتے ہوئے اس کے کھڑے کھڑے کر دیئے۔ کھڑے کھڑے میں پھیل گئے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی ہر چیز اس کی شکست پر خاموش قہقہے لگا رہی ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہ فرار اس کی شاطرانہ چالوں کے منہ پر اک زنائے وار تھپڑ تھا۔ اس کے شیطانی ارادوں کی ہمار تھی۔ اس کے برہنہ کردار کی شکست تھی۔

گھڑیاں نے دس بجائے۔ فیروز نے گھڑی دیکھی۔ مراد مگر جانے والی گاڑی کو گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے سیٹھ ہاشم بھی آنے والا تھا۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگا۔ کہ پہلے اسٹیشن جائے یا سیٹھ کو اس واقعہ سے مطلع کرے۔ جو اپنی دن بھر کی اوڑھی ہوئی پار سائی کی چادر کو اتار کر رات کے اندھیرے میں سرمایے کے بل بوتے پر ایک نوخیز جوانی کو کچلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

فیروز جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ فحرو ڈیوڑھی میں بیٹھا اونگ رہا تھا۔

فیروز کو دیکھ کر ہوش میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”مالک“

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھٹکے دروازہ کھولا۔ اور تیزی سے باہر نکل کر گلی کی تاریکی میں گم ہو گیا۔



دھوؤں گی۔ ہاتھوں کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ آخر تو کرائی کس لئے رکھی ہے۔ وہ تو سارا وقت ماں کے پاؤں دباتی رہے۔ اور میں“

مائی کو آواز دینے کے ارادے سے وہ اٹھی محن میں ماں چار پائی پر پڑی تھی۔ مائی اس کے پاؤں دباری تھی۔ ماں مائی سے بڑی راز داری کی باتیں کر رہی تھی وہ غسل خانے میں کھس گئی اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ ماں کہہ رہی تھی۔

”تم ہی کوئی رشتہ بتاؤ۔ میں تو کہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے اس لڑکی کی شادی کر کے دفان کر دوں۔“

شادی؟

ایک کیف آکھیں تصور سے وہ مجھوم اٹھی۔ اس کی شادی ہوگی۔ وہ اک نیا گھر بسائے گی۔ نئی دنیا آباد کرے گی۔ ایسی حسین دنیا جو اک ظالم ماں اور لاپرواہ باپ کی دستبرد سے باہر ہوگی۔ اس کی اپنی بالکل اپنی دنیا خوشی سے اس کا انگ انگ مجھوم رہا تھا۔ خوابیدہ انگلیں سر اٹھانے لگیں۔ اس کے جذبات میں تلاطم پھا ہو گیا۔ وہ سوتے جاتے تھے حسین اور سنہری سینے دیکھنے لگی۔ نہ اب اسے ماں کی جھڑکیوں کی پرواہ تھی۔ نہ باپ کی مار پیٹ کا افسوس۔ وہ ہر نئی ثابت قدمی سے برداشت کرنے لگی۔ کیوں کہ ان شخصیتوں کے عتب میں مسکرائی ہوئی خوشیاں اور ناچتی ہوئی سرسبز نظر آ رہی تھیں۔

دن گزرتے گئے۔ اس کی جوانی رنگین سے رنگین تر ہوتی گئی۔ اس کا حسن نکھر آیا۔ گھر کے کام کاج میں وہ نئے سرے سے دل چسپی لینے لگی۔ وہ مشین کی طرح کام کرتی رہتی۔ اور اس کے خیالات اس کے ہونے والے شہزادے سے الجھے رہتے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے محبوب شوہر کی بھاری آواز سنتی اس کے تومند جسم کا لمس محسوس کرتی..... اور پھر..... خودی شرماتا جاتی۔

عید قریب آ رہی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے کپڑے سینے کے لئے وہ اپنی ماں کی ایک سہیلی کے گھر جا رہی تھی۔ ان کا گھر پرکلے ہوٹل کے پچھاڑے تھا۔ ہوٹل کے پچھلے کمروں کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ وہ لاکھوں مرتبہ اس گلی سے گزری تھی۔ ہزاروں مرتبہ بچپن میں ان ادنیٰ ادنیٰ کھڑکیوں پر چڑھی تھی۔ ایک کھڑکی کھلی تھی۔ اور کوئی کھڑا دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔

زیریں ریشمی کپڑوں کی ٹھٹھری بنسل میں دبائے گلی سے گزر رہی تھی۔ حترم آواز سن کر آنکھیں اٹھا کر دیکھا پھر نالی میں الجھ گیا۔ خود تو کرتے کرتے پی۔ البتہ کپڑے کھل کر گلی میں بکھر گئے۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بیٹھ کر کپڑے سینے لگی۔

”اوہو“ ایک بھاری آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑکی سے نیچے کود آیا۔

”لاؤں اچھے کر دوں۔“ اس حسین نوجوان نے کپڑے اکٹھے کر دیئے۔ وہ حیران حیران نظروں سے

۲

ناہید کی ماں زریں ایک مشہور طوائف تھی۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی بڑے بڑے رئیس بڑے بڑے نواب اس کے اشارہ اکبر و پر جان دیتے تھے۔ فریب حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے جادو بھری آواز بھی ودیعت کی تھی۔ فیروز اس جادو سے آگاہ تھا۔ وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرتا۔ اور اس کے پرستار تو اس پر جان تک نثار کر دینے کو تیار تھے۔ مال و دولت تو کوئی چیز ہی نہ تھی۔

وہ پیدائشی طوائف نہ تھی بلکہ حالات کی تیز و تند موجوں میں بہتی ہوئی اس مقام پر پہنچی تھی۔ اس کا تعلق ایک خوش حال خاندان سے تھا۔ ماں بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے اس عظیم صدمہ کو بھلانے کیلئے دوسری شادی کر لی تھی۔ دوسری بیوی نے غم غلا کرنے کے ساتھ ساتھ پہلی بیوی کی یادگار اس معصوم بچی کی یاد کو بھی باپ کے دل سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس طرح شفقت مادری سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باپ کی محبت سے بھی محروم ہو گئی۔ وقت گزرا گیا۔ اور زریں کی حیثیت گھر کی ایک لونڈی کی ہو کر رہ گئی صبح سے شام تک گھر کے کام کاج میں کوہر کے تیل کی طرح جتی رہتی۔ سوتلی ماں کی طنز آمیز جھڑکیاں سستی اور رات کو باپ کی جوتیوں سے مرمت ہوتی۔ دن رات یوں ہی گزرتے رہے۔ اور معصوم بچی ایک گھٹتے پھول بننے لگی بچپن گیا۔ جوانی آئی فیصلہ جوانی اور اس کا قیامت خیز حسن سوتلی ماں تو اسے دیکھ دیکھ کر جلتے لگی۔ اس کی نفرت کے شعلے تیز ہونے لگے بات بات پر وہ اس سے الجھنے لگی۔ رات کو باپ کے آنے تک اک طوفان زریں کی زندگی کی کمزور کمزور بنیادوں کو ہلاتا ہوا گزر جاتا وہ اپنی زندگی سے تنگ آگئی پندرہ سالہ حسین زریں اس مستقل آزاد سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچتی رہتی ”کیا کرے کہاں جائے“ اس کا دماغ ہر وقت اسے تانے بانے میں الجھا رہتا اسے اپنے گھر سے اپنے والدین سے اپنے سوتیلے بہن بھائیوں سے دہلی دہلی نفرت ہو چلی تھی ایک دن وہ باورچی خانے میں برتن صاف کر رہی تھی۔ برتن رکھ کر وہ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ نرم نرم ہاتھوں کی لکیریں راکھ سے کالی کالی ہو گئی تھیں۔ اس کا بی جا ہار تن اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دے ”اب میں کبھی برتن نہ

اس نے زمین آسمان ایک کروڑا لپاپ کی تو جیسے کسی نے کمری توڑ ڈالی اس دن سے اس کی زندگی ایک کریناک نہیں بن گئی۔ ایک رستا ہوا ناسور۔ جسے دیکھ کر سب کراہت سے منہ پھیر لیتے تھے وہ بیترہینچی اس نے درود کر سب کو اپنی شادی کا یقین دلانا چاہا لیکن ہر طرف سے اس بات کے جواب میں اس پر پھنکارا ہر آنکھ نے اسے قبر سے دیکھا اس کی بات پر کسی کو یقین نہ آیا دنیا کی نظروں میں وہ مجرم تھی۔ اس نے گناہ کیا تھا اس نے ساج کے ضابطے کو توڑا تھا اس نے ماحول کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس نے مذہب کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خوابوں کے محبوب شہزادہ سے نکاح کیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ عنقریب اسے اس جیتے جاگتے جنم سے نکال لے جائے گا سوتیلی ماں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ لیکن تقدیر کے پتھروں نے اسے پس کر رکھ دیا۔ کوئی اسے سچا نہ سمجھتا تھا کوئی اس کی بات پر یقین نہ کرتا تھا۔ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار تھی۔ اسے طعنے دیے گئے اسے مارا پیٹا گیا۔ اس کے زخموں میں فوکیلے نشتر گھنٹھو لے گئے وہ بے تاب ہو کر تڑپا رہا وہ بے قرار ہو کر روئی اور آخر دروازہ ہٹا کر اس کی شدت کا احساس ہی مٹ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ کمنا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی شادی کا ذکر فضل سمجھا۔ اس کی زندگی تباہ ہو گئی۔ صاف و شفاف آئینے پر ان مٹ خراشیں آچکی تھیں۔ اس کا دل اس کے پاس نہیں تھا۔

آخر ماں باپ نے بڑی دقت سے اس ذلیل بوجھ کو اتارنے کیلئے جگہ تلاش کر لی۔ ایک آوارہ اور غنڈے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔ ایک بار پھر اس نے احتجاج کیا۔ ایک بار پھر وہ پورے جوش کے ساتھ چیئی۔ لیکن ہزاروں پھنکاروں اور لاکھوں نعتوں کے شور میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

نئے مالک نے اس کے حسن کو مختلف زادیوں سے جانچا۔ اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ اور دوسرے شہر لے جا کر کسی اور غنڈے کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اور اس طرح زرینہ ہاتھوں کا تھ بکتی فیروز کے ہاتھ آ گئی۔ وہ بڑا گھاگ تھا۔ پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ کہ مال اچھا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اور زرینہ اک محبوب شہر کی چھیتی بیوی بننے کی بجائے اک طوائف بن گئی۔ چراغ خانہ نہ بن سکی، شمع محفل بن گئی۔ حوادث کی پر شور آمدھی نے اسے اپنے مقام سے اٹھا کر اس قصرِ لذت میں لا چھینا۔ پہلے پہلے تو وہ بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی۔ سلاخوں سے ٹکرا کر سر پھوڑ ڈالا۔ لیکن بند بچرے سے فزکراہ نہ مل سکی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی حالت پر قانع ہوتی گئی۔ اپنے کو اس جہمی ماحول کا خوشگراں بننے کی کوشش میں لگ گئی۔

وہ طوائف بن گئی۔ طوائفیت کے تمام فرائض انجام دیتی رہی۔ وہ مجبور تھی۔ وہ نساوایت کی بلند یوں سے اٹھا کر معصیت کی پستیوں میں پھینک دی گئی تھی۔ اور اسی معصیت کدے میں اس نے ناہید کو جنم دیا۔ ناہید کی پیدائش فیروز کے لئے ایک اچھا شگون تھی۔ اسے اپنا مستقبل درخشندہ نظر آنے لگا۔ ناہید اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ فیروز اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

اسے دیکھتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ کوئی اجنبی نہیں اس کے خیالوں کا شہزادہ ہے۔ جس کی بھاری آواز وہ تجیل میں بارہا سن چکی تھی۔ جس کے نومند جسم کا لمس وہ کئی بار محسوس کر چکی ہے۔

وہ بے فکر ذوق زادہ بی اے کا طالب علم تھا۔ صحت مند جسم لانا بقاد خوبصورت آنکھیں وہ اس میں کھو کر رہ گئی اس کی جوانی اندر ہی اندر سکھلا رہی تھی جوش کھاری تھی راستہ پا کر پھوٹ نکلی۔ نظروں کا تصادم زندگی کا سب سے بڑا واقعہ بن گیا۔ چوری چوری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ چپکے چپکے تعلقات بڑھنے لگے۔ اور زرینہ نے اپنا اعتماد اپنا یقین اپنی محبت سب اس بت ہوش رہا کے قدموں میں ڈال دیا۔

خاندان میں کسی عزیز کی شادی تھی۔ زرینہ کے ماں باپ کی شرکت ضروری تھی۔ دو بچوں کو زرینہ کے پاس گھر پر چھوڑ کر باقی بچوں کو لے کر وہ دونوں شادی میں شرکت کیلئے دوسرے شہر چلے گئے۔

”آٹھ دن تک لوٹ آئیں گے“ ماں نے کہا تھا۔

”جیسے کی ماں کو پاس سلا لیا کرنا“ باپ نے بوڑھی ہمسائی کا ذکر کیا۔

”وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے“ ماں بولی۔

”بہت اچھا“ زرینہ ایسے خوش تھی۔ جیسے سر سے کوئی بڑی مصیبت ٹل رہی ہو آٹھ دن پورے آٹھ دن وہ آزاد ہوگی۔ وہ ہوگی اور اس کا محبوب.....

ان آٹھ دنوں میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہو گیا۔ تھائی کو غنیمت جان کر دونوں نے چوری چوری شادی کر لی۔ وہ بڑے ارمانوں سے خود ہی دلہن بنی۔ ماں کے صندوق سے نکال کر سرخ سماگ کا جوڑا پہنا۔ اس کا محبوب شوہر اسے کچھ بھی نہ دے سکا ہاں ایک بڑے سے ہیرے کی چمکتی ہوئی انگوٹھی اس کی خوبصورت انگلی میں پہناتے ہوئے اس نے کہا۔

”یہ ہماری محبت کی یادگار ہے زرینہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ چند دنوں تک چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ میں گھر جاؤں گا۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

زرینہ کا معصوم دل بڑے زور سے دھڑکا لیکن مستقبل کا تصور کر کے اس کی روح رقص کرنے لگی تھی۔ کالج میں چھٹیاں ہو گئیں۔ اور وہ چلا گیا۔ زرینہ کے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا چھٹیاں ختم ہو گئیں کالج کھل گیا لیکن وہ نہ آیا۔ وہ بے قرار رہی اسے اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا اس کی نظر اس کڑوی سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام لوٹتی رہیں۔ جس سے کوڈ کر وہ رات کی تاریکی میں اسے ملنے آیا کر تا تھا۔ تین چار ماہ گزر گئے۔ اس کے انتظار نے دم توڑ دیا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ قطعاً مایوس ہو گئی۔ اس کی حالت عجیب ہوتی گئی۔ اس کے جسم میں اغم تہیلایاں ہونے لگیں۔ اس کے کولھے بھاری ہونے لگی۔ طبیعت میں وحشت اور ویرانی آگئی۔ اس کی ماں اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور ایک دن جب اس کی ماں کو پتہ چلا۔ کہ وہ بچہ کی ماں بننے والی ہے تو

”زیرِ نہ کا شباب ڈھلے تک وہ جوان ہو جائے گی اور پھر.....“

وہ آنے والے دور کی خوش آئند تصویر سے سرور ہونے لگا۔ لیکن زیرِ نہ اس کے نظریے کو بھانپ گئی۔ اس نے اس مکروہ نظریے کی جی بھر کر مخالفت کی۔ ناہید اس کی ہم شکل تھی۔ وہ اپنی شکل ایک بک جھانک کی رو میں بہہ کر مسخ کر چکی تھی۔ اب دوبارہ اسے خراب کرنا چاہتی تھی۔ وہ ناہید کو اپنے ماحول سے دور رکھ کر پالنا چاہتی تھی.....

اس نے فیروز کی ایما پر ناچنا سیکھا۔ گانا سیکھا۔ عشوہ طرازیں سیکھیں۔ دلوں کو لہانا سیکھا۔ دل سے اٹھتے ہوئے آہوں کے دھوئیں کو مسکراہٹوں میں چھپانا سیکھا۔ لیکن ناہید کے بارے میں اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ فیروز اسے اس معاملہ میں جھکا نہ سکا۔ خود اسے جھکنا پڑا۔ وہ بظاہر راضی ہو گیا۔ لیکن اپنے شاطرانہ ڈاؤنچ سے بخوبی واقف تھا۔ اپنی اہلیسانہ قوتوں سے آگاہ تھا۔ ناہید کے جوان ہوتے ہی وہ اسے اس ماحول میں کھینچ لائے گا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اور پھر یوں بھی ناہید کی گھر میں موجودگی روزمرہ کے عمل میں رخنہ انداز تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بچی کو کسی آہٹ کی نگرانی میں دے کر الگ رکھا جائے۔ بھولی بھالی زیرِ نہ فیروز کی باتوں کو سمجھ نہ سکی۔

ناہید کو ایک معتد آہٹ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ وہ ایک دیندار معمر عورت تھی۔ زیرِ نہ نے بچی اس کی گود میں دیتے ہوئے روتی ہوئی آنکھوں سے اس کی پیدائش کی المناک کہانی اسے سنائی۔ آیا کادل اس جانگداز واقعہ پر بھر آہٹ پائی کو سینے سے لگاتے ہوئے اس نے زیرِ نہ کو یقین دلایا کہ وہ اسے اپنا جگر گوشہ سمجھ کر پالے گی۔ اور اسی دن آہٹ بچی کو لے کر عالم آباد آگئی۔ اس چھوٹے سے خوب صورت شہر میں ایک اچھا سا مکان لے لیا گیا تھا۔ آیا ناہید اور اک کام کاج کے لئے ملازمہ کو لے کر اس چھوٹے سے قریب سے آرامہ مکان میں رہنے لگی۔

اور زیرِ نہ فیروز کے اشاروں پر کچھ پتلی کی طرح ناچتی رہی۔ اس کا حلقہ احباب وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اس کی پندلیاں ناچتے ناچتے سوچ گئیں۔ اس کے گھنگروں کی چھناچھن میں اس کی نامراد زندگی کی چھینیں واضح ہوتی گئیں۔ اس کے گلے کے سوز میں اس کی ناشاد زندگی کی جلن بڑھتی گئی۔ اور فیروز ان چھینوں کی قیمت، اس جلن کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ وصول کرتا رہا۔

کلی جب کچھ شگفتہ تھی۔ پھول جب ذرا تازہ تھا۔ تو سب نے بے اعتنائی سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ لیکن جب کلی مرجھا گئی۔ پھول کھلا گیا۔ سرراہ پھینک دیا گیا۔ توہر ہاتھ اس کی طرف لپکا۔ اس کے لمس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کی جانے لگی۔ اس کی بوسیدہ خوشبو کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا معاوضہ دیا جانے لگا۔ وقت کا بوڑھا ہاتھ تاریخ کے ورق الٹتا رہا۔

ناہید آہٹ کی نگرانی میں بچتی رہی۔ بڑھتی رہی۔ اس کے خدو خال واضح ہوتے گئے اس کا حسن گھبرا گیا۔ اس کی اٹھان صحت مند اصولوں پر ہو رہی تھی۔ شرافت کے اصول ذہن نشین کرائے گئے تھے۔ ہر چیز گناہ و ثواب کے پیمانے میں ناپ تول کر سمجھائی گئی تھی۔

زیرِ نہ مہینے میں دو ایک مرتبہ اسے دیکھنے کو آتی۔ اور اس کی اٹھان سے مطمئن ہو کر واپس چلی جاتی۔ وہ اپنے ساتھ گراں مایہ کھلونے اور تحفے لے کر آتی۔ پہلے پل تو ناہید اس سے جھجکی۔ لیکن رفتہ رفتہ مانوس ہو گئی۔ پانچ سال کی عمر میں اسے کانٹ سکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہ بڑی ہونمار بچی تھی۔ تعلیم کے مدارج بڑے اعزاز سے طے کرنے لگی۔ کچھ اپنی پیاری سی من موہنی صورت اور کچھ قابلیت کی وجہ سے وہ سکول میں ہر دلعزیز تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں زیرِ نہ اب بھی مہینے میں دو ایک بار اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھنے آیا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ اکثر فیروز بھی آتا تھا۔ فیروز سے ناہید کو ازلی نفرت تھی۔ اس کی کالی کالی مونچھوں اور چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے خوف آتا تھا۔ اس کی روح کی ساری خباثت ان آنکھوں میں جمع تھی۔ اور ناہید ان آنکھوں کو دیکھ کر سمجھ جاتی تھی۔ اس کا ہنسا دل کانپ جایا کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ امی اسے اپنے ساتھ کیوں لاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ ماں ہے۔ تو ناہید اور آیا کے پاس کیوں نہیں رہتی۔ ایک دن اس نے آیا سے پوچھ ہی لیا۔

”اماں“

”کیا ہے بیٹی“

”یہ فیروز کون ہے“

نودس سالہ معصوم بچی کے اس سوال پر آیا گھبرا گئی۔ لیکن جلد ہی بات بتاتے ہوئے بولی۔

”فیروز تمہاری امی کا بیٹا ہے۔“

”بیٹا“

”ہاں بیٹی“ آیا اس کے گھٹے گھنگریالے بالوں میں سرخ ربن درست کرتے ہوئے بولی۔ ”بہت بڑا

کاروبار ہے تمہاری امی کا۔ سارا فیروز نے سنبھالا ہوا ہے۔ بھلا اکیلی امی اتنا کام کیسے سنبھال سکتی ہے۔“

”امی بیس کیوں نہیں رہتیں۔“

”آیا ایک دفعہ پھر چکر لائی۔“

”اماں“ ناہید آیا کا منہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”امی ہمارے پاس کیوں نہیں رہتیں۔ فیروز کے

پاس کیوں رہتی ہیں۔ مجھے تو اس فیروز سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ امی سے کہہ دیتا ہے اسے اپنے ساتھ نہ لایا کریں۔ وہ جب

بھی آتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہونے لگتا ہے۔

آیا نے ہنس کر اس کی بات ٹال دی۔

”ڈرپوک کہیں کی۔“ اس نے ناہید کے سبب کی طرح سرخ گالوں کو پیار سے پیچھا پایا۔

”نہیں اماں تم امی کو ضرور منع کر دینا۔ اسے یہاں نہ لایا کریں۔ مجھے تو وہ دیوؤں سے بھی زیادہ ڈراؤنا لگتا ہے۔“

”اچھا ابھی کہہ دوں گی۔“

ناہید خاموش ہو گئی۔ اور آیا کا دماغ ایک نئی سوچ میں الجھ گیا۔ ناہید بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پرورش ایک شریف گھرانے کی بچی کی طرح ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی ماں ایک رندہ تھی۔ کیا یہ بات ناہید کو معلوم ہو جانی چاہئے۔

اور جب زریںہ آئی تو آیا نے ساری بات اسے کہہ سنائی۔

”اماں“ زریںہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”ناہید کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ اس پر میری زندگی

کا سایہ نہ پڑنے پائے۔“

”چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”سوچتی ہوں یہ بات اب چھپائے نہ چھپ سکے گی۔ وہ سیانی ہو رہی ہے۔ عجیب عجیب سوال کرتی ہے

اب تو۔ چھوٹی تھی تو ٹال لیا کرتی تھی میں۔ اب تو اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

زریںہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔ آنسو بے اختیار

بننے لگے اور دل کا غبار آنسوؤں سے دھلنے لگا۔

ناہید کی سوچ دن بدن گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آیا نے فیروز کو اس کی ماں کا فیچر بتا کر وقتی طور پر اسے

مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن وہ جانے کیوں اس بات کی صداقت سے انکاری تھی۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

وقت گزر گیا۔ اور جب ناہید شعور کو پہنچی تو یہ بات اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ کہ فیروز اس کی ماں کا دوسرا

خاوند ہے۔ اس کا سوتا بلا باپ ہے۔ اسی لئے ماں اس کے پاس ہی رہتی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ناہید اور آیا

کے پاس نہ رہے۔ اس قیاس سے اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن فیروز سے نفرت کم ہونے کی بجائے

کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ جب بھی وہ آتا وہ حتی المقدور اس کے سامنے آنے سے گریز کرتی۔ اس کی بے باک باتوں کا

جواب نہ دیتی۔

میٹرک کے امتحان میں وہ اول آئی۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس سرور موقعہ پر اس نے اپنی چند

خصوصی سیلیوں کورات کے کھانے پر بلایا تھا۔

”کھانے کے علاوہ گانے سے بھی تواضع کرو گی جب آئیں گے ہم تو۔“ ایک عزیز پہلی نے کہا۔

”ضرور ضرور“ ناہید نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ناہید کو گانے کا بچپن سے شوق تھا۔ ستار اس کا پسندیدہ ساز تھا۔ ایک بوڑھے استاد سے اس نے گانا اور ستار بجانا سیکھا تھا۔ اس کی جادو بھری آواز ستار کی پرسوز آواز میں مل کر ایک عجیب سا سماں باندھ دیا کرتی تھی۔ سب سننے والے بے خود ہو جاتا کرتے تھے۔

جس رات ناہید کے ہاں دعوت تھی۔ اس صبح زریںہ اور فیروز بھی آگئے۔ وہ اپنے ساتھ بیش قیمت تحائف لائے تھے۔ زریںہ اپنی بچی کی کامیابی پر پھولی نہ ساتی تھی۔ وہ اسے بڑی دیر تک اپنے سینے سے لگائے اپنے دل کی جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتی رہی۔

اچھا ہوا آپ بھی آگئیں امی۔ آج رات میں نے چند سیلیوں کو دعوت پر بلایا ہے۔ ”ماں کا دل خوشی سے پھیلنے لگا۔

ناہید کھانے کے کمرے میں میز پر برتن سجا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں زریںہ اور فیروز باتیں کر رہے تھے۔ ناہید اپنے کام میں مشغول تھی۔ اس نے ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن آوازیں تلخ اور تیز ہوتی گئیں۔ ناہید کے ہاتھ رک گئے۔

”آٹھ بجے سے پہلے واپس پہنچنا ہے سمجھیں“

”میں آج نہیں جاؤں گی۔“

”اور وہ سیٹھ رحیم“

”میری بلا سے“

”اچھا“ فیروز گرجا۔ ”تمہارا یہ حوصلہ۔ پانچ سو روپیہ ایک رات کا معاوضہ۔ اور تم میں رہوں گی۔

تمہیں ابھی چلنا ہو گا۔ سات بجتے والے ہیں۔ آٹھ بجے تک بمشکل پہنچیں گے۔“

”فیروز میں نے کہہ دیا ہے میں نہیں جاؤں گی آج۔“ زریںہ کی رندہ سی ہوئی آواز آئی۔ ”مجھے

تمہارے سیٹھ کی قطعاً پرواہ نہیں ہے۔“

”تمہاری ہٹ دھرمی سے مستقل آسامی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اسی سیٹھ کی جیبوں کی اگلی ہوئی دولت پر

تو سب شاٹھ ہاتھ چل رہے ہیں۔“

ناہید کا دماغ پکڑانے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر قہام کر کر سی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی

ہمت کچھ سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے کئی پردے اٹھ گئے تھے۔ زریںہ کو فیروز لے کر چلا گیا سیلیاں آئیں

دعوت کچھ بد مزہ سی رہی۔ ناہید اصرار کے باوجود گانہ سکی۔ رات بھر وہ بستر پر مائیٹے آب کی طرح کروٹیں بدلتی رہی۔ لمحہ بھر نہ سو سکی۔ دن چڑھا۔ وہ ست سی بستر پر پڑی رہی۔ ملازمہ چائے لے کر آئی۔ برتن جوں کے توں پڑے رہے۔ وہ الجھنوں میں پھنسی رہی۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ وہ ابھی تک کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ آیا اس کے کمرے میں آئی۔ اس کو یوں پڑا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

”طبیعت تو اچھی ہے ناہید بیٹی۔“ وہ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے بولی۔

ناہید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”کیا ہوا میرے لال۔“ آیائے جھک کر اس کی چاند سی پیشانی چوم لی۔

”اماں“ آواز حلق ہی میں انگ گئی۔

”ناہید کچھ تو کہو۔ کیا ہوا۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا۔“

اور ناہید نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان رات کا جاگتے میں دیکھا ہوا خواب آیا کو سنا دیا۔ جو اس کی حساس اور فیور طبیعت پر تازیانے کی طرح لگا تھا آیا کچھ دیر شش و پنج میں مبتلا رہی۔ ناہید اسے مشتبہ نظروں سے گھور رہی تھی۔ آیائے لب پہلے وہ بول رہی تھی۔ اور ناہید سن رہی تھی زینہ کی داستان حیات دہرائی جا رہی تھی۔ کچھ چھپانا فضل تھا۔ مملکت تھا۔ آیائے ساری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔ جب وہ سنا چکی تو ناہید اس کی گود میں ٹوٹی ہوئی ڈالی کی طرح گر گئی۔ اس کے کانوں سے ایک ہی لفظ ٹکرا رہا تھا۔

”طوائف“

”میری بچی“ آیائے اسے پیار سے چکارتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری رگوں میں شریف خون ہے اور اس خون کی حفاظت تمہیں کرنا ہوگی۔ مجھے امید ہے۔ کہ تمہارے کردار کی بلندی تمہاری ماں کی موجودہ زندگی سے متاثر نہیں ہوگی۔“

اس دن سے اس کی زندگی بدل گئی۔ اس انکشاف نے جیسے جان ہمار پھولی کا سارا رس نچوڑ لیا تھا۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر گئی۔ وہ اپنی سیلیوں سے خوف کھانے لگی۔ وہ شریف گھرانے کی لڑکیوں سے ملنے ہوئے ہچکچانے لگی۔ اس کی آنکھوں کی ساری شوخی، اس کی طبیعت کی ساری جولانی مفقود ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اک نسل سی بے چینی نے گھر کر لیا۔ اک خفیف سی گھبراہٹ رہنے لگی۔ جب کوئی اس کی طرف غور سے دیکھتا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں طوائف ہے۔ تاہم وہ ہر وقت گھبرائی گھبرائی رہنے لگی۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ تو اس کی کتنی ذلت ہوگی۔

طوائف! اس کی ماں طوائف تھی۔

طوائف جو سماج کے سینے کا بڑا زہریلا زخم ہے۔ جو معاشرے کی چھاتی کا کرہ مرگھاؤ ہے۔ زندگی کا چکر چلنا رہا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ناہید کا دماغ زندگی کی راہیں استوار کرنے میں مصروف رہا۔ مستقبل کا ایک نصب العین بنا کر وہ پوری توجہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مصروف ہو گئی۔

اس نے ایف۔ اے کر لیا۔ اک اعزاز کے ساتھ وہ کامیاب ہوئی لیکن اس نے اپنی کامیابی پر کوئی خوشی نہ منائی۔ خاموشی سے تھرڈ ایر کا داخلہ لے لیا۔

فیروز کی حریص نظرس اس کے جہاں سوز حسن کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کا تو یہ شکن صبح حسن اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اسے اپنے ماحول میں کھینچ لانا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ اسے نیلام کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے پاکیزہ وجود کو طوائفیت کا رنگ دینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

زینہ کا شباب مٹ رہا تھا۔ اکتا دینے والے دن اور تھکا دینے والی راتوں نے اس کی صحت کو کچل ڈالا تھا۔ اس کا سینہ کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کا دل خالی تھا۔ اور اس کو کھلے سینے میں اس خالی خالی دل میں اگر کوئی تنہا سک رہی تھی۔ تو وہ ناہید کے روشن مستقبل کو دیکھنے کی تمنائی تھی۔ چند دنوں سے وہ فیروز کی ہلکی ہوئی نظرس دیکھ رہی تھی۔ ناہید کے بی اے میں داخلہ لینے پر وہ اس سے کئی بار الجھ چکا تھا۔

”آخر اتنی تعلیم کی ضرورت کیا ہے۔“

”تمہیں ناہید کے بارے میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔“ زینہ نے تنہی سے جواب دیا۔

”میں اب اسے مزید خرچ دینے کو تیار نہیں۔ اسے یہیں بلا دو۔“

”یہاں کی تو ہوا بھی اسے نہ لگنے دوں گی۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”رہا خرچ۔ تو روپیہ میرا خرچ ہو رہا ہے تمہیں اس سے کیا۔“

”زینہ“ فیروز غرایا۔ ”خرچ کی بات نہیں۔ تمہاری صحت اب گرتی جا رہی ہے۔ جس کے باعث یہ دھندلا ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔ پرانے گاہک آنکھیں بدل رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ اب تمہارا کام ناہید سنبھال لے۔ وہ جوان۔۔۔۔۔۔“

”فیروز“ وہ اس زور سے گرمی کہ فیروز کا دل دہل گیا۔ ”یہ ناپاک خیال اپنے دل سے نکال دو۔ ناہید کا مقام اتنا بلند ہے۔ کہ تم اسے چھو بھی نہیں سکتے۔“

کتنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن فیروز کی معیت میں اسے اٹھارہ سال ہونے کو آئے تھے۔ وہ اس کی بد طبیعتی سے آگاہ تھی۔ وہ جو ناپاک منصوبہ بنا تا ہے عملی جامہ پہنا کر رہتا تھا۔ زینہ ہر وقت ایک ہی سوچ میں کھوئی رہنے لگی۔ مسلسل سوچ اور دن رات کی ادھیڑ پن نے اسے بے حال کر دیا۔ اسے بخار رہنے لگا۔ اس کی ہمت ٹوٹتی گئی۔ اعصاب جھٹکتے گئے۔ اور دو ماہ کے اندر اندر زینہ چار پائی سے لگ گئی۔

پھر اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا دی۔

”یہ تمہارے باپ کی نشانی ہے۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”باپ..... باپ“ یہ لفظ اسے کچھ عجیب سا لگا..... ”باپ کی نشانی“ وہ انگوٹھی کو دیکھ کر بڑبڑائی۔

زیرینہ تپ اٹھی۔

”میں دنیا کی نظروں میں ثابت نہ کر سکی..... لیکن..... میری بات کا یقین کرو ناہید۔ تم ایک باپ کی جائز اولاد ہو..... یہ انگوٹھی اس نے شادی کے دن مجھے دی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے مذہب کی آڑ لے کر میری عصمت کا سودا کیا ہو۔ اور یہ انگوٹھی..... میری دوشیزگی کی قیمت کے طور پر ادا کی ہو..... لیکن..... تم میرے الفاظ پر یقین کرو..... ہم نے شادی کی تھی۔ اور.....“

جانے وہ اور کیا کرنا چاہتی تھی۔ کھانسی اٹھی..... اس کی ابھی ابھی سانسیں اکھڑ گئیں۔ نچنے پھڑکنے لگے۔ ناہید کی آنکھوں سے تیزی کے ساتھ آنسو بہنے لگے اور آیا جلدی جلدی سے کلام پاک پڑھنے لگی۔

اور صبح ہونے سے پیشتر ہی اس کی روح قفسِ عسری سے پرواز کر گئی۔

زیرینہ مر گئی۔ اور ناہید کو جیسے کچھ سکون مل گیا۔ اس کی ماں اس ذلیل پٹھے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا گئی تھی۔ یہ خیال اس کے لئے وجہ تسکین بن گیا۔

سیٹھ ہاشم زیرینہ کے مرنے کی خبر سن کر آیا۔ اسی کی عمر پینتالیس سال سے کچھ تجاوز ہی تھی، لیکن نفس کی آگ دن بدن بھڑک رہی تھی۔ ناہید کو دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اسے پالنے کی آرزو میں جلنے لگا۔ دوسرے دن ہی اس نے اپنی اس ذلیل خواہش کا اظہار فیروز سے کر دیا۔ فیروز کے راستے کی رکاوٹ ہٹ چکی تھی۔ اس نے سیٹھ کو تسلی دی۔

”ذرا ماں کا غم غلط ہوئے۔ پھر آپ کے ہی قدموں میں رہے گی۔“

سیٹھ کا غم زردہ نفس مطمئن ہو گیا۔

ناہید جلد از جلد اپنے گھر عالم آباد واپس جانا چاہتی تھی۔ اس برہنہ ماحول سے وہ تنگ آگئی تھی۔ ماں کی وجہ سے مجبوری کے عالم میں وہاں رہ رہی تھی۔ اب ماں مرجی چکی تھی وہاں ٹھہرنا بے مقصد تھا۔ اس نے آیا کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ فیروز پاس ہی بیٹھا تھا۔ بڑی ملامت سے بولا۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے دسواں تو ہو لینے دو۔ پھر چلی جانا“

آیا اور ناہید دونوں چپ ہو گئیں۔

دسواں ہو گیا۔ ناہید نے پھر جانے کے لئے اصرار کیا۔

”اپنی بچی کو اس غیبت انسان سے کیسے بچائے۔“ یہ سوال کبھی لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اس کے دماغ پر لگتا۔ اور کبھی منجد برف کے ٹھنڈے ٹھنڈے تودوں کی طرح دماغ کو جکھڑ دیتا۔ اس کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ اک مرد نے مذہب کی آڑ لے کر اس کی انسانیت کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ اک دھنواں نے اس کی مصومیت سے اک غاصبانہ کھیل کھیلا تھا۔ ایک بے وفامرد نے اس کے غلوں کو کچلا تھا۔ وہ خود جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ساری مصیبت زیرینہ کی تنہا جان پر ڈال کر وہ کہیں کھو گیا تھا۔ زیرینہ کی زندگی جل جل کر رہا تھا۔ اب اسی رکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں سے وہ ناہید کے مستقبل کی شمعیں فروزاں کر رہی تھی۔

زیرینہ بیمار تھی۔ اور فیروز جان بوجھ کر تعادل برت رہا تھا۔ وہ اپنے راستے کی اس رکاوٹ کو جلد از جلد دور کر دینا چاہتا تھا۔ بیماری دیکھ کی طرح اس سنگ گراں کو چاٹ رہی تھی۔ کھارہی تھی اور فیروز خوش تھا۔ وہ زیرینہ کی موت کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ جس کے سامان بڑی سرعت سے ہو رہے تھے۔

زیرینہ کی حالت خطرناک حد تک بگڑ چکی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ مجبور ہو کر اس نے ناہید کو بلا بھیجا۔ ناہید آیا کے ساتھ آگئی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس عمارت میں آئی تھی۔ ایک الگ تھلک کمرے میں پٹنگ پر زیرینہ بڑی موت کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسے اس زمانے کی ٹھکرانی ہوئی مظلوم عورت پر شدت سے پیار آگیا۔ وہ اس کی ماں تھی اس نے اسے جنم دیا تھا۔ ناموافق حالات سے برسرِ پیکار وہ کراک بلند عزم کے تحت اس کی پرورش کی تھی۔ اک ظالم مرد کی سوچی ہوئی امانت کی جان پر کھیل کر حفاظت کی تھی۔

ناہید نے ڈاکٹروں کو بلاوایا۔ حکیموں کو دکھایا۔ لیکن مگر ترقی ہوئی دیوار کو کوئی سنبھال نہ دے سکا۔ بجھتی ہوئی شمع تابانی کے ساتھ نہ چمک سکی۔ ناہید اور آیا نے اس کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ لیکن زیرینہ کے دن پورے ہو چکے تھے۔

وہ ایک اداس اور ویران رات تھی۔ نحیف و نزار زیرینہ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا لہجے لہجے سانس لے رہی تھی۔ زندگی بار رہی تھی۔ اور موت غلبہ پارہی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ آیا زیرینہ کی روحانی تسکین کے لئے قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھی۔ اور ناہید روتی ہوئی آنکھوں سے گردشِ دوراں کے اس شکار کو دیکھ رہی تھی۔

زیرینہ نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔

”امی“ ناہید اس پر جھک گئی۔

”میری بچی“ زیرینہ کے منہ سے نکلا۔ اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھایا۔ انگلی میں ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے لرزے ہاتھوں سے انگوٹھی اتاری ناہید کا نرم اور گداز ہاتھ ہاتھوں میں لیا۔ اور

”اماں آج رات کی گاڑی سے واپس ہو۔ میری پڑھائی کا بڑا ہرج ہو رہا ہے۔ آیا نے گہری فکر مندی نظروں سے اسے دیکھا پشتراس کے کہ وہ کوئی جواب دے۔ فیروز بولا۔

”کماں جاؤ گی“

”اپنے گھر“

”اس گھر کو اب اپنا گھر سمجھو“

”کیا مطلب؟“

”تمہاری ماں مر چکی ہے۔ اس کی خالی جگہ کو اب تمہیں پر کرنا ہو گا۔ تمہارا نام میں نے کالج سے کنوایا ہے۔“

ناہید کو چھاتی میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کی رنگت پہلی پڑ گئی۔ ہاتھوں میں ٹھنڈے پینے آگئے۔ دماغ سن ہو گیا۔ فیروز ظالمانہ مسکرایا۔

”گھبراؤ نہیں جلد ہی عادی ہو جاؤ گی۔ یہ تمہاری ماں کی غلطی تھی جو تمہیں اس ماحول سے دور رکھا۔ خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

آیا خالی خالی نظروں سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ کش مکش جاری رہی۔ فیروز نرمی سے اسے سمجھاتا رہا۔ ترغیب دیتا رہا۔ آمادہٴ لغزش کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن جب ناہید کا آہنی کردار متزلزل نہ ہو سکا تو وہ سختی پر اتر آیا۔ سیٹھ ہاشم سے پانچ ہزار پر ناہید کی عصمت کا سودا کر لیا، لیکن قدرت کو شاید ناہید کی بے بسی پر رحم آگیا۔ آیا فرشتہٴ رحمت بن کر اسے اس گندے گڑھے سے نکال کر لے گئی۔ فیروز کف دست ملتا رہ گیا۔

.....○.....

اونچی نیچی سبز پوش پہاڑیوں کے دامن میں سلطان پورہ کا خوب صورت شہر آباد تھا۔ صاف ستھری سڑکیں۔ کشادہ گلیاں پر رونق بازار، آراستہ پیراستہ دو کائیں سلطان پورہ کی زینت کو بڑھاتے تھے۔ یہاں کی آبادی تو کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن زندگی کے سارے لوازمات یہاں موجود تھے۔ لوگ محنتی اور جفاکش تھے۔ محنت اور جفاکشی ان کی خوش حالی کی ضامن تھی۔ یہاں باغات کی کثرت تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشموں کی افراط تھی۔ دور دور سے لوگ سیر و تفریح کے لئے یہاں آتے تھے۔ قدرت نے یہاں حسن جی کھول کر لٹایا تھا۔ دریائے سندھ پر بل کھانا لہراتا کہیں بلند و پست پہاڑیوں پر سے اچھلتا کودتا کہیں اونچائیوں سے سر کے بل گر کر چھٹا چنگھاڑتا کہیں ہمواریوں کے سینے پر خراماں خراماں چلتا سلطان پورہ کے حسن میں اضافے کا باعث تھا۔

آبادی سے ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دیو قامت درختوں کے جھرمٹ میں قصر رعنا کی خوب صورت اور شان دار عمارت کسی پراسرار حسینہ کی طرح کھڑی تھی مرمریں ستونوں اور سفید گنبدوں والی یہ عمارت اپنے مکینوں کے وقار عظمت اور جاہ و جلال کی مظہر تھی۔ شاندار باغ اس کے تمام تر حسن کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا۔ خوب صورت اور دلآویز چمن۔ بہترین پھولوں سے مزین کیاریاں نوکیلی کانٹے دار جھاڑیوں سے والمانہ لپیٹی ہوئی عشق پچال کی بلیں۔ جگہ جگہ تمکنت سے استادہ مرمریں مجستے۔ خوب صورت حوض باغ کی خوب صورتی کو بڑھاتے تھے۔

قصر رعنا بہترین ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ انگلینڈ، فرانس اور دیگر کئی بیرونی ممالک سے اکٹھے کئے ہوئے نوادرات اس محل کی شان کو دوبالا کرتے تھے۔ دیکھنے والے کی عقل حیرت میں پڑ جاتی تھی۔ سرخ، بکری والی سڑک سرد و شمشاد کے درختوں میں سے ہوتی ہوئی قصر رعنا کے قدموں میں بچتی ہوئی گزرتی تھی۔ یہاں سے چند زینے طے کر کے طویل برآمدوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ چمکیلے فرشوں پر نرم اور موٹے موٹے قالین پڑے تھے۔ محرابی دروں میں سنہری نوکریوں میں سبز بزمگاہ کے کھلے کچھ عجب ہمار دیتے تھے۔ ان برآمدوں کے

ہنسیاں پھوٹ رہی تھیں۔ سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں لیکن ابھی انہیں آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ نواب صدیق علی خاں کا فنون آیا۔ وہ چند دنوں کے لئے نیویارک جا رہے تھے۔ یاسمین کو بھی ہمراہ لے جانا چاہتے ہیں تفتیح کے سارے پروگرام ادھر سے چھوڑ کر انہیں واپسی کی تیاری کرنا پڑی۔ جلدی جلدی سامان باندھا جا رہا تھا۔ ملازمہ کپڑے تہہ کر کے بڑے بڑے چرمی بکسوں میں رکھ رہی تھی۔ یاسمین غمگینی سے ضروری ہدایات دے رہی تھیں۔ بچوں کی ڈیج گورنس ننھے شاہین کو سرخ ادنی سیٹ پہنا رہی تھی..... اور منصور خاموشی سے جانے والوں کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔

”امی حضور“ سات سالہ سمیرا نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

”کیا بات ہے“ یاسمین نے پوچھا۔

”امی حضور مجھے یہیں چھوڑ جائیے نا۔“

”کیوں؟“

”بس..... ماموں حضور۔ کہیے نا می سے۔“ وہ منصور سے لپٹ گئی۔ منصور مسکرا دیئے۔

”نہیں بیٹا..... پھر آجائیں گے“

”چھوڑ جائیے نا باجی۔ ابھی چند دن تو ہوئے ہیں انہیں آئے ہوئے۔“ منصور نے سفارش کی۔ بچی خوشی سے ناچنے لگی۔

”میں بھی نہیں جاؤ گا۔“ چار سالہ فریدوں سینہ تان کر بولا۔

سب ہنس دیئے۔

”امی حضور اجازت ہے۔“ سمیرا ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”لو ان کو دیکھو۔ دونوں باغی ہو گئے۔“

”ہرج بھی کیا ہے۔ آپ کی واپسی پر میں انہیں لے کر آ جاؤں گا ایک دم سب کے چلے جانے سے میری طبیعت بھی اچاٹ رہے گی۔ یہ گھریا لکل سونا ہو جاتا ہے ان کے جانے کے بعد۔“

”گھر کو آباد کیوں نہیں کرتے“ یاسمین نے منصور کو دیکھ کر دبا سا قبہر لگایا۔ ان کے خوب صورت دانت گلے میں پڑی ہوئی سچے موتیوں کی مالا سے زیادہ آب دار تھے۔ بہن کے دل میں بھائی کی شادی کی لگن تھی۔ جب بھی وہ شادی کا ذکر کرتیں منصور بڑی خوب صورتی سے اس تذکرے کو ٹال جاتے تھے۔

خاندان کی چیدہ چیدہ لڑکیاں۔ بلند مرتبہ باپوں کی حسین بیٹیاں ان کی زندگی میں داخل ہونے کے لئے کوشاں تھیں۔ لیکن منصور کے ذہن میں ریفیڈ حیات کا ہوا چھوٹا معیار تھا۔ اس پر آج تک کوئی بت طناز پورا نہ اتر سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کا معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

عقب میں کشادہ اور آراستہ کمرے تھے۔ درمیان میں بڑی نفاست سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ یہ ڈرائنگ روم قصر عتا کے دل کی حیثیت رکھتا تھا۔ قائلین گداڑ صوفے، قیمتی لہراتے ہوئے پردے، چمکیلے اور منقش گلدان غرضیکہ وسیع کمرہ دلہن کی طرح آراستہ تھا۔

اس وسیع محل کے ایک پہلو میں چند کمرے دفتر کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔

یہ محل نواب منصور علی خاں کی رہائش گاہ تھی۔ نواب موصوف ایک مختیار اور ہمدرد انسان تھے۔ اپنے بے پناہ مردانہ حسن۔ اپنی ضرب المثل فراخ دلی۔ اپنے مشعل راہ کردار کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ حسن صورت اور حسن سیرت نے مل کر ان کی شخصیت کو شش انگیز اور جاذب النظر بنا دیا تھا۔ یہ چھبیس سالہ نوجوان ہر طبقے میں ہر دل عزیز تھا۔

نواب منصور کے والد نواب افتخار علی خاں وجاہت اور شجاعت کے پیکر تھے۔ منصور ابھی عمر کی چند ہی بہاریں ان کے دامن تلے گزارنے پائے تھے کہ موت کا بے رحم ہاتھ انہیں اچک کر لے گیا۔ منصور تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیئے گئے۔ اور والدہ کی موت کا صدمہ ان کے ناچستہ بن سے محو ہوتا گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں جاگیر کا سارا انتظام معتبر ملازمین کی اعانت سے والدہ نے سنبھالے رکھا۔ وہ ایک وجیمہ اور باوقار خاتون تھیں۔ منصور بیس بائیس برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹے، لیکن شفقت مادی سے ابھی طرح لطف اندوز ہونے بھی نہ پائے تھے کہ بیمار پڑ گئیں۔ دعاؤں اور دواؤں کا اثر نہ ہوا۔ اور وہ اپنے عزیز بیٹے کے سرے کے پھول دیکھنے کی حسرت دل میں لئے عالم جاودانی کو سندھار گئیں۔

ان کی مفارقت کا صدمہ منصور کی حساس طبیعت نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ دنیا ان کی نظروں میں اندھیر ہو گئی، لیکن وقت ایسے ایسے گھاؤ بھرتا ہی آیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ طبیعت سنبھلتی گئی۔ ماں کی موت اک ان مٹ خلش بن کر رہ گئی۔ اور منصور زندگی کے میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ ماں کے بعد ان کی محبت اپنی بڑی بہن یاسمین پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

یاسمین عمر میں ان سے دو سال بڑی تھیں۔ دو شیزگی میں ضرور چنچل اور خوش ہوں گی لیکن عمر نے چنچل پن کو سنجیدگی میں بدل دیا تھا۔ وہ ایک سنجی ہوئی بانڈاق اور باذوق خاتون تھیں۔ ان کی شادی نواب صدیق علی خاں آف ناظم پور سے ہو چکی تھی۔ وہ ان کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ تین پیارے پیارے خوب صورت اور گول منول بچے ان کی ازدواجی زندگی کو پُر بہار بنائے ہوئے تھے۔

منصور اور یاسمین میں بے انتہا محبت تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے مینے قصر عتا آتیں۔ ان کی آمد سے محل میں اک چمک پھل سی ہوتی۔ نواب منصور کی ساری دلچسپیاں ان کے بچوں پر مرکوز ہو جاتیں۔

چھپلے دنوں یاسمین آئی ہوئی تھیں۔ محل کے خاموش در و دیوار کا جھوٹا گیتا تھا۔ قہقہے بکھر رہے تھے۔

جک گئے۔ بہن نے ایک شفقت آمیز بوسہ ان کے گتے ہتھکریا لے بالوں پر دیا۔ اور رخصت ہو گئیں۔
دونوں بچے وہیں رہ گئے۔ وہ سارا سارا دن کھیلتے رہتے۔ کبھی حسین تیلیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، کبھی رنگین مچھلیوں کو پکڑ رہے ہیں، صرف اتنی ہی دیر آرام سے بیٹھتے جتنی دیر مس ڈی سوزا پڑھائی کے لئے انہیں کمرے میں مقید رکھتی۔ منصور بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ شاداں و فرماں بچے انہیں اپنی زندگی کے وہ دن یاد دلاتے تھے۔ جب وہ اور یاسمین انہیں بوڑھے درختوں کے سایوں تلے کھیلا کرتے تھے۔ گرمیوں میں آفتاب کی حدت سے بے خبر، سردیوں میں برف کی مجذوبہ روت سے لاپرواہ۔ اور اسی لاپرواہی اور بے خبری پر انہیں ان کی بوڑھی انگریز بھگن سزا سزا کے طور پر کمرے میں بند کر دیا کرتی تھیں۔ اور ان کے ننھے ننھے دماغ کو کئی نئی شرارت سوچنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

نواب ذوالفقار علی خان منصور کے چچا تھے۔ تعلیم کے سلسلہ میں انہیں ولایت بھیجا گیا تھا لیکن جانے دیار غیر کی ہوا انہیں کیوں راس آگئی۔ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے ان کی جاگیر دولت آباد میں تھی۔ اور اس کا انتظام ان کی عدم موجودگی میں سرفراز کے سپرد تھا۔ وہ ایک مخلص اور معتد انسان تھا۔ ایمان داری سے کام کو سنبھالے ہوئے تھا۔ دولت آبادی میں قصر فردوس تھا۔ جس میں ذوالفقار تو نہیں رہتے تھے۔ دور پار کے کچھ عزیز تھے جو اس محل کو آباد کئے ہوئے تھے۔

لندن کے ایک پرسکون گوشے میں ان کی خوب صورت محل نما کوٹھی تھی جہاں اپنے ملکی ملازموں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے۔ ان کی عمر کوئی چالیس برس کے لگ بھگ تھی، لیکن بے فکر زندگی اور دولت کی فراوانی سے ان کی صحت قابل رشک حد تک اچھی تھی۔ شکار کھیلتا اور بڑی بڑی دعوتیں دیتا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ اور وہ اپنے دوستوں میں بڑے مقبول تھے وہ خوش خلق تھے۔ با مذاق تھے۔ اسی لئے اپنے احباب میں اک نمایاں مقبولیت کے حامل تھے۔

سال میں صرف ایک مرتبہ وہ سلطان پور آتے۔ اور وہ موقع ہوتا منصور کی سالگرہ کا۔ دنیا میں سوائے منصور اور یاسمین کے ان کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ دونوں بہن بھائی بھی انہیں بے حد چاہتے تھے۔ ان کی سلطان پور میں آمد ان کی خوشیوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ وہ خود بھی بہتے تھے اور وہ کبھی ہنسیا کرتے تھے ”جینا ہے تو ہنس ہنس کے جو“ کے مقولے پر کار بند تھے۔

ان کی آمد پر قصر عثمانی زندگی کی سوتلی ہوئی لبریدار ہو جاتی۔ رونقیں جاگ اٹھتیں۔ نئے نئے پروگرام بننے۔ دعوتیں دی جاتیں۔ ادبی محفلیں منعقد ہوتیں۔ وہ بھوپال کے جنگلوں میں شکار کے لئے جاتے۔ سمندر کے کنارے تفریح کے لئے جاتے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ مہینہ بھر رکتے، لیکن ان تیس دنوں میں ہزار ہا مصروفیتیں ہوتیں اور جب وہ چلے جاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی چلتے چلتے رک گئی ہو منصور کی طبیعت

”ماموں حضور“ دونوں بچے ان سے لپٹے جا رہے تھے۔ کئے نامی سے۔“

”بھئی کہہ تو دیا میں نے۔“

”کیا خیال ہے مس ڈی سوزا“ یاسمین نے بچوں کی گورنس کو مخاطب کیا۔

”جیسے آپ کی مرضی“ وہ ادب سے بولی۔

”چلو بچو چھٹی ہوئی“ منصور نے بچوں کو الگ کرتے ہوئے کہا۔ بچے خوشی سے ناچتے کودتے کمرے سے

باہر نکل گئے۔ مس ڈی سوزا نے جلدی جلدی بچوں کا سامان الگ کیا۔

انگور اودل کے سرخ سینٹ میں ننھا شاہین بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے منصور کی طرف آنے

لگا۔

”نہیں بھئی آپ نہیں“ منصور اس کے پیازی پیازی گال کو تھپتھپانے لگے۔ ”آپ اپنی امی کے ساتھ

شریف لے جائیے۔“

تھوڑی دیر بعد دونوں بہن بھائی پور ٹیکو میں کھڑی ہوئی موٹر کے پاس کھڑے تھے۔ ڈرائیور دروازہ کھول کر ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ یاسمین منصور سے مل کر موٹر میں جا بیٹھیں۔ شاہین اب بھی منصور کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اور آیا کی گود سے چل چل کر باہر آنے کی کوشش میں تھا۔

”میرا خیال ہے واپسی پر ہم زلفی بچا کے پاس لندن ٹھہریں گے۔“

”اگر بھائی جان کو واپس آنے کی جلدی ہوئی تو“ منصور موٹر کے دروازے کو پکڑے کھڑے تھے۔

صدیق علی خان ایک مصروف انسان تھے۔ آئے دن انہیں لندن اور نیویارک کا دوبارہ کے سلسلہ میں جانا پڑتا تھا، لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ وہ زلفی کے پاس چند گھنٹے ہی قیام کرنے کے بعد چلے آتے تھے۔

”نہیں بھئی میں تو ضرور ٹھہروں گی۔ زلفی بچا کو ملے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اس دفعہ تو تم بھی ان کے پاس نہیں جا سکتے۔“

”میرا کیا۔ جب جی جا پہنچ جاؤں گا۔“

یاسمین کچھ سوچ کر بولیں۔

”کیا یہ بہتر نہ ہو گا۔ کہ ہمارے قیام لندن کے دوران تم بھی آ جاؤ۔ اللہ قسم منصور بڑا لطف رہے گا۔“

”واقعی۔“

”زلفی بچا بڑے خوش ہوں گے۔“

”وہ تو ظاہر ہی ہے۔“

کچھ دیر تک زلفی بچا کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ یاسمین نے پیار سے منصور کے کندھے پر ہاتھ رکھوا کر تعظیماً

ان دنوں اداس رہتی اور پھر صبح و شام کا وہی گھسپا معمول شروع ہو جاتا۔

اور کچھ اسی قسم کے مشاغل منصور کے لندن جانے پر ہوتے۔ زلفی اپنے عزیز بھتیجے کی آمد پر اپنے مشرقی اور مغربی دوستوں کو مدعو کرتے۔ کبھی شکار کے لئے افریقہ کے جنگلوں میں لے جاتے۔ کبھی سٹریٹ لینڈ کی گل پوش اور برف پوش پہاڑیوں میں گھماتے۔ غرضیکہ زندگی میں اک ہل چل سی مچ جاتی۔

منصور ان کے انگریز دوستوں میں بڑے مقبول تھے۔ لارڈ ہیئرٹ، مسٹر پیٹر، جان مکالے تو ان کی آمد کے بڑے شوق سے منتظر رہا کرتے تھے۔ لارڈ ہیئرٹ کی صاحبزادی مس روبی تو ان کی پرستار تھی۔ مشرقی حسن کا یہ نادر نمونہ اس کے خیالوں کی دنیا پر چھایا رہتا تھا۔ سنہری بالوں اور نیلی نیلی آنکھوں والی یہ حسین گڑیا چپکے چپکے منصور کو چاہے جارہی تھی۔ لیکن منصور اس کے لطیف احساسات سے بے خبر تھے۔ وہ ان کے دوست تھے۔ اور دوستی سے آگے بڑھنے کا خیال بھی کبھی ان کے وہم میں نہ آیا تھا۔

پچھلے سال منصور ویاکین چند دنوں کے لئے لندن گئے تھے۔ ایک بہت بڑی پارٹی ان کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ کھانے کے بعد ممان ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔

”مجھے آپ کا گھر دیکھنے کا بڑا شوق ہے“ مس روبی نے بڑے شوق سے منصور سے کہا۔

”کبھی تشری لائیے نا۔ ہمیں بڑی مسرت ہوگی۔“

”یہی تو دقت ہے کیسے آؤں۔ کب آؤں۔“

”منصور کی شادی پڑائیے گا رہی یا نہیں نہ کہا ہمارے ہاں کی شادی بھی آپ کے لئے باعث مسرت ہوگی۔“

منصور مسکرا دیئے۔ اور روبی کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے اک گہری سانس بھر کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ یاکین نے سنجیدہ نظروں سے اس کے چہرے پر چھا جانے والے سراپوں کو دیکھا۔ اس کے دل کی کیفیات ان سے چھپی نہ رہ سکیں۔ لیکن وہ خاموش ہی رہ گئیں۔ منصور کے نظریے کو وہ جانتی تھیں۔ روبی پر سوائے ترس کھانے کے وہ کچھ بھی کیا سکتی تھیں۔



۴

ایکسپریس ٹرین رات کے تاریک سینے کو چیرتی اڑتی چلی جارہی تھی۔ مسافر آدھ گھر رہے تھے۔ کچھ غافل سو رہے تھے۔ طبقاتی امتیاز نمایاں تھا۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں مسافر بڑے ٹھاٹھ سے سو رہے تھے۔ جو ریل کے شور کی وجہ سے سونہ سکے تھے، پاؤں پدارے سینوں پر لیٹے تھے۔ تھرڈ کے ڈبوں میں مخلوق کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سٹیشن پر تھیں۔ میلی میلی گھڑیوں کو سروں پر رکھے مسافر جگہ کے لئے لڑ رہے تھے۔ اک ہنگامہ پھا تھا۔ جو مسافر جگہ حاصل کر چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ شور سے کسی کی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ اس شور سے لاپرواہ گاڑی چلی جارہی تھی۔ ہر سٹیشن پر وہ جتنی بھیڑا کلتی اس سے کہیں زیادہ بھیڑا اس کے پیٹ میں سما جاتی۔ اور گاڑی اس زائد بوجھ پر چھٹی چلائی چلی جارہی تھی۔

تھرڈ کے ایک زائد ڈبے میں آیا اور ناہید سوار تھیں۔ جگہ تو نہیں تھی۔ لیکن آیا نے ذرا ہمت کر کے ایک کونے میں ناہید کے لئے جگہ بنا کر اسے بٹھا دیا تھا۔ خود اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد اسے دنیا کی نظروں سے چھپانا تھا۔ لیکن یہاں اس ہڑونگ میں کسی کو ناہید کے متعلق سوچنے کی کیا پڑی تھی۔ ہر ایک کو اپنے کام کے سوا کسی سے کوئی کام نہ تھا۔ پھر بھی بوڑھی آیا نے احتیاطی تدابیر برتتے ہوئے اسے چھپا رکھا تھا۔

ناہید گم سم بیٹھی تھی۔ اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ تھرڈ ایر کی طالبہ تھی۔ زندگی کا ایک سیدھا سادہ ایمان بنا کر وہ تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھی، لیکن ماں کے مرنے کے بعد تو اس کی زندگی کی بنیادیں تک ہل گئی تھیں۔ فیروز نے اس کی زندگی میں انقلاب پھا کر دیا تھا۔ اب وہ آیا کے ساتھ جارہی تھی۔ ”کہاں“ یہ وہ نہ جانتی تھی۔ ایک نامعلوم منزل تھی۔ جس کی طرف وہ جانے پر مجبور تھی۔ ”جب ایک سوچی سمجھی منزل کا نشان نہ مل سکا تو اس انجان منزل کا کیسے پتہ ملے گا“ وہ کچھ ہی سوچ رہی تھی۔

فیروز ابھی تک اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ وہ سر کو کئی بار جھٹک کر اس کے خیال سے چھٹکارا پانے کی

”ہاں“ مختصر سا جواب دے کر آیا چپ ہو گئی۔ اس وقت وہ کسی گفت گو میں الجھنا نہ چاہتی تھی۔ رات کے واقعہ سے اس کا دماغ بھی متاثر تھا۔ وہ اس وقت ذہنی تھکن محسوس کر رہی تھی۔

سٹیشن آگیا۔ بھیڑ قدرے کم ہو گئی۔ سیٹیں خالی ہوئیں۔ بیٹھی ہوئی سواریاں پاؤں پٹار کر لیٹ گئیں۔

آپا نے بھی ایک سیٹ پر قبضہ کر لیا۔ خالی تختے چھہ رہے تھے۔ آپا نے ناہید کا کوٹ سیٹ پر بچھا کر اسے لٹا دیا۔

کالی شال اس کے اوپر ڈال دی اور کھڑکی پھر کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ناہید کے تپنے ہوئے دماغ کو فرحت بخشی۔ باہر رات سیاہ تھی۔ ستارے ٹٹمار رہے تھے۔ اور ڈبے کے اندر چھت سے چٹنے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے قلعے دھندلی دھندلی روشنی بکھیر رہے تھے۔

”اب توجہ کافی ہے تم اطمینان سے سو جاؤ۔“

”نہیں اماں مجھے نیند نہیں آرہی۔“

”آنکھیں بند کر لو خود ہی نیند آجائے گی۔ کب تک جاوگی۔ ابھی تو سفر بہت ہے کیا سجا ہو گا۔“

ناہید نے کلائی پر بندھی ہوئی چھوٹی سی خوب صورت گھڑی دیکھی۔

”بارہ بجنے والے ہیں“

دوسری سیٹ پر سوئی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اور نیند سے بھری ہوئی آنکھیں کھول کر اس حسن سوگوار کو دیکھا۔ نیند کا غلبہ تھا۔ پلکیں دو چار بار جھپکا کر پھر غافل ہو گئی۔ آپا ناہید کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں سہلانے لگی۔ ناہید کو اک کیف آگئی سرور ملنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چپٹی ہوئی سرخ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہونے لگیں۔ آپا اس کا سر سہلاتی رہی۔ اور کچھ دیر بعد وہ اس کی گود میں سر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔

گاڑی فرارے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

آپا کا تھکا ہوا دماغ مستقبل کا خاکہ بتانے میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ناہید کے کھنے بالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

ناہید نے کروٹ لی۔ سوئی سوئی آنکھوں سے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ وہ پھر غافل ہو گئی۔ آپا کی آغوش میں چلے ہوئے شفقت اور سکون نے اس کی تھکی ہوئی روح کو بڑی حد تک تسکین دی۔

دوسری سیٹ پر لیٹی ہوئی عورت کا پیر لڑھک کر نیچے گر گیا۔ وہ زور سے چیخاں مارتا کرتا تھا۔ نیچے کو اٹھا کر سیٹ پر زور سے چنگا۔ نیچے اور زور سے رویا۔

”تم بخت نہ دن کو آرام کرتا ہے۔ نہ رات کو۔ چپ ہو جا۔“ وہ ایک دو تھرا اس کے سر پر جھاتے ہوئے

کوشش کر چکی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔

”اگر وہ پھر کہیں سے آگیا تو کیا ہو گا“ اس تصور ہی سے اس کے روٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا دل لرز اٹھا۔ اس نے گھبرا کر آپا کی چادر پکڑ لی۔ آپا نے مڑ کر دیکھا ”سو جاؤ“ آپا نے ناہید کی آنکھوں کو دیکھا۔ جو شدت گریہ سے سو ج گئی تھیں۔

”میرا دل گھبرا رہا ہے اماں“

آپا نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

”گفتا جس ہو رہا ہے۔ کھڑکی کھول دو۔ طبیعت کچھ بہل جائے گی۔“

ناہید اسی طرح سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ وہ فیروز کے خیال سے خوف کھا رہی تھی اور آپا کی جماندیدہ نظریں سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی دوسری سیٹ پر کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی عورت چلائی۔

”اے ہے اتنی ٹھنڈ ہے۔ کھڑکی کھول دی تم نے۔ سرد ہوا سینہ چیر رہی ہے۔ تم نے تو گرم کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ خیال کرو۔“

”اماں بند کر دو“ ناہید نے کہا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے اسے قدرے سکون ملا تھا۔ لیکن وہ لڑائی سے ڈرتی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تھوڑا سا کلاس میں عورتیں باتوں باتوں ہی میں لڑتے لڑتے ہاتھ پائی تک ٹوٹ لے آتی ہیں۔

آپا نے کھڑکی پھر بند کر دی۔

”کہاں جانا ہے تمہیں“ آپا نے اس عورت سے پوچھا۔

”بس اگلے سٹیشن پہ اترنا ہے“ وہ عورت ناہید کو دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی میری جگہ پہ تم بیٹھ جانا۔ تمہیں کہاں جانا ہے۔“

”چاند گاؤں“

”صبح پنجوگی تم تو“

”ہاں سحری ہوگی۔ چار پانچ بجے پہنچتی ہے وہاں گاڑی۔“

”میں اتروں گی تو تم جگہ لے لیتا“ وہ بڑی فراخ دلی سے آپا پر احسان کر رہی تھی۔ ”میرا تو تھوڑا سا سفر باقی ہے۔“ پھر وہ اپنے میلے میلے کپڑے سمیٹنے لگی۔

”یہ تمہاری کیا لگتی ہے“ وہ ناہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ آپا خاموش رہی۔

”بیٹی ہے“

حادثے کو دودن گزر گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں ہسپتال کی سنگین عمارت کو بوسہ دے رہی تھیں۔ نیلے نیلے آسمان پر جا بجا بادلوں کے آوارہ کلڑے کھڑے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وارڈ نمبر تین میں کئی زخمی عورتیں پڑی تھیں۔ نرس میز کے قریب کھڑی بستر پر پڑی ہوئی بے ہوش عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اک سما ہوا سکوت چھایا ہوا تھا۔ دروازہ آہستگی سے کھلا۔ ڈاکٹر حمان ہاتھ میں اسٹیتو سکوپ لئے اندر داخل ہوا۔ نرس تعظیم سے ایک طرف ہٹ گئی۔

”ہوش آیا“ معرڈاکٹر نے بستر نمبر ۵ کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی تک تو نہیں آیا“ نرس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا سفید پردہ کھینچ دیا۔ کمرے میں لگا جاسا اندھیر چھا گیا۔ اس نے بتی جلادی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔

”زخم تو زیادہ نہیں آئے دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہیں“ ڈاکٹر بستر نمبر ۵ پر جھکتے ہوئے بولا ”ہوش آ جانا چاہئے اب تو..... دودن گزر گئے ہیں۔“

نرس خاموشی سے دیکھتی رہی۔

تیسرے پلنگ پر ایک عورت چلائی۔ ڈاکٹر اور نرس دونوں اس کی طرف بھاگے۔

وہ عورت بری طرح زخمی تھی۔ سر میں کافی چوٹیں آئی تھیں۔ ایک بازو بھی ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے نرس کو دوائی لانے کو کچھ منٹ بعد نرس دوائی لے کر آگئی اور اس عورت بدقت چلائی۔ عورت کچھ دیر شور مچاتی رہی اور پھر غافل سو گئی۔

”توبہ“ نرس اس کی تکلیف سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔

”بڑا خوف ناک حادثہ ہوا ہے“ ڈاکٹر حمان مشکرانہ زخمیوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”ہاں“

”بعض زخمیوں کی حالت تشویش ناک ہے۔“

”وارڈ نمبر ۲ کے تو سب مریض ہی بری حالت میں ہیں۔ خدائی رحم کرے۔“

ڈاکٹر بولا۔ ”میرا خیال ہے دو چار ہی جانبر ہو سکیں گے۔“

”ان کے رشتہ داروں کو مطلع کیا گیا ہے۔“

”کئی تو یہاں پہنچ بھی گئی ہیں۔ ابھی ابھی تین مرنے والوں کے رشتہ دار آئے تھے۔ میرا تو دل بیٹھنے لگا تھا

ان کی آہ وزاری سن کر“ ڈاکٹر جو موت و زندگی کی کش مکش دیکھنے کا عادی تھا۔ اس وقت بڑا پریشان ہو رہا تھا۔

بولی۔

”سوئے گا یا نہیں“ اسے اپنی نیند کے ٹوٹ جانے پر شاید غصہ آ رہا تھا۔

”کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی“ بچہ زور زور سے چلانے لگا۔

آیا نے اس خیال سے کہ ناہید کی نیند خراب نہ ہو کما۔

”ہمن پیار کر لو اسے۔ ایک نوکر گیا۔ دوسرا تم مار رہی ہو۔“

”تمہیں کیا ہے۔ میرا پناچہ ہے چاہے میں ماروں چاہے بیٹوں“ وہ گنوار عورت بگڑ کر بولی۔

”گھر میں تو نہیں بیٹھی ہو“ آیا کو بھی غصہ آ گیا۔ ”کم از کم دوسروں کے آرام کا بھی خیال رکھنا چاہئے“

”انتہائی آرام کا خیال تھا۔ تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتیں۔ اس ڈبے میں کیوں بیٹھی تھیں۔“

کون جانے یہ تھرو کا سفر اس نے کس مصلحت کے تحت کیا تھا۔

اس عورت نے اتنا شور مچایا۔ کہ دوسری سیٹوں پر اٹھتی ہوئی عورتیں آنکھیں مل مل کر اسے دیکھنے لگیں۔

”بڑی آئی صیحت کرنے والی“۔ وہ اپنے میلے کپڑوں کی گھڑی سر کے نیچے جماتے ہوئے لیٹ گئی۔

آیا کوئی جواب سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ اک دھماکہ ہوا فضا چیخوں سے تھرا لگئی۔

ٹرین مال گاڑی سے ٹکرائی تھی۔

کئی جانیں تلف ہو گئیں۔ مجروح اور مردہ سب اکٹھے پڑے تھے۔ کوئی دم توڑ رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔

کوئی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اگلی تین بوگیاں بالکل تباہ ہو گئی تھیں۔ پچھلے ڈبوں کے مسافر خوف سے کپکپا رہے تھے۔

کچھ دہشت سے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔

یہ جانکا حادثہ سلطان پور سے تین میل آگے ہوا۔ حادثے کی خبر بجلی کی لہر کی طرح شہر میں پھیل گئی۔

لوگوں کا جھوم جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ ایمرپنس گاڑیاں آئیں۔ شہریوں کی مدد سے زخمیوں اور مرنے والوں کو

الگ کیا گیا۔ زخمی ہسپتال لائے گئے۔ اور مرنے والوں کو مردہ خانے میں لا ڈالا گیا۔

اس خوف ناک حادثے کی خبر پاتے ہی نواب منصور علی خان مع اپنے شاف کے پہنچ گئے۔ جگہ کا معائنہ

کیا۔ زخمیوں کو دیکھا۔ اور اپنی گرہ خاص سے پچیس ہزار کاجیک زخمیوں اور تباہ شدگان کی امداد کے لئے دیا۔

ان کی پر زور اپیل پر شہر بھر کے ڈاکٹر ہسپتال میں جمع ہو کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ ڈاکٹروں کی بروقت

اعانت سے ہسپتال کے ڈاکٹروں کو بڑی سہولت ہوئی۔ ڈاکٹر حمان ہسپتال کے انچارج تھے دوپہر تک سب

زخمیوں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔

”آپ ٹرین کے حادثہ میں زخمی ہو گئی تھیں“ ڈاکٹر نے نرمی سے کہا ”شکر ہے آپ کو بالکل معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ چند دنوں تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”معدے سے بے ہوش ہو گئی تھیں آپ“ نرس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

ناہیدہ کو جیسے کوئی بھولا ہوا خواب آگیا۔

”ٹرین کی ٹکر ہو گئی تھی۔“

”ہاں“

”میں اب کس جگہ ہوں۔“

”آپ سلطان پور کے سول ہسپتال میں ہیں۔“

”اور میری آیا..... اماں“ ناہیدہ کو خیال آگیا۔

”آپ ابھی آرام کیجئے صبح ان کا پتہ چل جائے گا۔“

نرس دوائی لے آئی۔ ناہیدہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے اسے لیٹر بنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کو پورے آرام کی ضرورت ہے۔“

نرس نے اسے دوائی پلا دی۔

ناہیدہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ ماؤف ساہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکی۔

ڈاکٹر اس کے متعلق نرس کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ ناہیدہ کو ان کی آوازیں کھینچنے کی جھنجھٹا ہڈ

معلوم ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آیا کو موت کا ظالم دیو نگل چکا تھا۔ یہ خونی حقیقت یہ تلخ انکشاف ناہیدہ کے احساسات پر برق بن کر گر ا۔ وہ تھراشی۔ اس کی شفیق آیا اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ وہ عزیز ہستی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی تھی۔ جس کی نرم و گرم آغوش میں اس نے زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ جس کی پرسکون گود میں دندناتے ہوئے طوفانوں اور امنڈھی ہوئی آندھیوں سے اسے پناہ ملی تھی۔ وہ گھڑ گئی تھی وہ ہانپتا کانپتا بڑھا پہ جس کی کمزور کمزور بنیادوں پر وہ اپنے مستقبل کی دیواریں کھڑی کرنے کو نکلی تھی۔ ختم ہو چکا تھا۔ ناہیدہ بلک کر روئی۔ چل چل کر روئی۔ دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ کئی آنکھیں اس کی ہم آہنگ ہو کر برسیں لیکن کسی کے پاس اس کے درد کا درماں نہ تھا۔ نرسیں اسے تسلی دیتیں۔ ڈاکٹر اسے حوصلہ دلاتا لیکن جو عظیم نقصان آیا کے مرنے سے پہنچ چکا تھا۔ اس کی تلافی ان کھوکھلی تسلیوں اور ظاہر داری کے حوصلوں سے نہ ہو سکتی تھی۔

اسے مستقبل اندھا کنوں نظر آ رہا تھا۔ آیا کا سارا تھا وہ بھی جا تا رہا۔ اب وہ دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ تقدیر

وہ پھر بستر نمبر ۵ کی طرف آگیا۔ کچھ دیر بیٹھیں ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔

”بعض تو ٹھیک چل رہی ہے۔“

نرس نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکی تو دیکھی۔ اور امید افزا لہجے میں بولی۔

”دل بھی ٹھیک ہے۔ سانس بھی ٹھیک چل رہی ہے۔ ہوش میں آنے والی ہیں۔“

”ان کی حالت خدوش نہیں۔ جب ہوش آئے تو مجھے اطلاع دینا۔“

ڈاکٹر کمرے پر اک اپنتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف چل دیا۔

”بہت بہتر“ نرس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر صبح سے داروؤں میں گھوم رہا تھا۔ خدوش زخمیوں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ ہر امکانی کوشش انہیں آرام پہنچانے کی کی جا رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ قدرت نے اسے ایک ہمدرد اور دردمند دل عطا کیا تھا۔ اس ہسپتال کو پندرہ سال سے وہ انچارج کی حیثیت سے سنبھالے ہوئے تھا۔ ہزاروں بیمار اس کی توجہ سے شفا یاب ہو چکے تھے۔ غریبوں کے ساتھ اس کا سلوک فیاضانہ تھا۔ اس لئے وہ بڑا ہر دل عزیز ڈاکٹر تھا۔ ہسپتال کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ بڑی خوش حالی سے زندگی گزار رہا تھا۔ دو لڑکیاں اور ایک بیوی اس کے خاندان کے افراد تھے۔

بستر نمبر ۵ کے زخمی نے حرکت کی۔ نرس جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

ناہیدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اجنبی درو دیوار، ان دیکھا کمرہ۔ کھڑکیوں کے سفید لرزتے ہوئے پردے۔ وہ حیران آنکھوں سے اپنے گرد و پیش دیکھنے لگی۔ اس نے کئی بار آنکھیں جھپکائیں۔ تھکا ہوا دماغ کچھ نہ سمجھ سکا۔

نرس تیزی سے باہر نکل گئی۔ واپسی پر ڈاکٹر حمان جلدی جلدی قدم اٹھاتے اس کے ہمراہ آ رہا تھا۔ وہ دونوں ناہیدہ پر جھک گئے۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ جو بیٹوں کی بندش کی وجہ سے بھاری ہو رہا تھا۔ سارے بدن میں اک تشنمی اٹھاؤ تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا حافظے کی مدد سے کچھ یاد کرنا چاہا۔ لیکن کچھ نہ سمجھ سکی۔ سامنے کھڑی کا سفید پردہ لرز رہا تھا۔ اور بجلی کا بلب روشن نظر آ رہا تھا۔

”میں کہاں ہوں“ وہ نحیف آواز میں بولی۔

”آپ ہسپتال میں ہیں“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ہسپتال“

”گھبرائیے نہیں۔ آپ کو صرف معمولی چوٹیں آئی ہیں۔“

”میں کیوں یہاں لائی گئی ہوں۔“

نے اس کے ساتھ ملک مذاق کیا تھا۔ اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جسے شکاری تفتن طبع کی خاطر پر کاٹ کر بچرے سے باہر نکال دیتا ہے۔ پرندہ آزادی پا کر اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کئے ہوئے بال دپر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ وہ اچھلتا ہے اور پھر پھڑپھڑا کر صیاد کے قدموں میں آگرتا ہے۔ اور شکاری اک دلچسپ کھیل سمجھ کر اس کی محرومی کا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔

پچھلے چند دنوں میں اس کی زندگی نے کئی لمبے کھائے تھے۔ لیکن یہ پلانا کچھ اس قدر سہم گئیں تھا کہ ناہید کا دماغ چکر اگیا۔ آیا کی تدبیر سے وہ فیروز کے جنگل سے آزاد ہو گئی تھی۔ لیکن تدبیر تقدیر سے الجھ گئی تھی۔ آیا بغیر منزل مقصود پر پہنچانے ابدی نیند سوچتی تھی۔ کوئی مونس و غم گسار نہ رہا تھا۔

دن بھر روتے رہنے سے اس کا دماغ کسی بات کو اچھی طرح سوچنے سے عاری تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے ادھوری ادھوری باتیں سوچ رہی تھی۔ سفید سوتی ڈھیلے ڈھالے ہسپتال کے کپڑوں میں ملبوس وہ ماضی حال اور مستقبل کی الجھنوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی خاکہ نہ بن سکا۔ کوئی پروگرام مرتب نہ ہو سکا۔ معا اسے اپنی ماں کی دی ہوئی ہیرے کی انکشتری کا خیال آگیا۔ بیش قیمت انگوٹھی بچ کر کچھ تو گزارے کی صورت ہو جائے گی۔ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ کچھ دھک سے رہ گیا خرطی انگلیاں خالی تھیں۔ انگوٹھی اور گھڑی دونوں غائب تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بلا ارادہ اس کے ہاتھ تکتے کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے چادر الٹ پلٹ کر ڈالی لیکن دونوں چیزیں نہ ملیں۔ وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

نرس رات کا کھانا لے کر آگئی۔ ناہید آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ نرس نے سمجھا وہ سو رہی ہے۔ کھانا میز پر رکھ کر بغیر اسے جگائے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد جب وہ واپس آئی تو ناہید اسی طرح پڑی تھی۔ اس نے جھک کر اسے ہلایا۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں جو دوسو سوں اور اندیڑوں سے گہری ہو رہی تھیں۔

”کھانا کھا لیجئے“

اس نے انکار کر دیا۔ نرس نے ہلایا۔ پھلایا وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اپنی عزیز آیا کے مرنے کا صدمہ ہے۔ جو وہ کھانا کھانے سے انکار کر رہی ہے۔ لیکن اس وقت اس کی موت کے صدمے سے زیادہ اسے اپنی انگوٹھی کے کھونے کا غم تھا۔ اس نے چاہا کہ اس کے متعلق نرس سے استفسار کرے۔ لیکن نرس سے کچھ پوچھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ وہ خاموش رہ گئی۔ نرس کے اصرار پر چند لمبے زہر بار کئے۔ اور پھر بڑھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ مستقبل تاریک تھا۔ اتنا تاریک جس میں اجالے کی چمک نظر آنے کا کوئی گمان ہی نہ تھا۔

صبح ڈاکٹر حمان نے اس کی پٹی کھلی۔ بازو کا زخم اچھی حالت میں تھا۔

”چند دن اور لگیں گے۔ پھر آپ گھر جانے کے قابل ہو سکیں گی“ ڈاکٹر زخم پر پھیپھار کھتے ہوئے بولا۔

ناہید نے گہرا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

”اپنا پتہ دیجئے۔ تاکہ آپ کے رشتہ داروں کو مطلع کیا جاسکے“ پٹی باندھ کر ڈاکٹر میز پر جھک گیا۔

ناہید چکر اگئی۔ اس کا رشتہ دار کون تھا اس دنیا میں۔ اور گھر جہاں جنمی آگ سکتی تھی۔ جہاں شرافت کو چٹ کر جانے والے شعلے لپکتے تھے۔ جہاں امارت نفس کی تفتنی بجھانے آتی تھی۔ نہیں وہ اس دوزخ میں جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس جلتی ہوئی بجٹی میں واپس جانے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر اس کی خاموشی پر متعجب تھا۔ اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ناہید اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔

”اپنا پتہ بتائیے“ ڈاکٹر نین باتھ میں لئے اس سے مخاطب تھا۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے“ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

ڈاکٹر ایک دم اس کی طرف گھوم گیا۔ اور حیرت مبعری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ناہید کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔

”آپ جا کماں رہی تھیں“ وہ پن کا کلپ گھماتے ہوئے قدرے توقف کے بعد بولا۔

”روزگار کی تلاش میں“ ناہید کے معصوم چہرے پر حزن و ملال کی شکنیں ابھر آئیں۔ ”لیکن جس کے سارے جاری تھی۔ وہ بھی جاتا رہا۔“

”بیٹھ جائیے“ ڈاکٹر کے لمبے میں اک باپ کی شفقت تھی۔ ناہید میز کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اور اپنے وجود کا بار سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کا اشارہ پاتے ہی شکرینے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ کے والدین“ ڈاکٹر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

ناہید کے دماغ کو اک جھٹکا سا لگا۔ اس سے یہ سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے اس سوال پر اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ وہ کیا بتائے۔ کون تھے اس کے والدین۔ باپ..... جو کسی جائز یا ناجائز ذریعہ سے اسے جنم دینے کا موجب بنا تھا۔ اور ماں جس کی ساری عمر طبلے اور گھنگر وڈن کی سنگت پر ناچنے گزرتی تھی جس کی راتیں۔ دن کی روشنی میں تقدس کا ڈھنڈور اپنے پیٹنے والے سرمایہ داروں کی خلوتیں آباد کرتے گزرتی تھیں۔ اسے اپنے ماضی سے کھن آنے لگی۔ یہاں اسے کون جانتا ہے۔ وہ کسی کو کیوں بتائے۔ اسے اپنے آپ کو بہک کر ناگوار نہ تھا۔ خود دار اور غیور ناہید کو اپنی تشویر منظور نہ تھی۔ اس نے سوچا ماضی مرچکا ہے۔ اس کے بھیاںک چہرے سے کفن ہٹانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سوچ میں مستغرق تھی۔ ڈاکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے سوال کا جواب نہ پا کر سوال کو دوسرے رنگ میں دہرایا۔

”منون رہوں گی۔“

”دیکھیں کوشش کروں گا۔ فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

ناہید کی امیدیں ڈوبنے لگیں۔

”میں نواب صاحب سے بات کروں گا۔ وہ ایک محترم انسان ہیں۔ ان کی سرپرستی میں کئی سکول اور امدادی ادارے چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے جلد ہی آپ کا کوئی معقول بندوبست ہو جائے۔“

”میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

”میں جہاں تک میرے امکان میں ہو گا۔ کوشش کروں گا۔“

”شکریہ“ ناہید کو جواب کے لئے یہی موزوں لفظ مل سکا۔ وہ اٹھی۔ اور اپنے وارڈ کی طرف جانے لگی۔

”گھبرائیے گا نہیں۔ ابھی تو آپ کے زخم ٹھیک ہونے میں بھی کچھ دن لگ جائیں گے۔ انشاء اللہ جب

تک آپ کا انتظام ہو جائے گا۔“ ناہید نے پلٹ کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے اخلاص نے ناہید کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھادی تھی۔

”یہ قسمت کی بات ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کو ایسے اندوہ گیں حالات پیش آئے۔ لیکن گھبرانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ صبر و تحمل سے کام لیتا ہو گا آپ کو۔ اور ہاں اگر آپ کو مالی امداد کی ضرورت ہو۔ تو ہسپتال کے فنڈ سے آپ پیسہ لے سکتی ہیں۔“

ناہید کو اپنی آغوشی اور گھڑی کا خیال آگیا۔ دونوں چیزیں ہوتیں۔ تو اسے یوں خیرات نہ مانگنا پڑتی۔ اس کے چندار کو بخش سی لگی۔

”میرے پاس جو بھی اثاثہ تھا۔ وہ بھی لٹ چکا۔ اپنی ضروریات کے لئے آپ کے آگے ہی ہاتھ پھیلاتا ہو گا۔“

ڈاکٹر کو کچھ خیال آگیا۔

”آپ کی امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کو تانا یاد نہ رہا تھا۔“

ناہید سمجھ نہ سکی۔ ڈاکٹر کس امانت کا ذکر کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے ذکر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جب آپ زخمی حالت میں یہاں لائی گئی تھیں۔ تو آپ کو کوئی ہوش نہ تھا۔ نرس نے آپ کی انگلی سے آغوشی اور کلائی سے گھڑی اتار لی تھی۔ تاکہ دونوں چیزیں کوئی آپ کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر اتار نہ لے۔“

ناہید سانس روکے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے اس بات سے اتنی خوشی ہوئی جیسے تیرہ و تاریک مستقبل ایک دم چمک اٹھا ہو۔

”آپ کے والدین حیات ہیں۔“

”نہیں“ ناہید نے بوجھل ہلکیں اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ آنسو آنکھوں میں ٹپکے ہوئے تھے۔

”والدین میں وفات پا چکے ہیں۔ والدہ کو فوت ہوئے صرف ایک ماہ ہوا ہے۔“

”افسوس“ ڈاکٹر بڑے تجسس سے اس کے دلفریب چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ”آپ کس کے پاس رہتی تھیں۔“ دوسرے کے راز جاننے کی انسان کی ازلی خواہش کو ڈاکٹر رو نہ کر سکا۔ ”کوئی قریبی رشتہ دار ہوں گے۔“

”ماں کے مرنے کے بعد چند عزیزوں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے میری آیا مجھے وہاں سے نکال لائی۔ لیکن کسی منزل پر پہنچانے سے پیشتر ہی اس کا ساتھ چھوٹ گیا۔“ ٹھہرے ہوئے آنسو بے تابی سے بننے لگے۔

”بڑا افسوس ہے۔“ ڈاکٹر رحمان نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد کیا ارادہ ہے آپ کا۔“

ڈاکٹر نے جیسے اس کے آبلوں کو ناخنوں سے پھوڑ ڈالا۔ وہ تمللا کر رہ گئی۔ رک رک کر بننے والے آنسو زیادہ روانی سے بننے لگے۔ وہ سر جھکائے روئے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو اپنے سوال پر پشیمانی ہوئی۔

”آپ رویے نہیں۔“ وہ بولا۔ ”آپ کے حالات جان کر مجھے بیحد افسوس ہوا ہے۔ دنیا میں ایسے مظالم ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ جہاں تک ہو سکاں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔“

ناہید آنسو خشک کر رہی تھی۔ لیکن جتنے آنسو پونچھتی اس سے کہیں زیادہ اور بہہ جاتے۔ دکھا ہوا دل ہمدردی کے الفاظ پر اب اظہار تشکر کے طور پر رو رہا تھا۔

”آپ تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔“

”جی میں تھوڑا ایر میں پڑھ رہی تھی۔“

”تو پھر کہیں نوکری.....“ ڈاکٹر ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔

”میں نوکری کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔“ وہ بھیگی بھیگی التجا آمیز نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ ”نوکری کیسے تلاش کروں گی۔“

اس کی بے چارگی پر ادھیڑ عمر ڈاکٹر کا دل پیچ گیا۔

”اچھا میں کوشش کروں گا۔“

”ڈاکٹر“ وہ احسان مندانہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”مجھے کہیں نوکری دلوادیتے ہیں تاہم آپ کی

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کہاں ہیں وہ“

”اپنے دفتر میں“

ناہید ابھی۔ ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا..... موٹی ملل کا سفید دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا۔ اک بوجھل دل اور امید و بیم کی راہوں میں بھٹکتا وادماغ لئے وہ ڈاکٹر کے آفس میں پہنچی۔

”آؤ بیٹا“ ڈاکٹر بڑی بے تکلفی سے بولا۔

”تمہاری نوکری کا بندوبست ہو گیا۔“

”ج“ و فور مسرت سے وہ اچھل پڑی۔

”نواب منصور علی خان سے میں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے تمہیں کام دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

”وعدہ“ ناہید کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ خوشی کا فور ہو گئی۔ وعدہ۔ کسی کا دل دکھائے بغیر مثال

جانے کا بہترین طریقہ۔ وہ سوچ میں غرق تھی۔

”آج شام انہوں نے بلایا ہے۔“

”مجھے.....“

”ہاں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ معمولی قسم کا انٹرویو سمجھ لو۔“

ناہید کی آنکھیں ایک بار پھر امید سے چمکنے لگیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اپنے سوئی ہسپتال کے لباس کو دیکھ کر وہ کچھ مغموم سی ہو گئی۔

”میرے پاس تو کوئی کپڑا بھی نہیں ہے۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”اسی طرح جانے میں کیا ہرج ہے۔“ ڈاکٹر بے ساختہ ہنس دیا۔ ”تمہاری موجودہ حالت کی ترجمانی

اچھی طرح ہو سکے گی۔“

وہ اداس ہو گئی۔

”آج میرے ساتھ گھر چلنا۔ وہاں ناصرہ یا فاخرہ کے کپڑے پہن لیتا۔“

دونوں بہنیں اسے دیکھنے کئی بار ہسپتال آچکی تھیں۔ اس کی بیماری بیماری صورت اس کے حسن اخلاق اور اس کے موجودہ قابل رحم حالات نے دونوں بہنوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ گھر جا کر اپنی امی سے گفتگوں اسی کے متعلق باتیں کرتی رہتیں۔ اور ان کی باتوں نے بیگم رحمان کے تجسس کو اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ بھی محض اسے دیکھنے کے لئے ہسپتال آتی تھیں۔

ناہید ڈاکٹر رحمان کے ساتھ ان کے گھر گئی۔ ناصرہ اور فاخرہ نے بوے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔

”میری انگوٹھی اور گھڑی.....“

”ہاں“

”میں سبھی دونوں چیزیں کھو چکی ہیں۔“

”نہیں وہ میرے گھر بڑی ہیں۔“

”میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر جواب میں مسکرا دیا۔

ناہید کے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک ہسپتال میں ہی تھی۔ اس کی پریشانیوں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ ماضی کا خوف حواس پر چھایا ہوا تھا۔ حال کی بد حالی نے پریشان کر رکھا تھا۔ اور مستقبل اک لاسحدود پھیلاؤ نظر آرہا تھا۔ اس کی نوکری کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر سے اس بارے میں پھر کوئی بات چیت نہ ہو سکی تھی۔ شاید وہ اپنی مصروف زندگی میں ناہید کے آلام کو بھول چکا تھا ناہید کی سوچ رہی تھی۔ وہ سہمی ہوئی زندگی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ جدھر سے روشنی کی کرن نظر آتی۔ اسی طرف راستے کی تلاش میں دوڑا ہوتی۔ لیکن بند راستے تھے۔ اور وہ بھٹک رہی تھی۔

ڈاکٹر رحمان ایک مجلس اور خدا ترس انسان تھے۔ ناہید کے حالات سن کر انہیں بڑا نرس آیا۔ وہ زمانے کی سرد گرم دیکھے ہوئے تھے۔ ناہید کے گرد منزلانے والے خطرات سے انہیں آگاہی تھی۔ اس کا بے مثال حسن اس کے لئے اک مستقل خطرہ تھا۔ وہ اس وقت سر راہ پڑی ہوئی چمکتی ہوئی اشرافیوں کی تھیلی تھی جسے اٹھانے کے لئے ہر ہاتھ لپک سکتا تھا۔ وہ اس دولت بے بہا کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کی اپنی بچیاں فاخرہ اور ناصرہ بھی ناہید کی ہم عمری تھیں۔ بیٹیاں رکھتے تھے۔ اس لئے انہیں اس بے آسرا لڑکی سے گہری ہمدردی ہو گئی۔

ناہید اپنے بستر پر اوٹھنے سے منع پڑی تھی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔ ذہن مفلوج سا ہو رہا تھا۔ ”میں اس سے ڈسچارج ہو کر کہاں جائے گی۔“ یہی اک سوال رہ رہ کر دریا کی خوف ناک لہروں کی طرح اس کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔

”مس ناہید“ نرس نے اسے آواز دی۔ ناہید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بات کرنے کو اس کا جی نہ

چاہا۔

”آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔“

”ڈاکٹر رحمان نے“

”جی ہاں“

”آپ کو کون سا رنگ پسند ہے۔“ فاخرہ نے الماری کھول کر ناہید سے پوچھا۔ ”دیکھ لیجئے جو کپڑے پسند ہوں بہن لیجئے۔“ فاخرہ بڑے فخر سے الماری کھولے اسے اپنے رنگارنگ کپڑے دکھا رہی تھی۔

”پسند نا پسند کا تو سوال ہی نہیں مجھے تو ستر پوشی کے لئے کپڑے چاہئیں۔ کوئی سے دے دیجئے۔“

ناہید کے چہرے پر اک مغموم تبسم تھا۔ وہ میز پر پڑی ہوئی فاخرہ کی تھرڈ ایر کی کتابوں کو بڑی حسرت سے الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس کا ذہن پیچھے کی طرف گھوم چکا تھا۔ اپنی بک شیلیف پر قریب سے رکھی ہوئی کتابیں۔ اپنا شاندار ٹیبل لپ یاد آ رہا تھا۔ ڈیڑھ ماہ قبل وہ گورنمنٹ کالج کی ایک ہونمار طالبہ تھی۔ اور آج در بدر بھٹکتی ہوئی نوکری کے لئے سرگرداں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر اک دہلی سی آہ پھیل گئی۔

”میری قیض آپ کو کھلی ہوگی۔ ناصرہ کی ٹھیک رہے گی۔“ فاخرہ کہہ رہی تھی۔ ایک سفید ریشمی سوٹ نکال کر مہسن نے ناہید کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور جب ناہید سفید سوٹ میں ملبوس غسل خانے سے باہر نکلی تو دونوں بہنیں اس کے جمال کی تجلیوں میں کھو کر رہ گئیں۔

”کہیں آپ کو نظر نہ لگ جائے۔“ ناصرہ شوخی سے مسکرائی۔

ناہید شرما گئی۔

فاخرہ نے سیاہ شنیل کا خوب صورت جوتا سا مفلر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

”لو اب نظر نہیں لگے گی۔“

اور تھوڑی ہی دیر میں تینوں بے تکلف سیلیوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں۔



بیگم رحمان نے اس کے سلام کے جواب میں بڑھ کر اسے چھاتی سے لگالیا۔ اور ناہید بیار کے ترسے ہوئے بچے کی طرح اس کی چھاتی سے لگ گئی۔ سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ناہید کو اپنے لباس پر کچھ ندامت آمیز حجاب آ رہا تھا۔

چائے کے بعد ڈاکٹر رحمان نے فاخرہ سے کہا۔

”بیٹا انہیں کوئی کپڑے دے دو۔ آج انہیں انٹرویو کے لئے جانا ہے۔“

”کہاں“ بیگم رحمان شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ناہید صوفے پر ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

”قصر رعا“ ڈاکٹر نے مختصر سا جواب دیا۔

”نواب صاحب کے ہاں۔“

”ہوں۔“

”وہ کیوں“ بیگم رحمان بات کو نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

”نوکری کے لئے بلایا ہے انہوں نے۔“

بیگم رحمان نے ترحم آلود نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ جسے ہنسنے کھیلنے کی عمر میں اس قسم کی دشواریاں پیش آئی تھیں۔ وہ ڈاکٹر سے اس کے سارے حالات سن چکی تھی۔

”تمہارا کوئی رشتہ دار بھی نہیں۔“ بیگم رحمان نے ناہید کی کمر پر بیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

ناہید نے بے قرار ہو کر کمر بدلی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کچے پھوڑے میں نشتر ڈال دیا ہو۔ ہرلنے والا اس سے یہی سوال کیوں کرتا ہے۔ ماضی کو وہ اپنے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹا رہا تھا۔ لیکن وہ بار بار اس کے سامنے لایا جاتا تھا۔ وہ مضطربانہ اپنے ناخنوں کو کھرچنے لگی۔

”رشتہ دار تو تھے“ ڈاکٹر رحمان نے ناہید کے اضطراب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آج کل کے

رشتہ داروں کا حال تمہیں معلوم نہیں کیا۔ سب کچھ تو تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”توبہ کیسا زمانہ آگیا ہے۔“ بیگم رحمان نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”خوف خدا تو دونوں سے اٹھ ہی چکا

ہے۔“

ناہید کے لئے یہ ذکر اذیت ناک تھا۔ وہ اس واقعہ کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اسے آنے والے وقت کا فکر

تھا۔ گذرے ہوئے لمحوں کا ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔

”وقت پورا ہے تم تیار ہو جاؤ“ ڈاکٹر نے ناہید کو کہا۔

”آئیے“ ناصرہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ناہید اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں بہنیں اسے اپنے کمرے میں لے

آئیں۔

دروں میں سنہری نوکریاں سبز سبز رنگ والے زینے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ زینہ بل کھاتا ہوا اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ چلی زین پر بھی سرخ قالین چمک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹر اور نوکر دونوں میں سے ایک بھی واپس نہ آیا تھا۔ کمرے میں اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر آگئی۔

ہلکی ہلکی نم آلود ہوا چل رہی تھی۔ سورج تیزی سے آغوش مغرب میں سامنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کی پیار پیار کرنیں برآمدے کے سنہری ستونوں پر قہر کر رہی تھیں تاہید ایک مجسمے کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ یہ سنگ مرمر کا ایک بہترین مجسمہ تھا۔ ایک دو شیزہ آئینل میں پھولوں کے گلہ سے لئے قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ سنگ تراش نے فن کو کمال پر پہنچایا تھا۔ تاہید حیرت بھری نظروں سے اس نصب شدہ مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ دیکھنے میں منہمک تھی۔ کہ ایک گول مثل سایا راپیا راپچہ زینے سے اترا۔ آخری زینے سے جانے پاؤں پھسلایا پھٹک لگانے کی کوشش کی۔ پچہ گر گیا۔ تاہید لگی اور بڑے پیار سے بچے کو اٹھالیا۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر اسے شوق سے دیکھنے لگا۔

”کیس جوت تو نہیں آئی“ تاہید نے پوچھا۔

”نہیں شکریہ“ پچہ اس کی گود سے اترتے ہوئے بولا۔ وہ اب بھی پر شوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کا نام“ تاہید آخری زینے پر ایک پیر کے رنگ کا سمارالے کھڑی تھی۔

”میراثام فریدوں ہے۔“

”بڑا پیارا نام ہے“

”آپ کون ہیں۔“

”میں تاہید۔“

”نا..... چیں“ فریدوں نہیں کو سمجھ کر سراٹھار کر صورت میں ہلاتے ہوئے بولا.....

”کیوں بھلا“ وہ مسکرائی۔

”مجھے پتہ ہے آپ کون ہیں“ وہ بڑے اعتماد سے سینہ پھلا کر بولا۔ ہلکے گلابی گرم سوٹ میں اس کا چہرہ

بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ تاہید بچے کی معصوم باتوں میں فکر فردا کو بھول سی گئی۔

”کون ہوں میں“

”آپ..... آپ پریوں کی شہزادی ہیں“ بچے کو اس بات سے توصیف حسن مقصود نہ تھی۔ تاہید کو دیکھ کر

سنی ہوئی کمانوں کی وجہ سے مشابہت کے سلسلہ میں اس نے ایسا کہہ دیا تھا۔

”پریوں کی شہزادی۔“ وہ ہنس دی۔ اس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو گیا۔

”آئی ڈی سوزانے مجھے بتایا ہوا ہے“ وہ معصومیت سے بولا۔



”ابھی شاید نواب صاحب کو آنے میں کچھ دیر لگ جائے“ ڈاکٹر حمان نے تاہید سے کہا۔ تم ہمیں ٹھہرو۔ میں ذرا ہسپتال فون کر دوں۔ نرس کو چند ایک ضروری ہدایات دینی ہیں۔“

تاہید چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ قہر رعنا کے دفتر سے ملحقہ نواب منصور علی خان کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھی تھی۔

”میں دس منٹ تک آتا ہوں۔“ کہہ کر ڈاکٹر حمان پردہ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

ملاقاتی کمرہ شاندار اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے قالین کے ہم رنگ نرم صوفے تھے۔ خوبصورت کشن بڑے جاذب نظر تھے۔ ہلکے سبز رنگ کے مین پردے اونچی اونچی کھڑکیوں اور چوڑے چوڑے دروازوں پر کسی معصوم دل کی طرح لرز رہے تھے۔ بڑے بڑے روسی گلدانوں میں پھول بڑی نفاست سے رکھے ہوئے تھے۔ سیاہ آبنوی میزوں پر نفیسی راکھ دان پڑے تھے۔ چوڑے چوڑے سنہری چوکنوں والی دلفریب سینریاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ کمرے کی ہر چیز سے شان امارت چمک رہی تھی۔

تاہید صوفے کی پشت پر سر کائے امید و بیم کی پرچہ راہوں میں بھٹک رہی تھی تلاش روزگار میں وہ یہاں آئی تھی۔ اگر کام نہ ملا۔ تو کیا ہو گا۔ اس خیال سے اس کا دل ہول کھا رہا تھا۔ اپنی مجبور اور بے بس زندگی پر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دن رات کے تفکرت نے اسے معصوم کر رکھا تھا۔ وہ ایک محکم سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا سرخی مائل سفید رنگ زرد ہو گیا تھا۔ خوبصورت آنکھوں کے گرد حلقے حلقے سے پڑ گئے تھے۔ لیکن اس کی رعنائی میں کوئی فرق نہ آیا تھا حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر کا ملاقاتی کارڈ لے کر نوکر کبھی کا گیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کو گئے بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ اپنے خیالات کو منتشر کرنے کے خیال سے وہ اٹھی اور کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ بے چینی رخنہ ہوئی۔ پچھلے دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر جھاٹکا طویل برآمدے کا چمکیلا فرش قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ محرابی

”مجھے بڑے نواب صاحب سے ملنا ہے۔“ ناہید نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔ مختہر ہمدرد اور خدا ترس کے الفاظ سن کر اس کے ذہن نے نواب منصور کو ایک معر نواب کی شکل دی تھی۔

”بڑے نواب صاحب سے“ وہ زیر لب ناہید کی لاعلمی پر مسکرا دیئے۔

”جی“ وہ گہرا ہنسی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی پلکیں تیزی سے جھپکارتی تھی ”وہ غالباً اپنے دفتر میں آچکے ہونگے“ منصور شوقی سے مسکرائے۔

وہ موج کی طرح بل کھا کر مڑی۔ اور منصور اسے شوق اور تجسس سے دیکھتے رہے۔ کمرے میں ڈاکٹر رحمان کھڑا تھا۔

”آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تو باہر چن تک آپ کو دیکھ آیا۔“

”معاف کیجئے گا آپ کو تکلیف ہوئی“ اس کا دل ابھی تک تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کوئی کوئی سی کھڑی تھی۔ وہ تذبذب کی حالت میں تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کچھ کھو دیا ہو۔ کچھ پالیا ہو۔

باور دی ملازم نے آکر انہیں نواب صاحب کی آمد سے مطلع کیا۔

”سرکار تشریف لے آئے ہیں۔“ وہ ادب سے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

”کہاں ہیں“ ڈاکٹر رحمان نے استفسار کیا۔

”دفتر میں تشریف لے چلیئے“

ناہید ڈاکٹر رحمان کے ساتھ منصور کے پر شکوہ دفتر میں داخل ہوئی..... وہ بڑی سی چمک دار میز کے دوسری طرف شان دار کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر چکرا گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ اور منصور چشم شوق سے اس حسین چہرے پر قوس و قزح کے حسین رنگوں کا امتزاج دیکھتے رہے۔ ناہید کو اپنی غلط فہمی پر ندامت سی ہو رہی تھی۔

”تشریف رکھیے“ منصور زیر لب مسکرا رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

ڈاکٹر رحمان اور ناہید میز کے اس طرف پڑی ہوئی گدے دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور نے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور پھر ڈاکٹر رحمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ڈاکٹر رحمان پہلے بھی اس کے حالات منصور کے گوش گزار کر چکا تھا اب پھر نئے سرے سے وہ کہانی دہرا رہا تھا۔ منصور میز پر کہنیاں نکائے بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا۔ اور منصور کیا سن رہے تھے۔ ناہید کا اس طرف کوئی دھیان نہ تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو بے قراری سے گھمائے جا رہی تھی۔

”آپ ٹائپ جاتی ہیں“ منصور نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔ وہ اپنے آپ سے ابھی رہی۔

”کیا بتایا ہے“ وہ شوق سے بولی۔

”آپ نے آئی ڈی سوزا کو دیکھا ہوا ہے۔“ بچے کے ذہن کا دھار ادوسری طرف منتقل ہو گیا۔

”نہیں“

”آئیے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔“

”ابھی نہیں۔“

”کیوں نہیں“ بچہ اصرار کرنے لگا۔

”ابھی مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“

بچے نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔

”جج کہہ رہی ہوں پھر آؤں گی“ تو تمہاری آئی ڈی سوزا سے ضرور ملوں گی۔“

”ابھی چلیئے نا“ وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

”پھر آؤں گی وعدہ رہا“..... اسے بچے پر بے انتہائی پیار آرہا تھا۔ اگر نواب منصور سے ملتا نہ ہوتا تو وہ ضرور

اس کے ساتھ جا کر اس کی خواہش پوری کر دیتی۔ وہ مجبور تھی۔ بچہ حسرت اور مایوسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ اداس سا ہو گیا تھا۔ ناہید نے جبک کر اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

”وعدہ کیا ہے نا پھر آؤں گی۔“

زینے کے اوپر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی دھیرے دھیرے بچے اتر رہا تھا۔ ناہید نے سر گھما کر دیکھا۔ زینے کے آخری چکر پر۔ بہترین قیمتی سوٹ میں لمبوس منصور کھڑے تھے۔ مردانہ حسن ووجاہت کا دل کش شاہکار اپالو کا جسم کشادہ پیشانی۔ روشن آنکھیں تابناک چہرہ۔ لانا بقاد صحت مند جسم وہ حیرت زان نظروں سے ناہید کو دیکھ رہے تھے۔ نگاہیں ٹکرائیں اور چند لمحوں میں گنگاہٹ سی فضا پر چھا گئی۔ منصور کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ان کے حسین تحدیات کا عکس لطیف تھی۔ ان کے تصورات کا پرتو تھی۔ چند ثانیے دونوں سرزدہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نما فریدوں کبھی منصور اور کبھی ناہید کو دیکھ رہا تھا۔

”ماموں حضور“ اس نے خوشگوار سکوت کو توڑ ڈالا ”یہ بچوں کی شزدادی ہیں۔“ اپنی دانست میں وہ بہت بڑا انکشاف کر رہا تھا۔

جودنوٹ چکا تھا۔ ناہید بچے کی بات پر شرما گئی۔ اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ اور منصور بھی جیسے کسی حسین خواب سے چونک گئے۔ فریدوں ایک رنگین تہلی کے پیچھے بھاگ گیا۔ ناہید کمرے میں واپس جانے کیلئے مڑی۔

”آپ“ منصور کے لب پہلے۔ وہ ابھی تک محسوس سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

”مس ناہید“ ڈاکٹر حمان نے متوجہ کرنے کیلئے آواز دی۔

وہ چونک پڑی۔

”جی“ وہ ڈاکٹر کا منہ دیکھنے لگی۔

”آپ ٹائپ جانتی ہیں۔“

”نہیں“

اس نے جواب دیا۔ خیالات کی یورش میں وہ بھول چکی تھی۔ کہ وہ نوکری کیلئے یہاں آئی ہے۔ اس سوال نے اسے پھر مادی دنیا میں لا پٹا..... وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا منصور سامنے پھیلے ہوئے کاغذوں پر نظر جمائے کچھ سوچ رہے تھے۔

”دیکھ بیٹے“ منصور قدرے توقف کے بعد بولے ”تینوں سکولوں میں جگہ کی گنجائش نہیں ہے۔“

ناہید کو جیسے موت کا حکم سنایا گیا ہو۔ اس کی کمزور کمزور امیدوں نے دم توڑ دیا۔ پریشان سی ہو کر منصور کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر حمان بھی سوچ میں پڑ گیا۔

”مجھے اس دفتر کے لئے ٹائپسٹ کی ضرورت ہے۔“ منصور نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”لیکن میں ٹائپ نہیں جانتی“ وہ مایوسی کے انداز میں بولی۔

”کوشش کرنے سے سیکھ تو سکتی ہیں“ منصور اس کے مایوس چہرے سے بڑے متاثر ہوئے۔

”کیوں نہیں پڑھی لکھی لڑکی ہیں۔ جلد ہی سیکھ جائیں گی“ ڈاکٹر حمان نے سفارش کے طور پر کہا۔

سیکھنے کیلئے مدت درکار تھی۔ اور ناہید کے حالات جلد از جلد روزگار حاصل کرنے کے متقاضی تھے۔ وہ ناامید ہو گئی۔ منصور خاموش تھے۔ اور ڈاکٹر جانے کیا الم غلم باتیں کئے جارہا تھا۔

”بس ٹھیک ہے“ منصور کی آواز پر ناہید نے چونک کر دیکھا۔ وہ ڈاکٹر کی کسی بات کا جواب دے رہے تھے۔

”آپ کل سے کام پر آجائے“ منصور کہہ رہے تھے۔ ناہید تعجب سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”لیکن میں ٹائپ نہیں جانتی“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”آپ لکھنا تو جانتا جانتی ہیں“ منصور نے برجستہ جواب دیا۔ محبوب ہو گئی منصور اس کے گالوں پر پھوٹی

ہوئی شفق کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر حمان پھر باتوں میں مشغول تھا۔ اور ناہید اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی منصور نے میز پر پڑی ہوئی کھٹی کاٹن دبا دیا۔ کچھ لمحوں بعد پچھلے دروازے کا پردہ اٹھا کر ان کا سیکرٹری اعجاز احمد اندر آ گیا۔ اس نے کمرے پر اک اچھتی نگاہ ڈالی ناہید کو دیکھ کر نگاہیں کچھ دیر کیلئے ٹھکیں۔ لیکن وہ جلد ہی منصور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ اعجاز کمرے سے چلا گیا کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں اک فارم تھا۔ اس نے جھک کر فارم منصور کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے دو ایک جگہوں پر دستخط کئے۔ اعجاز نے فارم اٹھایا۔ اور ناہید کی طرف بڑھا۔ کھلا ہوا پن اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

”یہاں دستخط کر دیجئے“ ایک نشان پر اس نے انگلی رکھی۔

ناہید نے جھجکتے ہوئے پن لیا۔ اور نشان والی جگہ پر دستخط کر دیئے۔ قلم اس کی نازک انگلیوں میں تھر تھرا رہا تھا۔

ڈاکٹر حمان نے فارم دیکھا۔ ایک معقول مشاہرہ پر ناہید کو ملازمت مل گئی تھی۔ ڈاکٹر کو ایسے خوشی ہوئی جیسے اس نے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔ اس نے مناسب الفاظ میں منصور کا شکریہ ادا کیا۔ ناہید کو مبارک باد دی۔ اور اٹھتے ہوئے رخصت کی اجازت چاہی۔

”کل سے آجائیں کام پر“ ڈاکٹر نے ایک بار پھر پوچھا۔

”صبح نو بجے سے ایک بجے تک آؤں ہو گا۔“ اعجاز احمد نے جواب دیا۔

ناہید نے بھی نواب منصور کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ لیکن زبان نہ مل سکی۔ وہ گنگ سی ہو گئی تھی۔ اس نے منصور کی طرف دیکھا۔ نگاہوں کو انداز نگاہ مل گیا تھا۔ جو زبان نہ کہہ سکی تھی۔ وہ آنکھیں کھدے چکی تھیں۔

وہ چلے گئے۔ اور منصور کھڑکی میں کھڑے تیزی سے جاتی ہوئی کالی موٹر کو دیکھتے رہے۔ موٹر جا چکی تھی۔ اس کی اڑائی ہوئی دھول بھی منتشر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ بے خیالی میں وہیں کھڑے تھے۔ وہ اک انجانی سی بے قراری۔ اک انجانا اضطراب محسوس کر رہے تھے۔ حسن اپنے تمام بشری تقاضوں کے ساتھ ہزار ہا بار ان کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔ انہوں نے جہاں سوز حسن کو تحسین کی نظروں سے بھی دیکھا تھا۔ قیامت خیز جوانیوں کی تعریف بھی کی تھی۔ لیکن ایسی بے کلی آج سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ آج تو حملہ کچھ اس شدت سے ہوا تھا۔ وار کچھ اس طرح اچانک پڑا تھا۔ کہ کسی مدافعتی قوت کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی لوٹنے والا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے بڑی ہی احتیاط سے بڑی ہی محنت سے رکھی ہوئی عمر بھر کی کمائی کوئی نظروں کے سامنے ہی چر کر لے گیا ہو۔

دل سے کہیں زیادہ ان کی روح چل رہی تھی۔ اس کا جھکاؤ اسی رخ روشن کی طرف تھا۔ جو منصور کے ذہن میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

رات کے کھانے پر ڈاکٹر حمان نواب منصور علی خان کے اوصاف حمیدہ پر اچھا خاصا کچر دے رہا تھا۔ بیگم رحمان پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ناصرہ فاخرہ بھی بڑے شوق سے باپ کی باتیں سنتے ہوئے کھانا کھا رہی تھیں۔ ناہید کو انہوں نے اپنے گھر ہی روک لیا تھا۔ وہ کچھ اپنے خیالوں میں مست میز پر پڑے ہوئے

”اچھی باجی صرف پانچ منٹ میں تیار ہوتی ہوں۔“ وہ کپڑے لے کر غسل خانہ کی طرف بڑھی۔
”صرف پانچ منٹ۔“

”نہیں نہیں کبھی نہیں ٹھہروں گی۔ تم آتی رہنا۔ تمہارے لئے میں بھی لیٹ ہو جاؤں“ فاخرہ کتابیں اٹھا کر باہر جانے لگی۔ ناصرہ واپس چلی اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر فاخرہ کے بڑے اہتمام سے بنے ہوئے بالوں کو الجھا کر غسل خانہ کی طرف بھاگی فاخرہ سسپٹا کر رہ گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ ناصرہ کی طرف لپکی۔ ناصرہ نے منہ پڑا کر کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ کھسائی سی ہنسی ہنس دی۔

”بڑی شریر ہے“ فاخرہ نے ناہید کی طرف دیکھا۔ جو دونوں بہنوں کی چپقلش کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کتنی دل کش تھی ان کی گھریلو زندگی۔ اور اس کی زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ شروع ہی سے خاموش اور الجھی ہوئی۔ تقدیر نے اسے تاک تاک کر نشانہ بنایا تھا۔ وہ ننھے بچے کی اس گیند کی طرح تھی جسے وہ بے خبری کے عالم میں اٹھا کر بھینک دیتا ہے۔ اور گیند ٹھکتی ہوئی کبھی نشانے سے اُدھر اور کبھی نشانے پر جا لگتی ہے۔

تقدیر نے اب اسے ڈاکٹر کے ہاں بھیجا تھا۔ ڈاکٹر کی شفقت آمیز ہمدردی اور اس کے گھر والوں کی بے لوث چاہت نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر پھیلا رکھا تھا۔ لیکن زخموں کی پیپ۔ پھوڑوں کا گندہ مادہ اندر ہی اندر کھلبلا رہا تھا۔ اس گندے مادے کی کرناک جلن اور اذیت ناک سوزش کو وہ چپ چاپ کہہ جانے پر مجبور تھی۔ وہ اک طوائف کی بیٹی تھی۔ طلبہ کی تھاپ پر چھٹک چھٹکنا چنے والی کی بیٹی۔ رات کی تاریکیوں میں ان تاریکیوں سے بھی تاریک گناہوں کو جنم دینے والی بیوہ کی بیٹی۔ یہ بات ناہید کے لئے رسوا کن تھی۔

ناصرہ تیار ہو کر باہر آگئی۔ دونوں بہنوں نے کتابیں اٹھائیں۔ ناہید کو سلام کیا اور کمرے سے باہر آگئیں۔ ناہید کی آنکھوں کا اضطراب بڑھ گیا تھا..... وہ بے دلی سے اٹھی اور غسل خانے میں کل والے کپڑے لے کر چلی گئی۔ اسے اپنے ذہنوں قیمتی ملبوسات یاد آگئے۔ پیارے پیارے رنگوں کے ربڑی کپڑے جنہیں وہ بڑے سلیقے سے الماری میں رکھا کرتی تھی۔ اچھے کپڑوں کا سے بچپن ہی سے براشوق تھا۔ اور اس کے اس شوق کی تکمیل اس کی ماں خود بڑے شوق سے کیا کرتی تھی۔ کیوں کہ ناہید ہی اس کا منہ تھانے آرزو تھی۔ کنگھی کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر سے کچھ روپیہ قرض لینے کے متعلق سوچنے لگی۔ آج تک اس نے کسی سے کچھ مانگا نہ تھا۔ بے لگے ہی سب کچھ مل جاتا تھا۔ قرضہ لینے کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔ لیکن مجبور تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی کپڑا تھا۔ نہ جو تانہ ہی ضرورت کی اور کوئی چیز۔ ”آخر ہرج ہی کیا ہے۔ اس نے دل کو تسلی دی..... تنخواہ ملنے پر قرضہ چکا دوں گی۔“ لیکن مانگنے کے لئے بھی تو ہمت درکار تھی۔ کس منہ سے مانگے گی۔ گھر کی ملازمہ نے آکر اسے چائے کی اطلاع دی۔

”بیگم صاحبہ چائے پر انتظار کر رہی ہیں۔“ نوکرانی اس کے لہراتے ہوئے ہتھکڑیا لے بالوں کو دیکھ رہی

کھانوں کی طرف توجہ دینے بغیر اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ آج وہ بے انتہا خوش تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے دل کی وسعتوں سے کہیں زیادہ مسرتوں سے ہمکنار ہونے کا موقع ملا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی صحرائی آندھیلوں کی طرح بے مقصد زندگی کو ٹھکانہ مل گیا ہو۔ جیسے خزاں کی روندی ہوئی سیسے خزاں کی روندی ہوئی ٹہنیوں پر بے موسمی پھول کھل اٹھے ہوں۔ جیسے تپتے ہوئے صحرائیں میں سے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ جیسے اس کی بیمار روح کو بلاوجہ قرار آگیا ہو۔ جیسے کسی سیمانے اس کے رستے ہوئے زخم لہجہ بھر میں مند مل کر دیے ہوں۔ اس کی روح نامعلوم لطیف گہرائیوں میں کھوٹی چلی جا رہی تھی۔

”کیا یہ ساری خوشی نوکری مل جانے سے ہے۔“ رات کو بستر کر دیش بدلتے ہوئے وہ اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔ دل باغی ہو چکا تھا۔ سرکش ہو گیا تھا۔ ”نہیں نہیں“ کی صدائیں دل کے گوشے گوشے سے اٹھنے لگیں۔ اس نے گہرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ زینے پر پاؤں رکھے فریدوں کی پیشانی کو چوم رہی تھی۔ اور زینے کے آخری چکر پر ریٹنگ کو پکڑے وہی تاناک چہرہ۔ وہی جسم آنکھیں۔ وہی گہری نظریں اک والمانہ شغلی سے اسے گھور رہی تھیں۔ وہ تصور میں بار بار یہی متحرک تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اور محفوظ ہو رہی تھی۔ اور نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

”اٹھئے گائیں آج“ صبح فاخرہ نے ناہید کی رضائی سرکاتے ہوئے کہا۔ ناہید جاگ رہی تھی۔ طبیعت کچھ ست تھی۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ ریشمی رضائی کو آہستگی سے پیروں کی طرف سرکا دیا۔ سورج کی تازہ تازہ کرنیں کھڑکی کے بند شیشوں سے اندر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سردی آج جوں پر تھی۔ ناہید نے سرہانے رکھی ہوئی فاخرہ کی شانل کندھوں پر ڈالی۔ فاخرہ کانچ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”آپ کو بھی تو آفس جانا ہے آج۔“ وہ کتابیں اکٹھی کرتے ہوئے بولی۔
”جاناتو ہے“ ناہید نے آہستگی سے جواب دیا۔ نشہ اتر چکا تھا۔ غماز ٹوٹ چکا تھا۔ اور حقیقت کی دنیا میں سانس لے رہی تھی۔ اس کی زندگی کا سفینہ اک نئے دھارے پر بے جا رہا تھا۔ فاخرہ کانچ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ حسرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا کانچ اور کتابیں داستان پارہ بن چکی تھیں۔ اسے ثواب زندگی سے نبرد آزما کی کرنا تھی۔ جینے کی جدوجہد میں مصروف ہونا تھا۔

”کیا تاؤم ہے آپ کے آ کا۔“ فاخرہ پن میں سیاہی بھر رہی تھی۔
”شاید نوبے پہنچنا ہے وہاں۔“

”آٹھ تو بجے والے ہیں۔“ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی چھوٹی سی گھڑی دیکھ کر کہا۔
”ہائے باجی آپ تیار بھی ہو گئیں۔“ ناصرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
”تم کہاں تھیں۔ آٹھ بج رہے ہیں۔“ فاخرہ نے غصیلا چہرہ بنانے کی کوشش کی۔ ”میں کوئی تمہارے لئے ٹھہروں گی تھوڑا سی۔“

اصولوں کے تحت برتا جاتا ہے۔ شفقت بھی جانے بوجھے قوانین کے ماتحت کی جاتی ہے۔ اگر انہیں اس کی اصلیت معلوم ہو جائے۔ تو سارا خلوص ساری شفقت دم بخود ہو کر رہ جائے۔ محبت پاش نظریں قبر پر سائے لگیں۔ اور اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ گھر سے باہر کر دیا جائے۔ گناہید کی معصوم روح لرز اٹھی۔

.....○.....

تھی۔ جنہیں ناہید بڑی مشکل سے قابو میں لاکر باندھ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سرکش لٹیں اس کی منور پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ اس کے رخِ زیبارہ تصدیق ہو رہی تھیں۔

”پلو“ اس نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔ سنگار میز پر پڑی ہوئی گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھ لی اور ملازمہ کے ساتھ چل دی۔

میز پر قرینے سے چائے کے برتن لگائے گئے تھے۔ چائے دانی پر سرخ ٹی کوڑی پڑی تھی۔ اور چھوٹا ملازم لڑکا دو دھ کاجک لئے دوسرے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ رحمان اور ان کی بیگم آنے سامنے بیٹھے تھے۔ ناہید نے انہیں جھک کر سلام کیا۔

”آؤ بیٹا“ ڈاکٹر رحمان نے کہا۔ ناہید سمٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”شرماؤ نہیں بیٹی بے تکلفی سے ناشتہ کرو۔“ بیگم رحمان ناہید کی جھجک پر پول انہیں۔ ”اپنا گھر ہی سمجھو اسے۔ ہم تو یہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ اللہ میاں نے بیٹھے بٹھائے تمہارے جیسی پیاری بیٹی عنایت کر دی۔ ڈاکٹر رحمان چائے پیتے ہوئے مسکرا لے لگا۔ ناہید نے تشکر ادا نہیں دیکھا۔ اور ناشتہ کرنے لگی۔

”انہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہوگی۔“ ڈاکٹر اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

”جتنے جی چاہے لے لیں۔“

ناہید کی مشکل ڈاکٹر نے حل کر دی تھی۔ وہ اس کی ممنون تھی۔ ڈاکٹر اس کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہو رہا تھا۔ اور ناہید اس کے رحمت کے سایوں تلے سکون کا سانس لے رہی تھی۔

”آج شام کو فاخرہ ناصرہ کے ساتھ بازار جانا اور ضرورت کی چیزیں خرید لانا۔“ چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پیار سے بڑے خلوص سے بیگم رحمان بولیں۔

پھر بیگم رحمان دیر تک کپڑوں کی گرانی کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ ناہید ان کے خلوص سے بڑی متاثر تھی۔ اس کے خیالات پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ماں کی طوائفیت کھوکھلی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔

سازھے آٹھ ہو چکے تھے۔ نوبت ناہید کو قصرِ عمارت پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر میز سے اٹھا۔ بیگم بھی اٹھی۔ اور ناہید نے بھی ان کی پیروی کی۔

”شام کو بازار ضرور جانا۔ پیسوں کا کوئی فکر نہ کرو۔ فاخرہ کو سب دکانیں معلوم ہیں۔ تمہیں کوئی دقت نہ ہوگی۔“ بیگم رحمان چابیوں کا بڑا سا کچھا گھماتے ہوئے بولیں۔

ناہید نے شکر ادا کیا۔ وہ مضطرب ہو رہی تھی۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے۔ کہ وہ اک طوائف کی بیٹی ہے۔ تو ناصرہ فاخرہ کو اس کے پاس پھٹکنے تک نہ دیں..... عجب دنیا داری ہے۔ یہاں خلوص بھی چند بندھے

پاؤں سے سینٹل اتار دی تھی۔ شمسہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے نومند بازوؤں کا کساؤ محسوس کر کے وہ فرحت سی محسوس کر رہی تھی۔

منصور نے جو کچھ کیا تھا۔ اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کیا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ کچھ دیر کے لئے شمسہ کے حسن و جوانی کی قیامت خیزوں کے محترف ضرور ہو گئے تھے۔ اس کا پاؤں سہلاتے ہوئے وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ جذباتی سرکرتھی۔ جو کچھ دیر کے بعد خود بخود ہی رفع ہو گیا۔ منصور ڈوبنے سے پہلے کنارے پر آگئے تھے۔ لیکن شمسہ کی حالت ان سے مختلف تھی۔ پہلے تو اس کے تعلقات منصور سے محض دوستانہ تھے۔ اور پرستاروں کا ایک وسیع حلقہ ہوتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کبھی بات بڑھانے کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد اس کے دل میں سوئے ہوئے لطیف احساسات جاگ اٹھے۔ اور وہ منصور سے دوستی کی حدود سے آگے تعلقات بڑھانے کی خواہش محسوس کرنے لگی۔

اپنی اسی خواہش کے اتمام کے لئے آج وہ اک نئی شان سے، نئی وضع سے جہج کر منصور کے پاس آئی تھی۔

”صاحب“ شمسہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے باوردی ملازم سے پوچھا۔

اندر وہ ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شمسہ آگے بڑھی۔ دروازے کا جھلکاٹا ہوا ریشمی پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں ملگیا سا اندھیرا تھا۔ منصور صوفے پر تقریباً نیم دراز بڑے مطمئن انداز سے سرکٹ پیڑ پر تھے۔ آہستہ میز پر کیون اے کاڈبہ کھلا ہوا پڑا تھا۔ اور چاندی کے خوبصورت راکھ دان میں جلے ہوئے سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے پڑے تھے۔ منصور نیم و نظروں سے مرغولوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہر مرغولہ کئی چکر کھا کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اور اس تحلیل شدہ دھوئیں سے ایک ہی جگہ چہرہ ابھر رہا تھا۔ اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ۔ اپنی تمام دل آویزیوں کے ساتھ۔ وہ بڑی خاموشی سے اس ابھرنے والے چہرے کو دیکھتے ہوئے شام کے رنگین و سنگین حادثے پر غور کر رہے تھے۔ ناہید کو ایک بار دیکھا تھا۔ لیکن وہ بڑی اپنائیت سے ان کے مطلع حیات پر چھا گئی تھی۔

وہ ناہید کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جس کے متعلق انہیں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔ کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ تھراڈز میں بڑھتی تھی اور رشتہ داروں کے مظالم سے تنگ آکر ایک معتبر آئی کی مدد سے تلاش روزگار کے لئے گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر حمان نے بتایا تھا۔ لیکن انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ناہید ان کے لاشعور میں مدتوں سے دبئی بیٹھی تھی۔ اور آج اچانک شعور میں ابھر آئی ہے۔ وہ مدتوں سے اسے جانتے ہیں۔ وہ ان کی اپنی ہے۔ بالکل اپنی۔ وہ کچھ اس محبت کے عالم میں تھے کہ شمسہ کے اندر آنے کی انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

۶

شام کے دھندلے پھیل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے خون کی لالی ابھی تک افق پر پھیلی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار حد تک خنک تھا۔ یہ سلطان پور کی آب و ہوا کی خصوصیت تھی۔ فضا ہمیشہ خوش گوار رہتی۔ پندرہ بیس دن کچھ جس ہوتی تھی۔ ورنہ موسم عام طور پر اچھا ہی رہتا۔ سرما البتہ کافی سرد ہوتا تھا۔ ارد گرد کی پھیلی ہوئی پہاڑیوں پر برف پڑتی۔ اور برف سے ٹکرائی ہوئی ہوائیں موسم کو بچ کر دیتیں۔

قصر رعنا کی سرخ بجزری والی سڑک اندھیرے میں کچھ ٹیالی ٹیالی سی دکھائی دے رہی تھی۔ سرو کے بلند درخت خاموش کھڑے تھے۔ نیلے رنگ کی لمبی چمکیلی کار بجزری پر چلتی ہوئی آئی اور پورٹیکولس ٹھہر گئی۔ برآمدے کی میز میوں پر بیٹھا ہوا ملازم باادب کھڑا ہو گیا۔ موٹر کا دروازہ کھلا۔ شمسہ بڑے اہتمام سے باہر نکلی۔ تراشے ہوئے بال مرمرس بازوؤں سے کھسکتی ہوئی سرخ ساڑھی۔ چست بلاؤز کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے بے قرار جسم۔ خوب صورت آنکھوں میں قہرمانی تناؤ۔ لمبی لمبی اٹھلیوں پر کیونکس آلود ناخن۔ چہرے پر اک آلودہ مسکراہٹ۔ یہ تھی شمسہ شمر کے متمول سینٹھ نظیر الدین کی اٹھوٹی بیٹی۔ جو اپنے حسن کے حدود اربعے سے بخوبی واقف تھی۔ اور اپنی دانست میں اپنے حسن کے تیروں سے منصور کے دل کو گھائل کر چکی تھی۔ عام لوگوں کا بھی خیال یہی تھا کہ منصور مستقبل قریب میں اس سے شادی کر لیں گے۔ خود منصور نے بھی کئی دوستوں کی دہی دہی زبان سے یہ ذکر سنا تھا۔ لیکن اس بات کو کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ شمسہ ان کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ اور اس سے دوستی کی وجہ سے منصور کو شمسہ سے دوستانہ مراسم قائم رکھنے پڑے تھے۔

برآمدے کا زینہ چڑھتے ہوئے شمسہ کو پچھلی دفعہ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ جب انہیں میز میوں سے اترتے ہوئے اس کا پیر پھسل گیا تھا۔ اونچی اڑھی کا نقیس سینٹل اس کے پاؤں میں تھا۔ پیر بری طرح جھرجھو جاتا۔ لیکن کرنے سے پہلے منصور نے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا تھا۔ پیر معمولی سے دباؤ کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ منصور جلدی سے اس کا لطیف بوجھ اٹھائے ڈرائنگ روم میں واپس آگئے تھے۔ اسے صوفے پر لٹا کر

متقید ہو کر رہ جانا انتہائی ظلم ہے۔ ” وہ اپنی طلائی چوڑیوں کو گھماتے ہوئے بولی۔ ساڑھی کا پلو شانے سے کھٹک گیا۔ لیکن اس نے دانستہ اسے نہ اٹھایا۔

”باہر گھومنے کی بجائے آپ یہاں کیسے آگئیں“ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔
 ”آپ کو لینے آئی ہوں۔ اکیلے میں کیا لطف آتا“ اس نے اک ساختہ اداسے منصوری کی طرف دیکھا۔
 لیکن ناہید کی بے ساختہ اداؤں سے متاثر دل اس ساختہ اداسے کیا تاثر لے سکتا تھا۔ منصور کچھ کھوئے سے کھڑے رہے۔

”چلے نا“ وہ طعنی انداز میں بولی۔

منصور کو جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ وہ بولے

”آج تو کلب میں ڈنر بھی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے“ وہ ہنسی ”پچھاچڑانے کی کوشش نہ کیجئے۔ ابھی بڑا وقت ہے۔ آٹھ بجے کلب پہنچ جائیں گے۔ اتنی دیر پہلے جانا کوئی ضروری تھوڑی سی ہے۔“

”سب ممبر موجود ہوں گے۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔“ منصور نے جواب دیا۔

”یوں کیسے کہ آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے“ شمسہ روٹھنے کے موڈ میں آگئی۔ منصور کو مجبور اہاں کمانڈری۔ اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے کے لئے چلے گئے۔ شمسہ صوفے کی پشت پر سر نکائے اپنی کامیابی پر نازاں ہو رہی تھی۔ ملازم چاندی کی طشتریوں میں پھل اور سوکھا میوہ رکھ کر چلا گیا۔ لیکن شمسہ اپنی دھن میں مست رہی۔

کچھ دیر بعد منصور آگئے۔ وہ اس وقت سیاہ ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان کا مردانہ حسن اور نکھر آیا تھا۔

”چلے“ منصور کے کہنے سے پہلی شمسہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے برآمدے میں آ گئے۔ ملازم جھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

برآمدے کے زینے سے اترتے ہوئے منصور کی نظر شمسہ کی پتلی ایزمی والی نازک سی سینٹل پر پڑ گئی۔

”آج پھر وہی سی سینٹل پہنی ہے۔“ منصور کو شمسہ کے گرنے کا واقعہ یاد آ گیا۔

”آج پھر گر جانے کو جی چاہتا ہے۔“ اس نے گردن گھما کر منصور کو دیکھا انہیں اس کی آنکھوں میں اک آگ نظر آئی۔ ناہید کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید اس آگ کی لپک ان کا دامن بھی جلا ڈالتی۔ لیکن اس راہزن ہوش دھواں کو دیکھ چلے تھے۔ اس وقت وہ اپنے اور شمسہ کے درمیان کوسوں کا فاصلہ محسوس کر رہے تھے۔

”گر جاؤں“ وہ جموٹے ہوئے بولی۔ اس کے لبوں پر ہنسی پھیل رہی تھی۔

”آج گریں تو گمری چوٹ کھائیں گی۔ سنبھل جائیے“ کتے ہوئے منصور موٹر کی طرف بڑے۔ ان کے

”ہلو منصور“ شمسہ نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے آواز دی۔ وہ سگرٹ کے بکھرے ہوئے بے شمار ٹکڑوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

منصور نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ”اوہ آپ“ کتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کب تشریف لائیں۔ مجھے پتا ہی نہ چلا۔“

”اندھیرے میں کیا ہو رہا تھا۔ سو گئے تھے کیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”سو یا تو نہیں تھا۔“ وہ کھیانہ ہنسی بنے۔

”پھر کیا ہو رہا تھا۔“

شمسہ کاجی چاہ رہا تھا منصور کہہ دیں ”آپ کی یاد میں غافل ہو رہا تھا۔“ اسی لئے اس نے پھر پوچھا۔

”آپ کی آمد کا الہام ہو رہا تھا“ منصور بولے۔ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے ہٹن دیا۔ کمرہ برقی روشنی میں

جگمگاٹھا۔ شمسہ کی آنکھیں و فورسٹ سے چمک رہی تھیں۔

”میری آمد کا الہام ہو رہا تھا۔“ وہ منصور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ آنکھیں! جن میں

تصویرات کالوچ تھا۔

”ہائل“

”اور غالباً آپ کو یہ بھی پتا چل گیا ہو گا۔ کہ مابودت کا ورود کس سلسلے میں ہے۔“

”ضرور“

”بتائیے تو بھلا“

”پہلے تشریف رکھیے“ منصور صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

شمسہ اک ادائے دلربانہ سے بالوں کو پیچھے جھٹک کر بڑھی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ منصور اس کے سامنے کھڑے تھے۔ شمسہ کے آنے سے ان کے خیالات کا حسین تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ کچھ بے قرار سے ہو رہے تھے۔ اخلاقی بندشوں کی وجہ سے اس وقت وہ شمسہ کا خیر مقدم کرنے پر مجبور تھے۔

”ہاں تو بتائیے نا میں کیوں آئی ہوں“ وہ بولی۔

”اس وقت سوائے کلب جانے کے آپ کو اور خیال ہی کیا آسکتا ہے۔“ منصور نے سادگی سے جواب

دیا۔

”اول ہوں“ وہ بڑے ناز سے اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”غلا کما آپ نے۔“

”پھر“ منصور بڑے سے خوب صورت گل دان میں پڑے ہوئے پھولوں کی پتیوں کو جھرتے تھے۔

”یونہی ذرا گھومنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آج موسم بے حد خوش گوار ہے۔ ایسے حسین سے میں کمرے میں

نے بیدار ہونے والے جذبات کو پھر سے سلا دینا ہی مناسب سمجھا۔ وہ دونوں دوست رہ سکتے تھے۔ دوستی کی حدوں سے تجاوز کرنے کا خیال دہانہ ہی پڑا۔ اور جب کئی دنوں کے بعد منصور اور شمسہ ملے تو یہ ملاقات ٹکفتر رہی دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح ملے۔

☆.....

دفتر کا کام بالکل معمولی تھا۔ تھوڑی سی کاوش سے ناہید ساری باتیں سمجھ گئی۔ وہ نوبے مستعدی سے تیار ہو کر دفتر جاتی اور ایک بجے تک پورے اٹھناک سے پوری توجہ سے اپنے کام میں مشغول رہتی۔ اس مصروفیت نے اس کی ذہنی پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی کر دی تھی۔ ماضی کا خوف اور فیروز کا دھڑکا یادوں سے کسی حد تک محو ہو چکا تھا۔ وہ پرسکون انداز سے زندگی کے نئے راستے پر گامزن ہو گئی۔

دفتر میں ایک چھوٹا سا الگ تھلگ کمرہ اس کے لئے مخصوص تھا۔ منصور کچھ دیر کے لئے اس کے کمرے میں آتے۔ اس کا کام دیکھتے ہوئے دو چار رسمی باتیں بھی ہوتیں۔ عام طور پر وہ کام دیکھتے اور ناہید لا تعلقی سے پن کے سرے سے کھیتی رہتی یا بے خبری سے کسی جاذب النظر فریم میں لگی ہوئی خوب صورت تصویر کو دیکھنے میں منہمک ہو جاتی۔ لیکن اس ملاقاتی میں بھی اک تعلق ہوتا۔ اس بے خبری میں بھی اک خبر ہوتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی روح ہر زاویے سے منصور کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہے۔

سارے دن میں منصور سے چند لمحوں کا یہ ٹکراؤ اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ ٹکراؤ جو چنگاریاں پیدا کر رہا تھا۔ مدھم مدھم سی چمکتی ہوئی چنگاریاں جو راکھ کے ڈھیر تلے بھی نہیں بجھتیں جلتی ہیں اور جلائے جاتی ہیں اور مسلسل جلائے جاتی ہیں۔

سردیوں کا ایک حسین دن تھا۔ فضا سردی سے بوجھل سی ہو رہی تھی۔ مطلع ابیر آلود تھا اور بھیگی بھیگی ہوا چل رہی تھی۔ ناہید نے اٹھ کر مشرقی کھڑکی بند کر کے پردہ گرا دیا۔ بیٹر چل رہا تھا۔ کمرہ تھوڑی دیر میں خوش گوار حد تک گرم ہو گیا۔ وہ لکھنے میں مصروف تھی۔ ہلکے فیروز رنگ کے کپڑوں پر سیاہ سوئٹر پہنہ وہ میز پر جھکی ہوئی تھی۔ کاغذات میز پر پھیلے ہوئے تھے۔

منصور آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ لکھنے میں کچھ اس درجہ محو تھی کہ ان کی آمد کی خبری نہ ہوئی۔ وہ وہیں ٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ حسن بے پرواہ تصنع سے بے نیاز اک انوکھے انداز میں ان کے سامنے جلوہ گر تھا۔ وہ مسموم سے ٹکلی باندھے اسے دیکھتے رہے۔

ناہید کچھ سوچنے کے لئے رکی۔ نگاہیں اٹھائیں منصور کو یوں کھڑے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ منصور آہستہ آہستہ بڑھے اور میز کی دوسری طرف رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو یونہی الٹتے پلٹتے وہ ناہید کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ

لبجی کی سردی نے شمسہ کی گرم جوشی کو نکال کر دیا۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ منصور نے بظاہر معمولی سی بات کہی تھی۔ لیکن جو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔ شمسہ سمجھ گئی تھی۔

بڑی خاموشی سے موڑ چلاتے ہوئے وہ منصور کے جملے پر غور کر رہی تھی۔ اسے اپنی بے باکی پر ندامت ہو رہی تھی۔ اپنی ٹکست پر غصہ آ رہا تھا۔ منصور کی بات نے اس کے نسائی وقار کو کسی حد تک ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ اس جملے کو شاید کچھ اہمیت نہ دیتی۔ لیکن منصور کے لہجے کی خشکی اور اس قدر سنجیدگی سے بیٹھنا اسے بری طرح کھٹک رہا تھا۔

بڑی سڑک طے کرنے کے بعد موٹر کلب روڈ کی طرف گھوم گئی۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں“ منصور نے ناگوار سکوت کو توڑا۔

”کلب“ سامنے شیشے پر نظر جمائے شمسہ بولی۔

”کیوں“ وہ متعجب ہو کر بولے ”آپ تو گھومنے کے لئے اصرار کر رہی تھیں۔“

”بس گھوم لیا“ وہ اسی روکے انداز میں بولی۔

منصور کے لئے اس کی ناراضگی کو سمجھنا دشوار نہ رہا تھا۔

”خفا ہو گئی“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”کس بات پر“ اس کا لہجہ بدستور سرد تھا۔

”آپ گرنا چاہتی تھیں۔ میں نے برکت آپ کو متنبہ کر دیا“ منصور پھر سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ”ہم دونوں

دوست ہیں شمسہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے سمجھ بیٹھے..... ہماری اسی میں بھلائی ہے۔ ہم ہمیشہ تخلص دوست رہ سکتے ہیں۔“

شمسہ خاموش رہی منصور نے اب تو بات کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ شمسہ جل کر رہ گئی۔ کلب آگیا موٹر رک گئی۔ منصور اترے..... شمسہ بیٹھی رہی۔

”آئیے“..... منصور اس کی طرف آتے ہوئے بولے

”میں گھر جاؤں گی۔“

”معلوم ہوتا ہے آپ سنجیدہ طور پر ناراض ہو گئی ہیں۔“

”نہیں تو“ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

منصور کے اصرار کے باوجود وہ گھر چلی گئی۔ انہیں اس کی حالت پر رحم بھی آیا۔ لیکن ان کی دوستی اسی اخلاص کی متقاضی تھی۔ انہوں نے شمسہ کو دھوکے میں نہ رکھا تھا۔

شمسہ کئی دن تک منصور سے نہ ملی۔ وہ شش و پنج میں جھل رہی۔ منصور کی باتوں سے واضح نتیجہ نکلتا تھا۔ شمسہ

نے ان آنسوؤں کو چپکے چپکے پانی جانا چاہا۔ لیکن منصور اس کے جھکے ہوئے سر کے باوجود ان آنسوؤں کو دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو سختی سے دانتوں سے کاٹ رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت ان کے قلبی بیچان کی آئینہ دار تھی۔

”میرا مقصد آپ سمجھیں نہیں“ وہ کرسی کی پشت کا سارا لئے کھڑے تھے ”دراصل لڑکیوں کے ہوشل میں دو کمرے خالی تھے۔ آپ کو جگہ کی ضرورت ہوگی۔“

وہ گھوم کر کھڑکی کی طرف بڑھے اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ ناہید نے موقع کو غنیمت جانا اور آنکھوں میں ٹپکے ہوئے آنسوؤں کو جلدی سے پونچھ ڈالا۔

”ہوشل میں تین استائیاں رہتی ہیں اور غالباً ساٹھ لڑکیاں جن کمروں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ بالکل الگ تھلگ ہیں۔ اور محفوظ بھی“ انہوں نے وضاحت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دوسرا یہاں سے بالکل نزدیک بھی ہیں“ انہوں نے کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے ناہید کی طرف دیکھا۔

”وہ دیکھنے یہاں سے عمارت نظر آ رہی ہے۔“

ناہید اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ منصور ایک ہاتھ کھڑکی کا کھلا ہوا پٹ تھامے دوسرے ہاتھ کے اشارے سے اسے عمارت بتا رہے تھے۔ وہ ان کے آگے کھڑی تھی۔ اس کی پشت منصور کی طرف تھی بل کھاتی لہراتی بالوں کی ٹیس فیروز کی ریشمی فیتے سے بندھی تھیں۔ ہلکی ہلکی مدھوش کن خوشبو نے منصور کی توجہ ان گھنیری زلفوں کی طرف مبذول کر دی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کی تھکی ہوئی پرمردہ روح کو ان گھنیری زلفوں کے سامنے ہی اطمینان بخش سکیں گے۔

بیگم رحمان کا لگاؤ ناہید کے ساتھ دن بدن گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ناہید کے ہوشل میں اٹھ جانے کی انہوں نے بڑی مخالفت کی۔

”ہم تو تمہیں اپنی بچی سمجھ رہے ہیں“ وہ ناہید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بات کا غم نہیں ہونا چاہئے۔“

لیکن ناہید نے انہیں سمجھایا بڑے اصرار کے بعد وہ رضامند ہوئیں۔ ناہید بھی ان سے بڑی مانوس ہو گئی تھی۔ لیکن اس وقت یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ اسی لئے باوجود سب گھروالوں کے اصرار کے وہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئی۔

بیگم رحمان جہاں جاتی۔ ناہید کے قصیدے ہی پڑھتی رہتی۔ اس کے حسن کا اس کے وقار آمیز برتاؤ کا اس کی سادگی کا قصہ کوئی محفل ایسی نہ تھی جس میں بیگم رحمان تفصیل کے ساتھ روداد نہ دہراتی۔ ہر چند ناہید نے اسے کوئی بات نہ بتائی تھی۔ لیکن ڈاکٹر رحمان سے اس کے حالات سننے کے بعد اس نے ایک اچھی خاصی حکایت بنا

اب تک نہ سنبھل سکی تھی اور لکھے ہوئے کاغذوں کو سمیٹنے کے بہانے اپنی گھبراہٹ چھپا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمبے بالکل خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جس سے دونوں کی رو میں آسودگی حاصل کر رہی تھیں۔

”آپ ابھی تک ڈاکٹر رحمان کے ہاں مقیم ہیں۔“ بالا سخر منصور نے سکوت کو توڑا۔

”جی“ نظرس اٹھا کر بغیر ناہید نے جواب دیا۔

”وہیں رہنے کا ارادہ ہے؟“

انہوں نے ایسا سوال کیا تھا۔ جس کا جواب ناہید کے پاس نہیں تھا۔

”میرا مطلب ہے وہاں سے آنے جانے میں آپ کو دقت ہوتی ہوگی..... دو میل..... وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

”میں بس سے آتی جاتی ہوں“ ناہید نے آہستگی سے کہا۔

”وہ تو میں جانتا ہوں“ وہ کرسی کے پشت پر سر ٹکا کر پھٹ میں بنے ہوئے خوب صورت نقش و نگار دیکھنے لگے اور ناہید ان کی گفت گو سے کوئی مفہوم نکالنے کی کوشش میں اپنے ناخنوں کو پھسل سے رگڑنے لگی۔

”آپ وہیں رہنے کا فیصلہ کر چکی ہوں تو خیر“ وہ قدرے توقف کے بعد بولے ”ڈاکٹر رحمان اچھے آدمی ہیں۔“

وہ ہراساں سی انہیں دیکھنے لگی۔ فکر معاش سے تو وہ آزاد ہو چکی تھی۔ لیکن رہائش کا مسئلہ بڑی سوچ بچار کے بعد بھی وہ حل نہ کر سکی تھی۔ وہ تقریباً دو ماہ سے ڈاکٹر کے ہاں رہ رہی تھی۔ ناصرف فخرہ کی پر لطف صحبتوں ڈاکٹر اور ان کی بیگم کی اخلاقی سخاوتوں نے انہیں جینیت کے غلاء کو پر کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو ان پر اک بوجھ سمجھتی تھی اور بوجھ سمجھنے کے باوجود وہ ابھی تک وہیں مقیم تھی..... وہ اکیلی جا بھی کہاں سکتی تھی۔ ایک فیروز سے چھٹکارا پا کر آئی تھی۔ لیکن اپنے چاروں طرف پارسائی کے لبادوں میں لپٹے ہوئے کئی فیروز نظر آتے تھے۔ کسی اکیلے گھر میں ایک ملازم کے ساتھ رہنا بھی معیوب تھا۔ تھوڑے سے عرصے میں وہ دنیا کی نظروں کو پہچان گئی تھی۔ تن تنہا کہاں جائے۔ اکیلی کیسے رہے۔ وہ اس کے متعلق صبح و شام سوچتی رہتی تھی۔ جتنا سوچتی تھی۔ اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے ہاں رہ رہی تھی۔ اک مجبوری کے تحت..... وہاں رہ کر وہ کسی حد تک تو کمرسنہ آنکھوں اور تشنہ نگاہوں سے محفوظ تھی۔

”میں وہاں رہنے پر مجبور ہوں“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”مجبور“ منصور کچھ بے تاب سے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

”آپ میرے حالات جانتے ہیں“ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس

لی تھی۔

”بہت بڑے خاندان کی بچی ہے“ وہ بڑے وثوق سے اپنے ملنے والوں سے کہتی ”باپ کا انتقال ہو گیا لیکن ماں زندہ تھی کسی کی مجال نہ تھی جو آنکھ بھر کر اسے دیکھتا۔ ماں کو قضا بھین کر لے گئی۔ تو رشتہ دار بھی اٹھ کھڑے ہوئے لاکھوں کا کاروبار تھا۔ جو ماں سنبھالے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بے چاری پر افتاد آن پڑی۔ وہ تو خیر ہوئی جو آیا ایک ایمان دار عورت تھی ظالموں سے بچالائی اسے ورنہ وہ تو ذرہ بے چکے ہوتے۔ اللہ نے ہی بچالیا۔ ورنہ انہوں نے کسرتھوڑا چھوڑی تھی۔ مال و دولت صدقہ کیا۔ شکر ہے بچی کی جان بچ گئی۔ اللہ قسم میرا بس ہوتا کہ بختوں کا منہ نوچ لوں۔ جو یتیم مسکین بچی کا مال غصب کر کے عیش اُزار ہے ہیں۔“

ناہید کے ہاتھ میں بڑے سے ہیرے کی چمکتی ہوئی پیش قیمت انگوٹھی اور آیا کا ہونا بیگم ر حمان کے بیان پر مہر تصدیق تھی۔

جب ناہید اپنے گھر آئی تھی بیگم ر حمان مع دونوں بچیوں کے کئی بار اسے ملنے آچکی تھی۔ ڈاکٹر حمان بھی ایک آدھ دفعہ آیا تھا۔ لیکن ہسپتال کی مصروفیات کی وجہ سے چند منٹ ٹھہر کر چلا گیا تھا۔ ناہید بھی فرصت کے وقت ان کے ہاں چلی جاتی تھی۔ ڈاکٹر حمان اس کا محسن تھا۔ اسی کی بدولت وہ ایک نئی زندگی کی راہیں استوار کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر اور اس کے گھروالوں کی دل سے قدر کرتی تھی۔ انہوں نے اسے اس وقت سارا دیا تھا۔ جب دنیا اس کی نظروں میں تازہ ہو چکی تھی۔ وہ اس کے لئے شعل راہ بن گئے تھے۔

بیگم ر حمان کے شفقت آمیز برتاؤ کے پس پردہ اپنے بھائی خلیق کے گھر کو آباد کرنے کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی۔ خلیق اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ آنکھیں ذرا بڑی اور رنگ ذرا کھلتا ہوا ہوتا۔ تو شاید وہ ایک خوب صورت مرد ہوتا۔ معقول تنخواہ پاتا تھا۔ طبیعت کا بھی کچھ برانہ تھا۔ بیگم ر حمان ناہید کی نیک طبیعت اور اس کی طبیعت شرافت کو اچھی طرح پرکھ چکی تھی۔ اس کے حالات کسی حد تک جانتی تھی۔ وہ اسے ایک شفاف سمندر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جس کی تہ میں نگاہوں کو خیرہ کرنے والے درہے بہا نظر آ رہے تھے۔

”شاید میرے خلیق کی قسمت جاگ اٹھے۔ اسی لئے قدرت نے یہ انمول عطیہ ہمیں بخشا ہے“ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسرت سے جھوم اٹھتی۔ اور پھر اپنے تخیل کی وسعتوں سے خلیق کو لاکھوں کے کاروبار کا تہمالک دیکھتی۔ اس کے رہنے کی شاندار کوٹھی۔ اور سواری کی شورٹ موٹر کا تصور کر کے ان کا دل رواں خوشیوں سے پھرنے لگتا۔

”شادی کے بعد تو کسی کی جرأت نہ ہوگی۔ نہٹ لیں گے۔ ان ظالم رشتہ داروں سے“ وہ دانت پیس کر ان رشتہ داروں کے متعلق سوچتی رہتی۔ آخر ایک دن اس نے اپنی اس ڈھکی چھپی خواہش کا تذکرہ ڈاکٹر ر حمان سے کر ہی دیا۔

”ڈاکٹر حیرانی سے اس کا منہ ٹکٹے لگا۔“

”تم عورتوں سے خدا ہی بچائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ طب کی موٹی سی کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

”آخر اس میں قباحت ہی کیا ہے۔“ اس نے کرسی ڈاکٹر کے قریب کھینچ لی۔

”تم تو مجھے یوں کہہ رہی ہو جیسے میں ناہید کا بختار ہوں“ وہ کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا ”بہتر یہی ہے یہ بات میںیں پر ختم کر دو۔“

”وہ کیوں“ وہ ماتھے پر ٹکٹیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”ناصرہ کی ماں۔ میں نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا نیک نیتی سے۔ خوف خدا سے ڈر کر۔ مصیبت کے وقت اسے مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے حتی المقدور اس کی مدد کر دی۔ خدا کا سنا ہے۔ اسے نوکری مل گئی۔

اس کی زندگی سنور گئی۔“ اس نے کتاب پر پھر نظریں جمادیں۔ بیگم کماں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

”نوکری مل جانے سے زندگی سنور گئی۔ کیا اچھا تا خیال ہے جناب کا۔ میں تو کہتی ہو۔ مصیبتوں کا دور تو اب شروع ہو گا۔ غضب خدا کا جوان حسین اور تن تما لڑکی.....“

ڈاکٹر کو جیسے کوئی دقیق مسئلہ سمجھ آ گیا ہو۔ کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ اور کرسی پر آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ بیگم ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ ناہید ایک پر خطر مقام پر کھڑی ہے۔ وہ اکیلی اور بے سارا لڑکی ہے ہر نگاہ اس کی جانب بے باکی سے اٹھ سکتی ہے۔ ہر ہاتھ اس کی طرف بڑی سہولت سے بڑھ سکتا ہے۔ وہ زندگی کے پچاس سرود گرم سال دیکھتے ہوئے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا گستاخ نگاہوں اور بے باک ہاتھوں سے بھری پڑی ہے۔ نوکری مل جانے سے وہ فکر معاش سے آزاد ہو چکی ہے۔ دو کمرے مل جانے سے رہائش کا مسئلہ بھی طے ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا مستقبل اتنا ہی دھندلا ہے جتنا پہلے تھا۔“

وہ سوچ رہا تھا اور بیگم گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کسی عالی خاندان کی لڑکی ہے۔“ بالآخر ڈاکٹر بولا ”یہ رشتہ کرنے سے پہلے سوچ لو۔“

بیگم یوں پھٹ پڑی جیسے ڈاکٹر نے بات نہیں کی بارود کو آگ دکھادی تھی۔

”تو کیا ہمارا خاندان چھاروں کا ہے۔“ وہ چمک کر بولیں۔ غصے سے ان کے نتھنے پھڑک رہے تھے ”یا کوئی بھیک منگے ہیں ہم۔“

ڈاکٹر متحیر سا دیکھنے لگا۔

”میں کہتی ہوں آخر کس بات کی کمی ہے ہمارے خاندان میں شرافت نہیں عزت نہیں۔ پیسہ نہیں۔“

”تم تو یونی آپے سے باہر ہو رہی ہو بیگم“ وہ نرمی سے بولا ”میرا مطلب تھا۔“

الجماد کو جس خوبی سے سلجھا یا تھا وہ دل ہی دل میں ان کی بلند کرداری کی معترف ہو گئی تھی۔ اس کا دل ان کے لئے بے پناہ عقیدت محسوس کرنے لگا تھا۔ عقیدت جس میں والہانہ انیت کا رنگ تھا۔ بے لوث چاہت کی چاشنی تھی۔ اسے اکثر یوں محسوس ہوتا جیسے منصور اس کی زندگی کا محور ہیں۔ اور اس کے وجود کی تخلیق ہی محض اس محور کے گرد گھومنے کے لئے ہوئی ہے۔

آج چھٹی تھی۔ اور صبح صبح ہی وہ نماز ہو کر برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کر رہی پر تقریباً نیم دراز اپنے بھیکے بال سکھا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ آ رہی تھی۔ ناہید اپنی مخروطی انگلیاں بالوں میں پھیر رہی تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ اور انہیں سلجھا تے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے آیا کا خیال آ گیا۔ بچپن ہی سے وہ اس کے بال بڑی محبت سے سلجھا یا کرتی تھی۔ وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن اب تک یہ فرض آیا ہی کے ذمے تھا۔ آیا اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے کنگھی کیا کرتی۔ اور وہ اک مسرت بخش سی غنودگی میں ڈوبتے ہوئے آیا کی جھولی میں سر رکھ دیا کرتی تھی۔

کتنی شفیق تھی۔ کتنی مریبان تھی آیا۔

آیا کے خیال کے ساتھ ہی اسے اپنی زندگی کا پچھلا دور یاد آ گیا۔ دھیان ماں کی طرف راغب ہونے لگا۔ ماں..... اس نے اپنے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اسے ماں کے نام کے ساتھ اک بیزاری محبت اک چڑچڑے سے لگاؤ کا احساس ہونے لگا۔ کاش اس کی ماں ایک مالدار طوائف کی بجائے اک غریب مگر شریف بیوہ ہوتی۔ طوائف! کتنا کڑوا لفظ تھا۔

اور طوائف کے عقب میں اسے فیروز کی دو گھورتی ہوئی آنکھوں کا خیال آ گیا۔ فیروز جو بظاہر ایک شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کی روح کی ساری خباثت اس کی چھوٹی چھوٹی چٹکتی ہوئی آنکھوں میں جمع تھی۔ ان آنکھوں کو غور سے دیکھنے پر اس کی ظاہر داری کا پردہ تار تار نظر آنے لگتا تھا۔ فیروز کے خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے فرار کی رات یاد آ گئی۔

خیالات اک تسلسل سے امنڈے چلے آ رہے تھے۔ اور وہ اپنی انگلیاں بالوں میں بے قراری سے پھیرے جاری تھی۔ اس تسلسل نے اسے نڈھال سا کر دیا۔ اس کی طبیعت سکدر ہو گئی۔ سکون غائب ہو گیا۔ اور اس کے احساس پر اک خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ سر جھٹک کر اس نے ان خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سنگار میز کے بڑے آئینے میں اس نے اپنا سراپا دیکھا اپنی گہری اور نشیلی آنکھوں میں جھاٹکا۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں اسے ڈوبتے پھیلتے خوف کے سائے نظر آئے۔ خوف و ہراس جس کی تہہ میں اس کے ماضی کی یادیں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے چاہا۔ کہ اس کا ماضی لاشعور کی لہروں میں ڈوب جائے۔ ماضی جو حال کے سینے میں لوہے کی میخ کی طرح گڑھا ہوا تھا۔

”کیا مطلب تھا ذرا میں بھی تو سنوں۔“ وہ ابھی تک بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے نادانستہ ایسا جملہ کہہ دیا تھا۔ جو اس کے خاندانی وقار پر چوٹ تھی۔ اس چوٹ سے وہ اب تک تھلکا رہی تھی۔

ڈاکٹر کو دراصل یہ بات کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ناہید اور خلیق کا جوڑا سے پسند نہ آیا تھا۔ وہ فطرتاً بے جوڑ شادیوں کا مخالف تھا۔ اسی لئے اس نے ازراہ خلوص یتیم کو یہ بات کہی تھی۔ لیکن یتیم تو جیسے پہلے سے نبرد آزمائی کے لئے تیار تھی۔

”ناہید سے پوچھے بغیر یہ بات منہ سے نکالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں یتیم۔“

یتیم کو تو سب سے زیادہ اس شادی کے تجارتی پہلو کا خیال تھا۔ لیکن ڈاکٹر کی بات بھی ٹھیک تھی۔ ناہید کا عندیہ لینا ضروری تھا اور اسے یقین تھا کہ ناہید اس کے رشتہ سے کبھی انکار نہ کرے گی۔

”اب آئے راہ راست پر“ وہ اپنے ادھیڑ سے چرے پر جوان تبسم لاتے ہوئے بولی۔

”لیکن اس سے پوچھے گا کون“ ڈاکٹر کا انداز متشکرانہ تھا۔

”یہ بھی کوئی قلعہ فتح کرنا ہے نا“ وہ بولی ”اپنی ناصرہ فائزہ پوچھ لیں گی۔ باتوں ہی سے مرضی کا پتہ چل جائے گا۔ دونوں ہمیشہ توفیر یافتہ ہیں اس پر بات سن کر تو پاؤں نہیں پڑے گا زمین پر۔“

اور واقعی جب دونوں بہنوں کو اپنی ماں کی ماں معلوم ہوا تو وہ خوشی سے ناچنے لگیں۔

”امی آج ہی جائیں پوچھنے“ فائزہ نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

”ہشت بنگی“ ماں نے پیار سے ڈانٹا ”ابھی نہیں کوئی موقع تو آ لینے دو۔“

موقع بھی جلد ہی آ گیا۔ خلیق ایک ہفتہ کی چھٹی پر ان کے گھر آیا تھا۔ ماں باپ تو تھے نہیں ایک یہی بڑی بہن تھی۔ چھٹیاں گزرنے وہ اکثر ڈاکٹر رحمان کے ہاں ہی آیا کرتا تھا۔ جس دن وہ آیا۔ یتیم رحمان نے ناہید کی ساری کمائی اس کے گوش گزار کر دی۔ بڑی حد تک بوہا چڑھا کر۔ خلیق کو جوان تھا۔ اس کے دل میں امنگوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور وہ ناہید کو دیکھنے کے لئے بے تاب سا ہو گیا۔

دوسرے دن یتیم رحمان نے ایک شان دار دعوت دی۔ ناصرہ نے ناہید کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں دعوت میں شرکت کی بڑی تاکید کی۔ دعوت خلیق کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ اور مہمان ناہید کو بلایا گیا تھا۔

دراصل دونوں کو متعارف کرنے کی ایک چال تھی۔ جو یتیم رحمان کے زیرک دماغ نے چلی۔

جس وقت ڈاکٹر کا نوکر رقعہ لے کر ناہید کے ہاں پہنچا وہ برآمدے میں ایک آرام کر رہی پر لٹٹی اپنے بھیکے ہوئے بال سکھا رہی تھی۔

وہ اپنے گھر سے جلد ہی مانوس ہو گئی تھی۔ دو آراستہ کمرے اس کی ضرورت کے لئے کافی تھے۔ اس کی ذہنی کلفتیں بڑی حد تک مٹ گئیں۔ منصور نے اس کی رہائش کا پیچیدہ مسئلہ جس خوبی سے حل کیا تھا اس کے ذہنی

”یہ کدھر کی چڑھائی ہو رہی ہے آج۔“ شیریں ناہید کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
 ”ڈاکٹر رحمان کے ہاں جاری ہوں۔“ ناہید کانوں میں موتیوں کی خوب صورت بالیاں پہنتے ہوئے

بولی۔

”اللہ خیر کرے مجھے تو پچارے ڈاکٹر پر رحم آتا ہے۔ پر خیر بوڑھا ہے۔“

شیریں نے کچھ منہ اس طرح بنایا۔ کہ ناہید کو ہنسی آگئی۔
 شیریں ایک سانولی سلونی ہنس کھ لڑکی تھی۔ ناہید کے ساتھ ملحقہ کمروں میں وہ رہتی تھی۔ ہائی سکول میں پڑھاتی تھی۔ والدین مرچکے تھے۔ ایک بھائی تھا۔ جو بھائی کی زلف گرہ کا اسیر ہو کر بس کو بھی بھول چکا تھا۔ حالات کی یکسانیت نے ناہید کو شیریں کے بہت قریب کر دیا تھا۔ چند دنوں ہی میں وہ بے تکلف سیلا بن گئی تھیں۔ اپنے اپنے کام کے بعد ان کا وقت اکثر اکٹھے ہی گزرتا۔

”یہ کیا ہے“ ناہید نے شیریں کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سنہری لفافے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”نہیں بتاتے“ وہ لفافہ چھپاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی اور چہرہ سنجیدہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ناہید نے لفافہ چھیننے کی نیت سے تیزی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”اللہ رے بے تابی۔“ شیریں اس کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے بولی۔

”کیا ہے بتاتی کیوں نہیں۔“ ناہید کھیانی سی ہنسی نہی۔ ”اللہ رے بے تابی“ کہہ کر شیریں نے اس کے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا۔

”دعوت نامہ ہے۔“ شیریں دور سے لفافہ دکھاتے ہوئے بولی۔

”وہ تو نظری آرہا ہے۔ کہاں سے آیا دعوت نامہ۔“ شیریں کے جواب پر ناہید خاموش ہو گئی۔ دوپٹہ درست کرتے ہوئے وہ پھر سنگار میز کے قریب پہنچ گئی۔ شیریں نے اسے ستانے کی نیت سے پھر کہا۔ ”لو دیکھ لو“ اس نے اک لمحہ کے لئے لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے واپس کھینچ لیا۔ ناہید نے معمولی سی بات کو طوالت نہ دینا چاہی۔ بالوں کی جھولتی ہوئی سرکش لنوں کو کھینچ کر وہ پنوں میں جکڑنے لگی۔

”تھرر عتا سے آیا ہے دعوت نامہ۔“ شیریں پھر بولی۔

ناہید کا دل ایک بار تیزی سے اچھلا۔ اس نے گھوم کر شیریں کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کی خواہش محسوس کی۔ لیکن شیریں کی شرارت آمیز مسکراہٹ دیکھ کر جرأت نہ کر سکی۔

”میں حیران ہوں۔“ شیریں بڑے اطمینان سے پلنگ پر بیٹھ کر کہنے لگی۔ ”دعوت نامہ تمہارے نام

ملازمہ کی آواز نے لمحہ بھر کے لئے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

”یہ لفافہ ہے بی بی“ وہ نیلے رنگ کا لفافہ بڑھاتے ہوئے بولی۔

”کون لایا ہے“

”ڈاکٹر صاحب کا نوکر دے گیا ہے۔“

اس لفافے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ آہستگی سے چاک کیا۔ نیلے کانڈ پر اس کے نام خط لکھا تھا۔ وہ پڑھنے لگی۔ ناصرہ نے اسے دوپہر کے کھانے پر بلا یا تھا۔ بڑے اصرار کے ساتھ۔ ”انکار کی گنجائش نہیں۔“ یہ جملہ اس نے متعدد بار لکھا تھا۔

”چلا گیا نوکر“ اس نے خط ختم کر کے سنگار میز پر ہی رکھ دیا۔

”جی“ نوکرانی نے جواب دیا۔ ”وہ تو رقعہ دے کر ہی چلا گیا تھا۔“

”بس جاؤ۔“

نوکرانی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور ناہید سوچنے لگی۔ کہ جائے یا نہ جائے۔ دراصل آج وہ کہیں جانے کے موڈ میں نہ تھی۔ چھٹی تھی۔ اور وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ کچھ پرانی یادوں نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ نوکر چاکا تھا۔ ورنہ اسی کے ہاتھ وہ معذرت کر بھیجتی۔ اب کس کے ہاتھ جواب بھیجے۔ اور بغیر جواب دیئے نہ جانا بھی خلاف تہذیب تھا۔

بڑی دیر لا حاصل سی سوچ کے بعد اس نے جانا ہی مناسب سمجھا۔ ”دل ہی بل جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے دلی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اور قرینے سے رکھے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر لباس کا انتخاب کرنے لگی۔

سردی کی شدت ختم ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ نے موسم کو بڑا سانا اور رنگین بنایا ہوا تھا۔ زرد زرد دھوپ خوشگوار حد تک بھلی لگتی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ ناہید نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے۔ اس کا پیاز پیازی رنگ ان کپڑوں کے نکس سے گمراہ ہو گیا۔ بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہلکے گلابی رنگ کے ربوں سے باندھ کر انہیں شانوں پر چھوڑ دیا۔ کھلے بال بل کھاتی ناخنوں کی طرح بچنے لگے۔

”گرم کپڑے کی ضرورت نہیں“ اس نے کالی شال تمہ کر کے الماری میں رکھ دی۔ اور کپڑوں کے ہمرنگ باریک سادہ پٹہ اوڑھتے ہوئے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔

”آجائیں“ دروازے کا پردہ ہٹاے بغیر شیریں نے اجازت چاہی۔

”آجاؤ“ ناہید کے کہنے سے پہلے ہی شیریں کمرے میں آچکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سنہری لفافہ تھا۔

دعوتی رقعہ معلوم ہوتا تھا۔

تھی۔ لیکن شیریں کے ساتھ باوجود بے تکلف ہونے کے اس نے کبھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔
”شیریں تمہارا مذاق بعض اوقات آزاد ہونے کے علاوہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔“ اس کا لہجہ بڑا افسردہ تھا۔

”برامان گئیں۔“ شیریں اس کے افسردہ انداز سے بڑی متاثر ہوئی۔ بڑھ کر اس کے گلے میں ہانسیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”معاف کر دو ناہید۔“

ناہید کے ہونٹوں پر اک زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
گیارہ بجے کے قریب ہسپتال کے نزدیک بس سے اتر کر وہ ڈاکٹر کے بنگلے کی طرف جاری تھی۔ وہ اب تک شیریں کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔

”کیا میری وجہ سے واقعی انہیں مدعو کیا گیا ہے۔“ یہ خیال مسرور کن تھا۔ ”لیکن کہاں منصور اور کہاں میں۔“ دوسرا خیال پہلے خیال کی لطافت کو تلخی میں بدل رہا تھا۔

کچھ صبحی ماضی کی یلغار۔ اور کچھ اس وقت کے متضاد خیالات نے اسے مضطرب سا کر دیا۔ یہاں آنے کی بجائے وہ اپنے بستر میں آرام کرنے کی خواہش محسوس کرنے لگی۔ لیکن اب ابھی تھی۔ ست قدموں سے وہ بنگلے میں داخل ہو گئی۔

ناصرہ اور فاخرہ اس کے انتظار میں چن ہی میں منہل رہی تھیں۔ چھوٹے سے خوب صورت بنگلے کے سامنے مختصر سا چمن تھا۔ لیکن ایک چابک دست مالی اور ان دونوں بہنوں کے ذوق گلہائی اور شوق باغبانی نے چھوٹے سے چمن کو نظر فریب بنا دیا تھا۔

”بڑی راہ دکھائی آپ نے۔“ دونوں بہنیں لپک کر اس کی طرف بڑھیں۔

”اپنے آپ تو آنے کی آپ نے قسم کھا رکھی ہے۔“ ناصرہ نے شکایت کیا۔

”گھنٹہ بھر سے کھڑے کھڑے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ میری تو انگلیں بھی درد کرنے لگیں۔“

فاخرہ بولی۔ ناہید دونوں بہنوں سے ہنسنے ہوئے ملی۔ ان کے خلوص سے بڑی متاثر ہوئی۔

”آج میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ لیکن دیکھ لیں آپ نے بلایا۔ اور میں آ گئی۔“

تینوں ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ صاف ستھرا۔ ہلکے سے فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ بیگم

رحمان وہیں بیٹھی تھیں۔ ناہید نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ انہیں کے قریب صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔ اس

نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔

”ہم تو ہر روز تمہاری راہ دیکھتے ہیں۔ اور تم مینے بعد بھی نہیں آئیں۔“ بیگم رحمان نے بھی گلہ کیا۔

”آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے خالہ جان۔ لیکن دفتر جانا ہوتا ہے۔ اتنا تھک

آنا چاہئے تھا۔ میرے نام کیوں آیا۔“

شیریں کو بلاوا آیا تھا۔ ناہید کو نہیں۔ اس خیال سے ناہید کچھ مجھ ہی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنی ملازمت کا خیال آ گیا۔ وہ منصور کے پاس ملازم تھی۔ اور دعوت نامہ منصور کی سٹائسنسو میں سالگرہ کے شان دار جشن میں شرکت کا تھا۔ دفتری معمولی کلرک کی شرکت ایسے جشن کے لئے ضروری تھوڑی ہی تھی۔ کلرک اور ملازمت کتنے حقیر آمیز لفظ تھے۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

”خاموش کیوں ہو گئیں۔“ ناہید کے کندھے پر شیریں نے ہاتھ رکھ دیا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں اکیلی تھوڑی جاؤں گی۔ تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ اتنے رش میں کیا پتہ چلے گا کسی کو۔“

شیریں کی بات پر ناہید کو غصہ آ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ شیریں اس کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی۔ ناہید ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اور فوراً اسے غصہ آ جاتا تھا۔ اس نے لفافہ ناہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ بڑے سے سنہری لفافے پر مس ناہید لکھا ہوا تھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے تاریک گوشوں میں فروزاں شمعوں نے اجالے نکھیر دیئے ہوں۔ لفافے کو کچھ دیر وہ ہاتھ میں لئے کھڑی رہی۔

”کچھ عجیب سی بات ہے۔“ شیریں ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔

”کیا“ اس نے ڈرتے ڈرتے شیریں کو دیکھا۔

”میرے اور بیگم حق کے نام بھی دعوتی کارڈ آئے ہیں۔“

”تو عجیب بات کیا ہوئی۔“

”اس سے پہلے تو کبھی ہمیں جشن میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ وہ ناہید کی طرف معنی خیز

انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ”تین سال سے تو میں بھی یہاں ہوں۔ اور جشن ہر سال بڑے تزک احتشام سے منایا جاتا

ہے۔“

ناہید خاموش رہی۔

”تمہارے طفیل ہم بھی قصر رعنا دیکھ لیں گے۔ شیریں نے اس کی آنکھوں میں بے باکی سے آنکھیں

ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرے طفیل کیوں“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ارے بھائی۔ ہمیں کون بلاتا تھا۔ تمہیں مدعو کرنے کے لئے ساتھ میں ہمیں بھی دعوت دے دی

گئی۔“ وہ قہر لگاتے ہوئے بولی۔ ”ہمیں تو بڑی مدت سے الہام ہو چکا تھا۔ بچ کر جا بھی کہاں سکتے تھے نواب

منصور۔ ان زلفوں سے زنجیروں نے جکڑ ہی لیا۔“

ناہید کا چہرہ بیرہوئی کی طرح سرخ ہو گیا۔ منصور کی وہ چپکے چپکے پرستش کے جاری تھی۔ چاہے جاری

ناہید کو اپنا یوں موضوع بن جانا کچھ پسند نہ آیا۔

”یونہی۔ طبیعت کچھ بوجھل سی محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ فخرہ کی شوخی اور ناصرہ کی تنبیہی نظروں کا راز ناہید کے سامنے کھل گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ ناصرہ فخرہ اور خلیق باتیں کرتے رہے۔ خلیق ان سے چند سال بڑا تھا لیکن تینوں بے تکلف تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ بیگم رحمان بڑے پیار سے بھائی کو دیکھتی رہی اور ڈاکٹر رحمان سنجیدگی سے ناہید کے خاموش چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔

کھانے کے بعد ناہید ناصرہ کے کمرے میں آگئی۔

”آپ کچھ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیٹ جائیے۔“ پلنگ پوش ہٹاتے ہوئے اس نے مکیہ درست کر کے رکھا۔

”نہیں ناصرہ۔ میں گھر جاؤں گی۔“ ناہید طول سی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔

”ابھی سے“

”ہاں“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ناصرہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ فخرہ بھی آگئی۔ ناہید نے جانے کے لئے اصرار کیا۔

”ابھی تو ماموں جان کے ساتھ سینما کا پروگرام ہے۔“ فخرہ ہنستے ہوئے بولی۔ اور اس ماموں جان کے بار بار تذکرے سے ناہید کو چڑسی ہو گئی۔ اس کا ذہنی الجھاؤ تھکان کی صورت میں اس کے چہرے سے مترشح تھا۔

”میں ابھی گھر جاؤں گی۔“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا۔

”اور سینما“ فخرہ بولی۔ ”ماموں آج سینما دکھا رہے ہیں۔“

”تم جلی جانا میرا جانا ضروری تھوڑا ہی ہے۔“ اس نے قدرے سختی سے کہا۔

”آپ کے بغیر ہمیں کون لے جاتا ہے۔“ فخرہ شوخی سے ہنسی۔ ”آپ ہی کے لئے تو ماموں نے پروگرام بنایا تھا۔ ورنہ تو یہ کیجئے۔ خلیق ماموں اور ہمیں ساتھ لے جائیں۔“

فخرہ نے یہ کھلم کھلا جملہ کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر رحمان کے احسانوں تلے دہلی ہوئی ناہید اپنا غصہ پی گئی۔ خاموشی ہی میں مصلحت سمجھی۔ فخرہ چھوٹی تھی۔ اپنی دانست میں بار بار خلیق کا ذکر کر کے وہ ناہید کا عندیہ لے رہی تھی۔ ناصرہ سمجھ دار تھی۔ ناہید کے اضلال کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ اسی لئے فخرہ کی اوٹ پٹانگ باتوں پر اسے گھور رہی تھی۔

فخرہ کسی طرح خلیق اور ناہید کے ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے خیال کو ناہید پر ظاہر کر دینا چاہتی

جاتی ہوں کہ کہیں باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ ہفتہ میں ایک چھٹی ہوتی ہے۔“

”وہ شیریں کے ساتھ باتیں کرتے گذر جاتی ہے۔“ ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں جی، ہم کوئی شیریں کے ساتھ تھوڑا سی مل سکتے ہیں۔“ ناصرہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

”انہیں باتوں کی وجہ سے تو تم مجھے بے حد عزیز ہو۔“ ناہید فخرہ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے بولی۔

بیگم رحمان ہنستے ہوئے اٹھی۔

”تم لڑ بھگڑو۔ میں ذرا باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔ مجید جانے کیا کار رہا ہے۔ دعوت کے دن تو

مرگ آ جاتی ہے اے۔“

وہ پردہ اٹھا کر باہر چلی گئی۔

”کوئی خاص تقریب ہے آج۔“ ناہید نے اس کے جانے کے بعد ناصرہ سے پوچھا۔

”ہاں“ فخرہ شوخی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ناصرہ نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔ آنکھوں ہی

آنکھوں میں اسے ڈانٹا۔ ناہید کچھ نہ سمجھ سکی۔

”آج ہمارے ماموں جان آئے ہیں۔“ ناصرہ سنجیدگی سے بولی۔ اس کے باوجود فخرہ کے ہونٹوں پر

ہنسی تھی۔

”ماموں آئے ہیں۔ تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ بلا یا اور وہ بھی اتنے اصرار کے ساتھ۔“ ناہید

سوچنے لگی۔ اس کی سوچ کے زاویے تین ہی سے بدلنے لگے۔ فخرہ نے کانچ کی باتیں شروع کر دیں۔ ناصرہ ماں کا

ہاتھ بنانے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور ناہید کا خیال بھی ہٹ گیا۔

کھانے کے میز پر اس کا خلیق سے تعارف ہوا۔ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس خلیق اس کے صین

سامنے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ عمر بھر کے دلوں کا شوق نگاہوں میں لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ناہید دل ہی دل میں کڑھ

رہی تھی۔ آج کی دعوت کا مقصد کچھ غلطی نہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

اور اس کی سوچ کے دائرے الجھ رہے تھے۔

”آپ تو کچھ کھلی نہیں رہیں۔“ ناصرہ نے پھلی والی پلیٹ آگے بڑھائی۔

”بے تکلف ہو کر کھاؤ بیٹی۔“ بیگم رحمان میز کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مرغے کی ٹانگ سے

گوشت نوچ رہی تھی۔

”شاید میری وجہ سے ہاتھ روکے ہوئے ہیں۔“ خلیق مسکراتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں“ ناہید کے لہجے کی سختی کو خلیق نے محسوس کیا۔ میری طبیعت آج ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہو گیا“ ڈاکٹر رحمان شامی کباب اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

تھی۔ جب سے اس نے ماں سے ساتھ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ ناہید سے اسے گمراہی تھی۔ اسی لئے وہ اس رشتہ کی موزونیت یا ناموزونیت سے قطعاً بے پروا تھی۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی۔ کہ ناہید سے ان کی قریبی رشتہ داری ہو جائے گی۔ وہ ان کی اپنی بن جائے گی۔

”ابھی اباجان چلے گئے ہیں۔ وہ آکر آپ کو موٹر پر چھوڑ آئیں گے۔“ ناصرہ نے کہا۔ کیوں کہ ناہید کا گھر جانے کے لئے اصرار ضد کی حد تک بڑھ چکا تھا۔

”انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔“ ناہید جلدی سے بولی۔ ”میں بس سے چلی جاؤں گی۔“

”خلیق ماموں غصے ہو جائیں گے۔“ فخرہ بھربولی۔ آپ کے چلے جانے سے ہمارا سینا بھی رہ جائے گا۔ رک جائیے نا۔“ وہ طبعی نظروں سے ناہید کو دیکھنے لگی۔

”پھر کسی دن آجاؤں گی آج مجھے جانے دو۔ بس کا وقت ہے۔ میں جاتی ہوں۔“ وہ اپنا دہنہ ٹھیک کرنے لگی۔

”بے چارے خلیق ماموں۔“ فخرہ بڑبڑائی۔ ”کتنے شوق سے کہہ رہے تھے سینا ملے جانے کو۔ آج تو آپ نے ان کی بات نہیں مانی۔ لیکن جب.....“

ناصرہ چیخی۔ ”بڑی بد تمیز ہو فخرہ۔ زبان تو قہقہہ کی طرح چل رہی ہے۔“

فخرہ کی ادھوری بات سے پورا مطلب واضح تھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ منڈی میں پڑا ہوا غلے کا ایک ایسا ڈھیر ہے جس پر بولی دینے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ اپنی بے چارگی پر اسے رونا سا آیا۔

بس شینڈ پر کھڑی وہ بے صبری سے بس کا انتظار کر رہی تھی۔ خلیق کی نظروں اور فخرہ کی باتوں سے اس کا ذہن لولہ لمان ہو رہا تھا۔ زخمی ذہن سے رستے ہوئے خون کے یہ قطرے آنسو بن کر بہہ جانے کو تڑپ رہے تھے۔ اپنی بے قراری کو سینے سے لگائے وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔

قریب ہی خانچے والا بوڑھا اسے بھکی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی داڑھی کھجور ہاتھ تھا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے پریوں کی کہانی سننے ہوئے ناچنڈ ہونچہ پری کو قصہ میں دیکھتا ہے۔ پرلی طرف ایک نوجوان اپنی ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے ہلکی ہلکی کھانسی سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چوڑی ساٹ سڑک پر کالج کے بے فکر لوہڑے اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور خواہ مخواہ کی بحث کرتے ہوئے اسے بار بار دیکھ رہے تھے۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ناہید کا دماغ سنسنیلا رہا تھا۔ اس کی بیکلی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر بستر پر گر جائے۔ اس نے ارادہ کیا کہ تاکنے پر چلی جائے۔ لیکن راستہ سنسان تھا۔ اور لوگوں کی اخلاقی پستی کا اسے کافی حد تک تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے اس ارادہ

کو پانیہ تکمیل تک نہ پہنچا سکی۔

یہ سڑک کوئی شاہراہ عام نہ تھی۔ ہسپتال کی وجہ سے بس یہاں رکتی تھی۔ اور یہاں سے چڑھنے اور اترنے والی سواریاں عام طور پر زور و زور سے کاسار لے ہوئے بیمار بیمار زندگیاں ہوتیں۔

بس ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ کھمبے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ بڑھا برا اپنی داڑھی کھجائے جا رہا تھا۔ نوجوان بدستور ٹائی پر ہاتھ رکھے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اور کالج کے لوہڑے بے مقصد بحث میں الجھے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر اس طرف دیکھا جدھر سے بس آنے کی توقع تھی۔ دور سے سڑک کے صاف و شفاف سینے پر بادامی رنگ کی شورلیٹ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ کے کنارے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اور ایسی سے بادامی رنگ کی موٹر کو دیکھنے لگی۔

موٹر گزر گئی۔ لیکن دو چار گز کے فاصلے پر اک جھٹکے سے رک گئی۔ ناہید موٹر میں بیٹھے ہوئے منصور کو دیکھ چکی تھی۔ اس کا دل اس زور سے دھڑکا تھا۔ کہ وہ خود ہی گھبرا گئی تھی۔ منصور موٹر سے اتر کر جلدی سے اس کے پاس آئے۔

”آپ“ وہ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”بس ابھی نہیں آئی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”آئیے۔ میں آپ کو پہنچا دوں گا۔“ اس کا بس شینڈ پر یوں کھڑے ہونا نہیں ناگوار تھا۔

وہ اک جھجک کے ساتھ ان کے ساتھ چل دی۔ منصور بنے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ناہید نے آگے بیٹھنے پر کچھ تامل کیا۔ منصور اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ مجبوراً اسے بھی بیٹھنا پڑا۔ وہ لپاتی شرماتی سڑک کر ایک طرف لگ کر بیٹھ گئی۔

ٹائی کو ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے وہ نوجوان حواس باختہ سا سڑک پر جاتی ہوئی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔ کالج کے لوہڑے بحث کو ختم کرنے کے منتشر ہو گئے تھے۔ اور بڑھا خانچے والا یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے پریوں کے دیس کی شراوی کو اس کا محبوب شہزادہ اڑنے والے گھوڑے پر بٹھا کر کہیں لے گیا ہو۔

اس حسین اتفاق نے دوپہر کے واقعے کی تلخی کو کسی حد تک کم کر دیا۔ ناہید کی حالت اس بچے کی سی تھی۔ جسے کڑوی دوائی کا گھونٹ پلانے کے بعد شکر کا بھر پالا لہ دے دیا جائے۔ اور شکر کی موجودگی کا احساس دوائی کی کڑواہٹ کو بھلا دے۔

وہ دل ہی دل میں خلیق کی بے باک اور گھورتی ہوئی نظروں کا موازنہ منصور کی شائستہ اور ملائم نظروں سے کر رہی تھی۔ منصور کی نگاہیں اس کے رگ و پے میں کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی سنسنی پیدا کر دیتی تھیں۔ اس کی روح لطیف سی گد گدی محسوس کرتے لگتی تھی۔ لیکن خلیق کی نظروں نے تو جیسے رگوں میں خون کی بجائے سیال

آگ بھردی تھی۔

موٹر پر اک جھٹکا لگا۔ خیالات میں کھوئی ہوئی ناہید کاسر منصور کے کندھے سے جا ٹکرایا۔ اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بال منصور کے کندھے پر پھیل گئے۔ منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے تپتے ہوئے ریتلے میدان میں انہیں گمرے بادلوں کی ٹھنڈی چھاؤں میسر آگئی ہو۔ انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال رہی تھی۔ وہ ابھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ لطف و ندامت کے ملے جلے جذبات سے اس کا گلگلوں چہرہ کچھ بھیگ سا گیا تھا۔

”بڑا خطرناک موٹر تھا“ سٹیرنگ پر اطمینان سے ہاتھ رکھے منصور نچلے ہونٹ کے دائیں گوشے کو دانتوں تلے دباتے ہوئے مسکرائے۔ ناہید ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

”بڑے پیچیدہ موٹر آئیں گے۔“ وہ پھر بولے۔ ان کا چہرہ اب تک متبسم تھا۔

ناہید سمجھ نہ سکی کہ وہ کن موٹروں کا ذکر کر رہے ہیں۔ سامنے موٹر کے شفاف شیشے ہے سڑک نظر آرہی تھی۔ جو حد نگاہ تک سیدھی اونچے اونچے درختوں کے درمیان کسی دوشیزہ کی مانگ کی طرح سردیوں کی دھوپ میں چمک رہی تھی..... وہ ہزاروں مرتبہ اس سڑک سے بس میں گزری تھی۔ کوئی پکڑ نہیں تھا۔ کوئی موٹر نہیں تھا بالکل سیدھی ساٹ سڑک تھی۔ جس پر موٹر بڑے مزے سے رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔

”آپ اس راستے سے واقف نہیں؟“ منصور نے اس سے پوچھا۔ ناہید نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں الجھی الجھی سی تھیں۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”کس راستے سے۔“ وہ بمشکل کہہ سکی۔

منصور نے اک گمراسانس لیا۔ اور سامنے شیشے پر نظریں جماتے ہوئے بولے.....

”جس راستے پر ہم بڑی تیزی سے جا رہے ہیں۔ سنا ہے بڑا دشوار گزار ہے۔ منزل بڑی مشکل سے ملتی ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

ناہید ان کی باتیں سمجھ گئی۔ وہ اک لطف آمیز گھبراہٹ محسوس کرنے لگی۔ منصور نے اشاروں ہی اشاروں میں دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی راستے کے مسافر تھے۔ لیکن دونوں کی منزلیں جدا تھیں۔ ناہید سوچ میں کھو گئی۔ منصور! منصور اس کے معبد دل کے معبود تھے۔ اور وہ عابد اور معبود کا فرق جانتی تھی۔

”آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔“ وہ اپنی لمبی لمبی سفید انگلیوں کو مسلتے ہوئے بولی۔ ”پلٹ جائیے۔“

”پلٹ جانا میری عادت نہیں۔“ منصور نے گردن گھما کر غور سے اسے دیکھا۔

”راستہ چاہے کتنا کٹھن کیوں نہ ہو۔ میں منزل پا کے رہوں گا۔“ ان کے لہجے سے عزم صمیم چھلک رہا

تھا۔

ناہید نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ اک بجلی کی کوند تھی جو لمحہ بھر کے لئے چمکی اور غائب ہو گئی۔ ناہید نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بے چین گردشیں کر رہی تھیں۔ اور منصور اس کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہونٹوں کی کپکپاہٹ ان کے افسانے کہہ رہی تھی۔ آنکھوں کی بے چین گردش ان کی کمائیاں سنارہی تھی اور منصور کی روح مجوم رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن اس خاموشی میں فرشتوں کے مقدس گیتوں کا ترنم تھا۔ حوروں کے پاکیزہ رقص کی سرسراہٹ تھی۔

.....○.....

(۷)

پینوں میں بل پڑ جاتے تھے۔ بڑے اور بچے صبح و شام انہیں گھیرے رہتے۔ اور وہ بھی بچوں بڑوں اور بوڑھوں۔
بھی کی محفل میں ان کے ہم عمرین جاتے۔ اسی لئے سب انہیں چاہتے تھے۔

اور انہیں گما گھسیں میں منصور وودن تک دفتر نہ جاسکے۔ ناہید چشم انتظار واکے ان کی راہ دیکھتی۔
قدموں کی آہٹ پر اسے منصور کی آمد کا گمان ہوتا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ کار کے ہارن کی آواز پر وہ خود بخود
کھڑی تک پہنچ جاتی۔ سامان سے لدی پھندی کاریں گزرتی جاتیں۔ اور وہ اک مضحل اضطراب۔ اک مجبور سی
بیقرار سی کو سینے میں چھپائے اپنی جگہ پر بیٹھ کر کاغذوں پر بلاوجہ لکیریں کھینچنے لگتی۔ اس دن منصور نے باتوں ہی
باتوں میں اسے بہت بڑی بات بتادی تھی۔ گو اس دن کے بعد ان دونوں کے درمیان پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔
پھر بھی جو کچھ وہ سن چکی تھی وہ کچھ کم نہ تھا۔ اپنے انصاف کے درمیان جو خلا تھا۔ وہ اس سے بے خبر نہ تھی۔ چاند کی
دوری کے باوجود بچہ اسے ہلکے ہلکے کر پکڑنے کی خواہش کرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی خواہش ناہید کے دل میں بھی چل
رہی تھی۔ دونوں ایک ہی دھارے پر بہتے ہوئے ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ اس علم کے باوجود وہ ان کی
قربت کی خواہش ہر وقت بڑی تندی سے محسوس کرتی تھی۔ اور آج وودن سے اس نے منصور کو نہیں دیکھا تھا۔
اسے اپنی زندگی اک لقا ووق صحرای طرح نظر آرہی تھی۔ جس میں گولے ہی گولے اٹھ رہے ہوں۔

منصور مصروفیتوں میں کچھ اس طرح الجھے تھے۔ کہ باوجود شدت سے چاہنے کے دفتر جانے کے لئے
وقت نہ نکال سکے۔ لیکن آج تو ہر مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر وہ دفتر جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ مہر و ضبط کی
تمام توتیں بے کاری معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ زیر لب گنگنا تے ہوئے آئے ابھی برآمدے کی لمبی سیڑھیاں ہی اتر
رہے تھے۔ سرخ بگری والی سڑک پر گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے انہیں متوجہ کر لیا۔

”ہلو منصور“ شمرہ گھوڑے سے چھلانگ لگاتے ہوئے بولی۔ سفید بلاؤ اور خاکی بر جس نمائندوں میں اس
کا جسم کچھ اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ منصور جلدی سے زینے کو طے کرتے ہوئے اس کے قریب آگئے۔

”خیریت“ وہ مسکرائے۔

”شکر ہے آپ بیس مل گئے۔ ورنہ جانے جناب کی تلاش میں قصر عثمانی بھول بیلیوں میں کتنا وقت

ضائع ہو جاتا۔“ وہ گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑی تھی۔

”چلے۔“ اس نے منصور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہاں“

”رائڈنگ کے لئے“

”اس وقت۔“

”موسم خوشگوار ہو تو وقت کا تعین کچھ معنی نہیں رکھتا۔ سمجھے آپ۔“ وہ ناصحانہ انداز سے بولی۔

قصر عثمانی کو عروس نوکی طرح آراستہ کیا جا رہا تھا۔ منصور کی ستائیسویں سالگرہ قریب آرہی تھی۔ جشن کی
تیاریاں وسیع پیمانے پر ہو رہی تھیں۔ ماہر سنگ تراش مرمرین مجسموں کے حسن کو آہنی اوزاروں سے نکھارنے کی
کوشش کر رہے تھے۔ چابک دست مالی چمنوں کو نئی وضع سے سجانے میں مصروف تھے۔ ہوشیار رنگ سازانوں کی
طرز سے دروازوں اور کھڑکیوں کی کینچلیاں بدلنے میں لگے ہوئے تھے۔ محل کا منتظم ناظم الدین مع اپنے عملہ کے
بڑی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ قریباً اٹھارہ سال سے اس محل کے منتظم کی حیثیت سے اپنا کام نبھالے ہوئے تھا۔
اور ان اٹھارہ طویل سالوں میں کئی جشن بڑے تزک و احتشام سے اس کے ہاتھوں انجام پائے تھے۔ لیکن اس دفعہ
تو اسے منصور کی خاص ہدایات ملی تھیں۔ اس لئے کام کچھ بڑھ گیا تھا۔

جشن ہال کے سامان کی ترتیب۔ صوفوں اور پردوں کے رنگوں کی مناسبت قالینوں کا پٹاؤ۔ آرائشی کے
سارے سامان منصور کی مرضی کے مطابق کئے جا رہے تھے۔ روشنی کا پورا پورا انتظام تھا۔ ہال کے ایک کونے میں
موسیقی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے دیسی اور ولایتی ساز رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چھوٹی سی سیٹج بنائی گئی
تھی۔ جس کے پس پردہ سمندری لہروں کی طرح روشنی جھللاتی تھی۔ یہاں میڈم صوفیہ کے رقص کا مظاہرہ ہوتا
تھا۔

منتقش چھت اور لمبے لمبے روپلی ستونوں والا جشن ہال اپنی انوکھی سچ دھج سے اک دوشیزہ کے خواب
حسن کی تعبیر نظر آرہا تھا۔ منصور دن میں کئی بار آکر اسے مختلف نادیوں سے دیکھتے۔ اور آرائش و زیبائش کے کئی
نئے نقطے ناظم الدین کو سمجھاتے۔ وہ اس آرائشی سے ابھی تک مطمئن نہیں تھے۔ سارے محل میں اک ہلچل مچی
ہوئی تھی۔ زندگی کروٹ لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ یا کہیں اپنے لمبے چوڑے خاندان سمیت پہنچ گئی تھیں۔ کل
رات نواب ذوالفقار علی خان کی آمد سے تو سرگرمیاں اور جاندار ہو گئی تھیں۔ اک شور تھا۔ ہنگامہ تھا۔ سب ہی
مسرور تھے۔ زمانے بھر کی باتیں تھیں۔ اور محل کے یہ افراد..... ذوالفقار علی خان کی محکمہ خیز باتوں پر ہنستے ہنستے

”لیکن.....

”لیکن ویکن کچھ نہیں سنوں گی۔ چلنا ہے تو چلے۔ نہیں تو صاف کہہ دیجئے..... آپ کی کچھ عادت ہی بنتی جا رہی ہے۔ ہر بات میں آپ پس و پیش کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی تو چپ چاپ بات مان لیا کریں۔“ شمسہ موسم کی رنگین سے متاثر ہو کر انہیں لینے آئی تھی۔ منصور کی جیل و محبت سے وہ کچھ انفرادی ہو گئی۔ منصور دفتر جانے کے لئے بے تاب تھے۔ شمسہ کی بدوقت آمد سے انہیں اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ شمسہ اس تذبذب سے برہم سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں غصے سے آنسو آ گئے۔ وہ واپس جانے کا ارادہ کرتے ہوئے گھوڑے کو زینے کے قریب لے آئی..... ازراہ اخلاق منصور کو اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

”آپ بڑی جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔“ منصور مسکراتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ ”مجھے برا ضروری کام تھا۔ خیر۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ لیکن زیادہ دیر کے لئے نہیں۔“ شمسہ ہنس پڑی۔ اور منصور لباس تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے۔

رات بدل چکی تھی۔ سردیوں کی کپکپی دور ہو چکی تھی۔ بہاریں جنم لے رہی تھیں..... آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے روٹی کے گالوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اور سورج کی چمکی کرنیں ان گالوں پر رقص کناں تھیں۔ ہلکی ہلکی غم آلود ہوا چل رہی تھی۔ فضا مسطر تھی۔ منصور رائیڈنگ کے خالی لباس میں ملبوس باہر آ گئے..... ان کا ملازم سفید گھوڑا لے کر آیا۔ سارا دے کر انہوں نے شمسہ کو سوار کرایا۔ اور پھر خود بیٹھ گئے.....

ناہید کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اپنی ابھی ہوئی سوچوں کو سلجھا رہی تھی۔ وہ اس وقت بڑی شدت سے منصور کی قربت کی تمنا محسوس کر رہی تھی۔ ان سے باتیں کرنے کی تندہ خواہش اپنے دل میں پار رہی تھی۔ اف..... یہ تندہ تیز خواہش..... انسانی زندگی کے ساتھ چٹنی ہوئی جو نکلیں۔ جو گندہ خون چوس لینے کے ساتھ ساتھ صاف خون بھی پی جاتی ہیں۔

شمسہ اور منصور کے ملے جلے قسموں نے ناہید کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ نہ جانے وہ دونوں کس بات پر تکی کھول کر بیٹھے تھے۔ ناہید نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دور قعر عتاقی اندرونی سڑک پر شمسہ و منصور گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی سے پیچھے پوٹ ہٹ گئی۔ جیسے کسی بھٹکارتے ہوئے ناگ نے اپنی پتلی اور لمبی زبان اس کے ہاتھوں پر پھیر دی ہو۔ لمحہ بھر وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ سوچنے کی ساری قوتیں منتشر ہو گئیں..... وہ لپک کر پھر کھڑکی کے قریب آئی جیسے اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس پر یقین نہ آیا تھا..... تیزی سے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں کانوں سے یوں ٹکرا رہی تھیں۔ جیسے مسلسل گولے

برس رہے ہوں۔ اور ان سے اٹھنے والی زہریلی گیس سے کمرہ بھر گیا ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر گر گئی۔ اس کے ذہن میں آگ سی لگ اٹھی۔ اور اس کا کڑوا سیلا دھواں اس کے شعور پر چھانے لگا۔ شمسہ کو اس نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ جس کے بارے میں شیریں نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔ پچھلے اتوار کی شام کو وہ شیریں کے ساتھ کپڑا خریدنے گئی تھی۔ وہاں شمسہ کو دیکھا تھا۔ اور پھر راستے میں شیریں نے اس کی ساری ہسٹری بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے گوش گزار کی تھی۔

”لوگوں کا خیال ہے نواب منصور اور شمسہ مستقبل قریب میں ایک رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔“ شیریں کی اس بات پر ناہید کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ لیکن دوپہر کو منصور کے ساتھ موٹر میں آتے ہوئے جو باتیں ہوئی تھیں۔ ان کا تاثر ابھی تک تھا۔ اسی لئے ناہید شیریں کی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے طنز پر ہنس پڑی تھی۔ آج وہی شمسہ منصور کے پہلو پہ پہلو جا رہی تھی۔ ہنسی ہوئی مسکراتی ہوئی۔ شیریں کے الفاظ پچھلے ہوئے پیسے کی طرح کانوں میں اتر رہے تھے۔

”مستقبل قریب میں دونوں ایک رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔“

شیریں سچ ہی کہتی تھی۔ ناہید کا جلتا ہوا دماغ سوچ رہا تھا۔ منصور کی اس دن والی باتیں۔ اشاروں اور کنایوں میں افشا کئے ہوئے راز۔ ناہید ان کی صداقت پر ایمان لایا تھا۔ آج یہ ایمان متزلزل ہو گیا۔ اسے ان باتوں کے پس پردہ قریب نظر آیا۔ سب کچھ ایک دھنواں کا کھیل تھا۔ امارت کا غرور سے مملک مذاق تھا۔ فائدہ زدہ آتما کو دور سے روٹی کا ٹکڑا دکھا کر اس کی ترب سے محظوظ ہونے کی ترکیب تھی..... وہ بڑی دیر تک بے حس و حرکت کر سی پر پڑی رہی۔ اس کا رنگ اوڑھے ہوئے دوپٹے کی طرح زرد تھا۔ طفیلیاں دریا کی پرسکون گود سے اٹھتی ہیں۔ اور پھر مہیب سی تباہی پھیلا کر اسی کی آغوش میں سو جاتی ہیں۔ منصور اور شمسہ کو اٹھنے دیکھ کر ناہید کے دل میں بھی اک طوفان اٹھا تھا۔ اور اس کی امیدوں کی ساری مشعلیں گل کر کے ختم ہو گیا تھا۔ اب اندھیرے میں وہ بھٹک رہی تھی۔ سر ٹکرا رہی تھی۔ کوئی راستہ بھٹائی نہ دیتا تھا۔ ”آخر تیری حیثیت ہی کیا ہے۔ شمسہ منصور کی ہم پلہ ہے اور تو آواک طوائف کی اولاد۔“ یہ خیال چبھتا ہوا اس کے دماغ میں آیا۔ اور اس کی رہی سہی امیدوں کا بھی خون کر گیا۔ طوائف! اس لفظ کے ساتھ ہی اسے سازوں کی جھنجھاہٹ میں گھٹکھڑوٹوں کی جھنجھار سنائی دینے لگی۔

طوائف! سوسائٹی کا ایک گندہ عنصر..... ایک کوڑھ زدہ حصہ۔ اس کے خیالات میں تلاطم مچا تھا۔ اسے فیروز کا وہ جملہ یاد آ گیا۔

”تو ایک رنڈی کی لڑکی ہے۔ رنڈی کا لفظ تمہاری پیشانی سے کوڑھ کے داغ کی طرح کبھی نہیں مٹ

سکتا۔

تک صبح والے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ گود میں گر گیا تھا۔ اور بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔
”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔“ شیریں نے حیران ہو کر اسے گھورا۔

”اوہو“ ناہید سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”کیا انداز ہیں آج۔“

شیریں اپنی تعریف پر خوش ہوئے بغیر رہ نہ سکی۔ بیک کو ہلاتے ہوئے بولی۔

”میں کہتی ہوں کب تیار ہوگی تم سات بج چکے ہیں۔ ساڑھے سات پہنچنا ہے وہاں۔ بیگم حق بھی تیار ہو چکیں۔“

ناہید ابھی تک شیریں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کا رنگ اس کے چہرے پر بڑا اٹھ رہا تھا۔ دوپٹے کی سنہری کرن بھی بڑی خوب صورت تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔ اٹھو بھی۔“ شیریں نے اسے جھنجھوڑا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیا کہا۔“ شیریں نے جیسے اس کی آواز نہ سنی ہو۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ اسی طرح بولی۔

”کیوں نہیں جاؤ گی۔“

”میری مرضی۔“

”یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ شیریں کو غصہ آگیا۔ ”اٹھو۔ میں تمہارے کپڑے نکالتی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو لو۔“

”نہیں شیریں۔ میں نے کہہ دیا نہیں جاؤں گی۔“ وہ بڑی ملانمت سے بولی۔

وہ جانے کیا فیصلہ کر چکی تھی۔ جشن بورد راجے کا اجتماع تھا۔ سرمائے کا مظاہرہ تھا۔ گھریلو اعزاز سے روشن پیشانیوں۔ نسلی نقارے تھی ہوئی گردنیں۔ خاندانی وقار سے اٹھنے ہوئے سراسر کی نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اسے اپنے خاندان کی ذلت کا احساس تھا۔ اپنی کم مائیگی سے آگاہی تھی۔ اور یہ احساس یہ آگاہی شمسہ اور منصور کو اس دن اکٹھا دیکھنے کے بعد بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

”شمسہ کے ہوتے ہوئے اس کی وہاں ضرورت بھی کیا تھی۔“ اس خیال نے اس کے جشن کی شرکت کے ارادے کو کمزور کر دیا تھا۔ شمسہ کا خیال اذیت ناک حد تک دماغ میں کچو کے لگا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”واقعی نہیں جاؤں گی۔“ شیریں نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

ناہید کے خیالات میں پھر اک طوفان اٹھا۔ اک رینیلی آندھی چلنے لگی۔ اس کے دماغ کو جھٹکے لگے۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”منصور تجھ سے بہت دور ہیں ناہید۔ تو یہ بعد کبھی نہیں مٹا سکتی۔۔۔۔۔ وہ تیری دسترس سے بہت بلند ہیں۔ تو انہیں دیکھ ضرور سکتی ہے۔ پائیں سکتی۔ وہ جتنی بلندی پر ہیں تو اتنی ہی پستیوں میں گری ہے۔ تیری ماں طوائف تھی۔ اور منصور ایک عالی خاندان کے چشم چراغ ہیں۔ یہ دوریاں ہیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گی۔“ اس کا ضمیر سلگ رہا تھا۔

اور جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کے سوختہ دماغ میں ایک ہی بات رہ گئی تھی۔ منصور اس سے بہت دور ہیں۔ اس کے پر کاٹ لئے گئے ہیں۔ اس لئے ان بلندیوں پر پہنچنے کا خیال ہی فضول ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل دکھ رہا تھا۔ سینے میں اک آگ لگی ہوئی تھی۔ اس سے دفتر میں بیٹھنا دو بھر ہو گیا۔ اور جب منصور آئے بڑی تڑپ سے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ تو وہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ اعجاز نے انہیں بتایا۔ کہ ناہید گھر چلی گئی ہیں۔

دوسرے دن جب وہ دفتر آئی۔ تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگ گئی۔ انتظار اسے آج بھی تھا۔ لیکن اپنی بے قرار یوں کا اس نے گلا گھونٹ دیا تھا۔ منصور آئے۔ کام دیکھنے کی بجائے اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑے شائستہ الفاظ میں اپنی غیر حاضری کی معذرت کی۔ ناہید کاغذوں پر جھکی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ ان کی باتیں جن سے خلوص ٹپک رہا تھا۔ تصنع آمیز ہیں یا سچی حقیقتیں۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔ خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔

شیریں بڑے تکلف سے تیار ہو رہی تھی۔ نئے سیاہی مال زرد کپڑے پہنے وہ پاؤں میں آج ہی بازار سے لائی ہوئی نفیس سینڈل پہن رہی تھی۔ سینڈل پہن کر وہ ٹیسنے کے انداز سے کمرے میں چند قدم اٹھاتے ہوئے سنگار میز کے قریب آگئی آئینے میں اپنے سانولے سلونے چہرے کا جائزہ لیا۔ بالوں کا انداز کچھ پسند نہ آیا۔ بالوں کے پن منہ میں پکڑے وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو نئے ڈھنگ سے سنوارنے لگی۔ اس کے انداز سے گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ اتنے بڑے اجتماع میں جانے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ قصر عثمانیہ وہ جشن میں شرکت کے لئے ایک مسمان کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ یہ کچھ کم اعزاز نہ تھا۔

آئینے پر آخری نظر ڈالتے ہوئے اس نے دوپٹے کی سنہری کرن کا چہرے کے گرد حلقہ بنایا۔ اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھا۔ اور پھر مطمئن ہو کر کالاجرمی بٹوا اٹھا۔ اور بڑے محتاط قدم رکھتی ہوئی ناہید کے کمرے میں آگئی۔

ناہید کرسی پر بیٹھی جتنی کے گرد منڈلانے والے بے وقوف پروانوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی

شیریں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

قصر عمارتی روشنی سے جھلکارہی تھی۔ باغ کے ہر درخت پر بجلی کے قلعے اندھروں کو پاٹ رہے تھے۔ سبز سبز درختوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیاں سرخ، بھری والی سڑک پر لرز رہی تھیں۔ رات دن سے بھی زیادہ روشن تھی۔ لمبی لمبی رنگ برنگی پچیلی موٹریں بڑے پھانک سے داخل ہو کر چند لمحوں پورٹیکو میں رک گئیں۔ مہمان اک شان ہے اترتے اور خالی موٹریں آگے بڑھ جاتیں۔ دوسرے پھانک سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتیں۔ وقت گزر رہا تھا۔ اور سڑک پر کھڑی ہونے والی لمبی قطاریں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ منصور سیاہ اچکن پہنے جشن ہال کے بڑے دروازے کے قریب کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اک شہانہ وقار تھا۔ اور اچکن ان کے مردانہ حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ ان کے پہلو میں یاسمین کھڑی تھی۔ سفید ستاروں والے جھلملاتے لباس اور ہیروں کے خوب صورت سفید زیورات وہ ہنس ہنس کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ ذوالفقار علی خان اندر مہمانوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ مہمان آ رہے تھے۔ ہنگامہ بڑھ رہا تھا۔ قہقہے ٹکرا رہے تھے۔ ہنسیاں الجھ رہی تھیں۔ لہراتے ہوئے رنگ برنگے ریشمی اچھل۔ شانوں سے ڈھلکتی ہوئی زرتار ساڑھیاں پیروں سے الجھتے ہوئے پچیلے غراے ماحول کو رنگین بنا رہے تھے۔

مردوں کے قیمتی ملبوسات کی ہمرسراہٹیں مریض اور طلائی زیورات کی کھنک میں مدغم ہو رہی تھیں۔ آرکسٹر اک ہلکی دھنیں فضا میں اک مترنم شور بکھیر رہی تھیں۔ ایک لطیف سار تعاش پیدا کر رہی تھیں۔ مہمان آ رہے تھے۔ منصور کی بے قرار نظریں بار بار برآمدے کی سیڑھیوں سے ابھرتے ہوئے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ نگاہیں جس ہوش ربانکی منتظر تھیں۔ نظریں جس رہزن دین و ایمان کی مٹلاشی تھیں وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔

شیریں اور بیگم حق کے آنے کے بعد تو اس کے آنے کا امکان ہی نہ رہا اپنی پریشانی کو مسکراہٹ میں چھپائے وہ مہمانوں سے باتیں کئے جا رہے تھے۔

”منصور“ بیگم حشیدان کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ”یہ جشن اب پرانے ہوئے جا رہے ہیں۔ اب تو تمہاری شادی کا جشن ہونا چاہئے۔“

”انشاء اللہ اسی سال آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔“ یاسمین پچھلی کے کباب پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولیں۔ ”کیوں منصور“

منصور بھیجی سی ہنسی ہنس دیئے۔

”واقعی؟“ مقبول حسین لقمہ نگلتے ہوئے منصور کی طرف مڑ گئے۔

”ارے بھئی مگلی مگلی ہو گئی ہمیں یہ بی نہ چلا۔“ زاہد احمد نے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے یاسمین سے

پوچھا۔

معنی تو نہیں ہوئی ابھی۔ ”یاسمین بولیں۔“ ہم لمبی مگلیوں کے قائل بھی نہیں۔ سب کچھ اکٹھا ہی ہوگا۔ ”مقبول حسین ہنستے ہوئے بولے۔ ”اب تو ہو ہی جانی چاہئے ان کی شادی۔ اکیلے اکیلے کچھ اچھے نہیں لگتے۔“

منصور کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ واقعی اکیلے ہیں۔ اس بھری مغل میں..... اس بھری دنیا میں۔ اک سسکتی ہوئی آہ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ اور اپنی اضطرابی کیفیت کو چھپانے کے لئے وہ دوسرے مہمانوں کی طرف گھوم گئے۔

میڈم صوفیہ نے رقص کا بہترین مظاہرہ کیا۔ لوگوں کی فرمائش پر وہ کئی بار ناچ چکی تھی۔ موسم بہار کا رقص اس نے پیش کیا تھا۔ گداز جسم کی پلک مرمیس بانوں کی حرکت اور بجلیاں گراتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر حاضرین کو نشہ سا آنے لگا تھا۔

رقص کے بعد کئی لوگوں نے گانا بنایا۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر منصور نے بھی ایک غزل سنائی۔ ستار ان کا محبوب ساز تھا۔ ان کے گلے کا سوز کچھ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اور فضا پر اک سوگوار سی خاموش طاری ہو گئی۔ گانا ختم ہو گیا۔ ماحول کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ لیکن شمسہ اور ذوالفقار علی خان کی مزاحیہ باتوں سے فضا جلد ہی ہموار ہو گئی۔ وہی قہقہے بکھرنے لگے۔ وہی ہنسیاں الجھنے لگیں۔

جشن بڑا کامیاب رہا۔

مہمان جا چکے تھے۔ ہنگامے سو گئے تھے۔ قصر رعنا کے مکین کچھ تھکان اور کچھ زیادہ دیر جاننے کی وجہ سے نیند کی آغوش میں خراٹے بھر رہے تھے۔ ایک منصور تھے جو اس دفترا ت گذر جانے کے باوجود تنہا باغ کی اونگھتی ہوئی فضا میں روشوں پر بے قرار سی سے ٹھل رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ ان کے بال الجھ کر پشانی پر آگئے تھے۔ اور سگریٹ پر سگریٹ چھونک رہے تھے۔ ان کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخری تار پتوں کا بیار چاند بوڑھی رات کی جھولی میں پڑا سسک رہا تھا۔ سنگ مرمی کی ناچ پر بیٹھے منصور اس بیمار چاند کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ”وہ کیوں نہیں آئیں؟“ یہ سوال بار بار ان کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کے بغیر آج کا جشن بے معنی سا معلوم ہو رہا تھا۔ اک فضل سا اجتماع۔ اک خواہ مخواہ کی در دوسری۔ وہ انڈھ کر ٹھٹھنے لگے۔ کسی پل چین نہ آ رہا تھا۔ دل کا درد تھا۔ کہ بڑھتی جا رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے نہادین کی زندگی کا سب سے لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر زندگی زندگی نہیں۔ وہ خاموشی سے اپنے



بہار کی ایک رنگین و حسین شام تھی۔ ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا چل رہی تھا۔ غنچے مسکرا رہے تھے۔ کلیاں چمک رہی تھیں۔ چمن کورنگ پھولوں نے بوٹھوں بنا رکھا تھا ہری ہری گھاس بڑی خوب صورتی سے ترشی ہوئی تھی۔ اونچے اونچے گھنے درختوں کے سایوں تلے آرام دہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر چائے کے برتن اور کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ بیرے بڑی احتیاط سے خالی برتن اٹھا رہے تھے۔

ذوالفقار آرام کرسی پر تقریباً لیٹے ہوئے سگار پل رہے تھے۔ ان کی نظریں سگار کے دھوئیں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ قریب ہی چھوٹی سی میز پر جھکی ہوئی یاسمین بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پڑے ہوئے جڑاؤ ننگنوں کو پونہی گھمائے جا رہی تھی۔ ان سے ذرا ہپ کر چمن کی مٹیلیں فرش پر منصور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھے۔ سمیرا اور فریدوں سے گیند لے کر وہ ہوا میں اچھال دیتے۔ بچے گیند کو اچھالتے لیکن ان کی زد میں آنے سے پہلے ہی گیند منصور کے ہاتھ میں آ جاتی۔ بچے شور مچاتے۔ اور منصور اس شور سے محظوظ ہوتے ہوئے گیند دور پھینک دیتے۔ بچے بڑی تیزی سے بھاگتے۔ سمیرا اور فریدوں کی لڑائی ہوتی۔ اور گیند پھر منصور کے ہاتھ میں آ جاتی۔ کافی دیر سے وہ بچوں کے ساتھ اس مشغل میں مشغول تھے اس بھاگ دوڑ میں انہیں پسینہ آ گیا تھا۔ اپنی سفید قمیض کے کٹھن شدہ کالر کھولتے ہوئے انہوں نے گیند پھر ہوا میں اچھال دی۔ اس دفعہ انہوں نے گیند پکڑی نہیں۔ اور وہ اتفاق سے فریدوں کے ہاتھ آ گئی فریدوں خوشی سے ناچتے ہوئے گیند منصور کے پاس لے آیا۔

”بس بھئی..... اب کھیل ختم۔“ منصور نے بچوں سے کہا۔ ”شام ہو رہی ہے۔“

”ابھی کہاں ناموں حضور۔“ سمیرا بولی۔ ”دیکھئے نا ابھی تو سورج چمک رہا ہے۔“

سورج اپنے سفر کے آخری مراحل طے کرتے ہوئے پہاڑوں کے پیچھے سے الوداعی نظریں ڈال رہا تھا۔

جذبات کا تجربہ کر رہے تھے۔ ناہیدان کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی۔ ان کے دل میں دھڑکن بن کر سنائی ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے دل کی تمام قوتوں سے چاہتے تھے۔ اپنی روح کی گہرائیوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں اپنے عشق کا پوری شدت سے احساس ہونے لگا۔

مرغ سحری نے اذان دی۔ انہوں نے گھڑی دیکھی چار بجتے والے تھے۔ فضا کی خشکی بڑھ گئی تھی۔ ان کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیے۔

لباس تبدیل کرانے کی غرض سے آیا ہوا جانی قالین پر پڑا سو رہا تھا۔ منصور نے اسے بیدار نہ کیا۔ ڈریسنگ روم میں جا کر لباس شب خوابی پہنا۔ اور مسری پر گر گئے۔



”منصور“ زلفی نے آواز دی۔

کھیل ٹرگ گیا۔ بچے چپ ہو گئے۔ منصور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے زلفی بچا کے قریب آگئے۔ اپنے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتے ہوئے بولے۔

”آپ نے بلا زلفی بچا۔“

”یہ یاسمین تم سے کچھ کہنے والی ہیں۔“ انہوں نے شرارت سے کہا۔ منصور حیران سے کبھی انہیں اور کبھی یاسمین کو دیکھنے لگے۔ جو خاموش بیٹھی تھیں۔

”کیا بات ہے باجی۔“ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بچے ہاتھوں میں گیند لئے منصور کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

”بھگوا بچو! آئی ہو بلارہی ہیں۔“ بچے فوراً بھاگ گئے۔ منصور اب تک یاسمین کی سنجیدگی سے کوئی مطلب نہ اخذ کر سکے تھے۔ انہیں الجھن سی ہونے لگی۔

”باجی فرمائے نا کیا بات ہے۔“ وہ رومال سے اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے بولے۔

”بھی بات تو پرانی ہے۔ یاسمین آج اسے نئے ڈھنگ سے کرنا چاہتی ہیں۔“ زلفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ منصور کچھ نہ سمجھے۔ یاسمین کو ہنسی آگئی۔

”دیکھ کیا رہے ہو۔“ زلفی منصور کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”آج یاسمین کے تیرے بڑے خطرناک ہیں۔ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ منصور حیرانگی سے بولے۔

”سمجھ جاؤ گے بھی بیٹھو تو سہی۔“ منصور بیٹھ گئے۔

”یاسمین تمہاری شادی کے فرض سے بکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ یوں سمجھ لو۔ دو چار دن کے اندر اندر یہ بوجھ سر سے اتار دیں گی۔“ زلفی مسکراتے ہوئے بولے۔

”آپ کو میرا یہی فکر کیوں رہتا ہے باجی۔“ منصور ہنستے ہوئے ہنسنے لگے۔ ”کبھی ان کا بھی خیال کیا کیجئے۔ مجھ سے بڑے ابھی بیٹھے ہیں۔“

زلفی منصور کی بات پر چھل پڑے۔ وہ چالیس کے لگ بھگ تھے لیکن ابھی تک ان ازدواجی بکھیروں سے آزاد تھے۔

”ارے بھی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ہمارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔“

زلفی کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

”زلفی بچا بات تو منصور نے حق کی کہی ہے۔“ یاسمین چمکیں۔

اونچے اونچے درختوں پر کمزور کمزور کرنیں ٹھہر رہی تھیں۔

”ایک دفعہ اور“ فریدوں کی لجاجت پر منصور کو ہنسی آگئی۔ اس کے سرخ سرخ گالوں پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے گیند پھر اچھال دی کھیل پھر شروع ہو گیا۔

یاسمین دور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی اہم بات سوچ رہی ہیں آج ہائی سکول میں ان کے زیر صدارت جلسے تقسیم انعامات ہوا تھا۔ شیریں نے ناہید کو ان سے ملایا تھا وہ اس کے حسن بلا تک فریب۔ اس کے سلیقہ گفت گو۔ اس کے وقار آمیز نشست و برخاست اور اس کے ٹھہرے ہوئے خیالات سے بڑی متاثر ہوئی تھیں۔ اور آتے وقت جب اس نے قدرے جھک کر بڑی تعظیم سے ان کے ساتھ مصافحہ کیا تھا تو وہ بڑی دیر تک اس کے نرم و گداز ہاتھ کو ہاتھ میں لئے دیکھتی رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کی صحبت بڑا گراں نقش چھوڑ گئی تھی۔ وہ اب بھی اس کی متعلق سوچ رہی تھیں تصور میں ان گہری گہری حین آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جن میں شرم و حیا کی پرچھائیاں اتنی واضح تھیں کہ یاسمین کا دل فرط عقیدت سے انہیں چوم لینے کو چاہا۔ اس وقت بھی اس کے متعلق سوچتے ہوئے وہ خیالوں کے تانبے باندھے ریشمی ریشمی ڈوریاں نکال رہی تھیں۔ ریشمی ڈوریاں جن سے منصور اور ناہید کو باندھا جاسکے لیکن منصور کی عادت سے واقف ہوتے ہوئے ابھی تک یہ ذکر نہ چھیڑ سکی تھیں شادی کا ذکر۔ انہوں نے جب بھی چھیڑا تھا منصور بڑی شائستگی سے ٹال گئے تھے۔ بڑی خوب صورتی سے پہلو بچا گئے تھے۔

یاسمین نے میز پر ہلکا سا مارا۔ جیسے وہ کسی اٹل فیصلے پر پہنچ گئی ہوں۔ پھر بڑے اطمینان سے کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ مہین آسانی رنگ کے دوپٹے پر ٹکی ہوئی سنہری سلیمے کی تیل کو اپنے ہاتھوں سے سیدھا کرنے لگیں۔

”کیا بات ہے یاسمین۔“ زلفی بچانے سگار منہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات سوچ رہی ہو۔“ وہ کچھ دیر سے سگار کے دھوئیں کی آڑ سے یاسمین کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یاسمین نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیں۔

”کیا بات ہے بھی۔“ زلفی نے ہاتھ کو ہوا میں ہلاتے ہوئے پھر پوچھا۔

”کوئی خاص بات تو نہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ”انہیں دیکھ رہی ہوں۔“

”کب تک یونی بچوں سے کھیلتے رہیں گے۔“ منصور ابھی تک کھیل میں مشغول تھے۔ زلفی نے بڑے پیار سے منصور کو دیکھا۔

”ستائیس سال کے ہو گئے ابھی تک شادی کے نام سے کھڑاتے ہیں۔ اس دفعہ تو میں ان کا کوئی معقول بندوبست کر کے ہی جاؤں گی۔“ وہ بڑے جوش سے بولیں۔

”دیکھو بیٹا۔“ زلفی چہرے کو جبراً سنجیدہ بناتے ہوئے بولے۔ ”بزرگوں سے مذاق نہیں کیا کرتے۔“

”اور سنئے۔ منصور جھپٹتے ہوئے بولے۔“ اب آپ بزرگوں کی قطار میں شامل ہو گئے۔“

”ارے بھئی ہماری چھوڑا اپنی پٹناؤ۔“ زلفی بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ان کی عمر اس وقت کئی سال زیادہ

لگ رہی تھی۔ ماتھے پر ہلکی ہلکی شکنیں ابھر آئیں۔ وہ کچھ مایوسانہ انداز میں پھر بولے۔

”ہاں تو یا سمین کیا کہنا تھا منصور سے۔“

منصور جانے کے ارادے سے اٹھے۔

”بیٹھو تو یا سمین دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولیں.....“ میری بات کا جواب تو دو۔“

”کس بات کا۔“

شادی کے متعلق کیا سوچا ہے۔“

”شادی ضرور کروں گا لیکن.....“ وہ رک گئے۔ اور یا سمین کو جیسے زندگی میں پہلی بار خوشی میسر

آئی۔

”لیکن کیا“ وہ جوش مسرت کو دہاتے ہوئے بولیں۔ آج منصور نے پہلی بار اقرار کیا تھا۔ اقرار۔ شادی

کا اقرار..... اور وہ بھی بغیر حیل و حجت کے۔

”اپنی پسند کی کروں گا شادی۔“ وہ پہاڑوں کے پیچھے غروب ہونے والے سورج کو دیکھتے ہوئے بولا۔ پسند

کے ساتھ یا سمین کی نظروں میں شمسہ کا چہرہ گھوم گیا۔ جو خوب صورت بھی تھی۔ سوسائٹی کی روح رواں بھی تھی۔

اور ایک سرمایہ دار باپ کی اکلوتی بیٹی بھی۔ اس کے باوجود بے باک طبیعت کی وجہ سے یا سمین کو قطعاً پسند نہ

تھی۔

”شمسہ“ یا سمین نے یوں کہا۔ جیسے منصور کے دل کی پہلی بوجھی ہو۔ منصور نے جلدی سے ان کی طرف

دیکھا۔

”بابی“ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یا سمین نے ان کے بلند ذوق کا مذاق اڑا دیا ہو۔ ”شمسہ کو میں

صرف ایک دوست کی حیثیت دے سکتا ہوں۔“

”تو پھر“ یا سمین کریدنے لگیں۔

منصور کاٹی چاہا کہ اپنے تجلیل کے پردوں کو یا سمین کے سامنے پھیلا دیں۔ جن پر ناہید کاہر تو کھرا رہا تھا لیکن

ابھی تک کچھ کتنا قبل از وقت تھا۔ ناہید کی خاموش حرکتوں سے اس کی محبت کا اندازہ وہ کئی بار کر چکے تھے۔ لیکن

ابھی تک کھل کر اس معاملے پر بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی انہوں نے پوچھا تھا نہ ہی ناہید نے کچھ کہا تھا۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

زلفی بڑے غور سے منصور کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ یا سمین تذبذب کے عالم میں بار بار اپنے رومال کو

انگلی پر پلٹ رہی تھیں۔ منصور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”بات پھر وہیں رہ گئی۔“ یا سمین نے کہا۔

”دیکھئے بابی میں شادی ضرور کروں گا۔ لیکن ہو سکتا ہے میری شادی سے آپ کی خاندانی توقعات پوری نہ

ہو سکیں۔ پرانی روایات برقرار نہ رکھی جاسکیں.....“

انہوں نے بڑی وضاحت سے کہہ دیا۔

”کیا مطلب؟“ یا سمین بولیں۔

”شاید میں کسی ایسی لڑکی کو اپنا رفیق زندگی بنالوں۔ جسے آپ کے دولت مند طبقہ سے کوئی مناسبت نہ ہو۔“ وہ

بڑے اطمینان سے بولے۔ زلفی کے ماتھے کی شکنیں اور واضح ہو گئیں۔ منصور کی باتوں سے خاندانی رواہیتوں

سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ یا سمین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کے

ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ منصور کی باتوں پر انہیں غصہ آرہا تھا۔ زلفی کے سگار کے دھوئیں کے پردے میں سے

انہیں دیکھا۔ وہ اس وقت خاندانی آن کی ایسی محافظ سپاہی معلوم ہو رہی تھیں جس کی تلوار پر خون کی بوندیں جمی

ہوئی تھیں۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

”ہمارا خاندان صدیوں سے اک خاص عظمت کا حامل چلا آتا ہے منصور۔“ آخر یا سمین نے سکوت

توڑا۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”اس عظمت کی لاج تمہارے ہاتھ

میں ہے۔“

”میں پرانی قدروں کا قائل نہیں۔“ منصور بڑے اطمینان سے بولے۔ ”اگر میرا خاندانی وقار محض اس

لئے میرے راستے کی چٹان بن جائے کہ میں ایسی لڑکی کو شریک حیات بنانا پسند کروں جو صدیوں کے روندے

ہوئے سماج کے بنوائی اصولوں کے مطابق میری ہم پلہ نہیں۔ تو میں اس چٹان سے ٹکرانے کے لئے تیار ہوں۔“

منصور نے کچھ اس انداز میں یہ بات کہی کہ یا سمین حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ زلفی نے پھر کرسی

پر پہلو بدلا۔ منصور کو دیکھ کر انہیں نہ جانے کیا یاد آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر رنجیدہ سے ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا

جیسے صاف و شفاف مطلع پر تباہی و بربادی کی مہیب گھٹائیں چھا رہی ہوں۔

”چٹانوں سے ٹکرانے کا فائدہ“۔ انہوں نے پہلی بار دونوں بن بھائیوں کی بحث میں حصہ لیا۔ ”خود ہی

چٹان چور ہو جاؤ گے یہ دولت کی حدیں دیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ طبقاتی غلیظیں بڑی گہری ہیں منصور۔“

”میں یہ غلیظیں پاٹ سکتا ہوں۔“ منصور کے لمبے میں عزم تھا۔

”جھوٹے زلفی چچا۔“ وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے روہانسی سی ہو رہی تھیں۔

”نہیں، بھئی، ہم ایسے تو ڈاڑھی جانے دیں گے اپنی بیبا کو۔“ زلفی چچا جرات سے بولے۔ معاملہ الجھ گیا تھا۔ یاسمین کے یوں چلے جانے سے اور گرہیں پڑنے کی توقع تھی۔ اسی لئے زلفی نے انہیں روکا۔ اور میٹھی میٹھی باتوں سے منانے لگے۔ منصور بے قراری سے ٹٹل رہے تھے۔

”بھئی ہم نے مذاق کیا اور تم دونوں جچ لڑنے لگے۔ بری بات ہے یہ.....“ وہ مسکرائے۔

”لڑائی کیسی۔“ یاسمین رکھائی سے بولیں۔ اس وقت انہیں بڑا صدمہ پہنچا تھا ایک ہی ایک بھائی تھے جن کی شادی کا انہیں بڑا ارمان تھا۔ گوان کے خاندان کو کسی سارے کی ضرورت نہ تھی پھر بھی وہ منصور بھائی کی شادی کسی ایسے خاندان میں کرنا چاہتی تھیں جن سے ان کے عالی اور بڑے خاندان کا نام سر بلند ہو۔ منصور کی باتوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ کسی غریب یا اوسط درجے کی لڑکی کو منتخب کر چکے ہیں۔ یہ بات ان کے باوقار خاندان کی سراسر توہین تھی۔ ایسی توہین پرانی روایتوں کی قدر دان یاسمین کی برداشت سے باہر تھی۔

زلفی نے یاسمین کو پھر سے کرسی پر بٹھالیا۔

”ہم اپنی بیبا کو ناراض نہیں ہونے دیں گے۔ ہاں تو کس درنا یا ب کا ذکر کر رہی تھیں تم۔“

”کسی کا بھی نہیں۔“ وہ جل کر بولیں۔

”اوہو۔ معاملے کی بات کرو نا یاسمین۔ ہو سکتا ہے۔ تمہاری پرکھ ہی غلط ہو۔ چمکتے ہوئے موتی کو تم ہیرا بنا

دو تمہارا کیا ہے۔“ زلفی مذاق کرنے لگے۔

”ہیرے کو پرکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی آب و تاب سے ہی پہچانا جاتا ہے۔“ یاسمین بڑے وثوق

سے بولیں۔

”نہیں بھئی۔“ زلفی بولے۔ ”انسان دھوکہ بھی کھا جاتا ہے۔ وہ درنا یا ب ہمیں بھی دکھاؤ۔ ہم دیکھ کر

کوئی فیصلہ کریں گے۔ کیوں منصور۔“

منصور بڑی خاموشی سے پاؤں سے مسلی ہوئی گھاس کو دیکھ رہے تھے۔ جس ہیرے نے ان کی راہوں کو منور کر رکھا تھا۔ اس سے بڑھ کر کون سا ہیرا آب و دار ہو سکتا تھا وہ چپ رہے اور ان کی خاموشی کو یاسمین نے ناراضماندی پر محمول کیا۔

یاسمین کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ اور وہ جانے کے ارادے سے اٹھیں۔ زلفی بھی اٹھ کر کھڑے

ہو گئے۔

”ہاں کہہ بھی دو منصور۔ ان کا انتخاب بھی دیکھ لو۔“ زلفی نے آنکھ کے اشارے سے منصور کو یاسمین کی

طرف متوجہ کیا جو آنکھوں میں امنڈے ہوئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

زلفی نے غور سے منصور کے چہرے کو دیکھا۔ انہیں ان پر ترس آگیا۔

”تم ابھی انجان ہو منصور۔“ زلفی نے سمجھانا چاہا۔ ”بڑی گہری کھائیاں ہیں۔ یہ انسان کی مسرتوں کو ہڑپ کر جانے کے لئے منہ کھولے بیٹھی ہیں۔ انہیں عبور کرنے کے خیال سے انسان اٹھتا ہے لیکن اوندھے منہ گر جاتا ہے۔“

”زلفی چچا“ منصور بڑے تحمل سے بولے۔ ”ہو سکتا ہے۔ یہ کھائیاں اس وقت خطرناک ہوں۔ جس وقت انسان کی محدود عقل نے انہیں عبور کرنے کا طریقہ نہ سوچا ہو۔ آج کا انسان خلاؤں میں پرواز کرنے کی سوچ رہا ہے۔ بلندیوں پر اڑ رہا ہے۔ یہ کھائیاں یہ خلیجیں تو میرے خیال میں حیرت سے منہ کھولے انسانی ارتقاء کو دیکھ رہی ہیں۔ انسان جو عقل کی روشنی میں ان کی دسترس سے کہیں زیادہ بلند ہو چکا ہے۔“

”بہت خوب“ زلفی بے ساختہ کہہ اٹھے۔ ”واقعی منصور تم چٹانوں سے ٹکرا سکتے ہو۔“ یاسمین چڑسی لگیں۔ منصور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھے رہے۔

”اپنے طبقے سے باہر کی لڑکی سے شادی کر کے تم کبھی مطمئن زندگی نہیں گزار سکو گے۔“ یاسمین نے ان کی معقول دلیل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کا خیال ہے۔ جو طبقاتی امتیاز کی حامی ہیں۔“ منصور نے ان کی طرف دیکھا۔

”ندی کے دو کنارے آپس میں کبھی نہیں مل سکتے۔“ یاسمین نے دلیل دی۔

”ندی کے دو کنارے انفرادی حیثیت سے الگ ضرور ہیں۔ لیکن ندی کا پانی انہیں اک اٹھ بندھن میں جکڑے رکھتا ہے۔ پانی ہی سے کنارے بنتے ہیں باقی.....“ وہ تلخی سے مسکرائے۔ ”شادی کا بندھن بھی دو.....“ لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی یاسمین اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی معقول دلیلوں کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ زلفی منصور کی باتوں کو دل ہی دل میں سزا رہے تھے۔ ان کے اٹل فیصلے کی دل ہی دل میں داد دے رہے تھے۔

”میں نے تمہارے لئے ایک درنا یا ب منتخب کیا تھا۔“ یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”تمہاری مرضی جو چاہو کرو۔ ہمیں کیا حق ہے جو کچھ کہہ سکیں۔“

منصور کو یاسمین کا روکھا سا جملہ ایسے لگا جیسے یاسمین نے ان کے ساتھ سارے تعلقات توڑ لئے ہوں۔ یاسمین ان کی بہن تھیں اور ان سے انہیں قلبی محبت تھی۔ وہ اس وقت بڑی دل گرفتہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے منصور کے لئے یہ لمحات بڑے اذیت ناک تھے۔ وہ نرم نرم گھاس کو اپنے چمکتے ہوئے بوٹوں سے بے چینی سے مسل رہے تھے۔

”کماں چلیں۔“ زلفی نے یاسمین کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم کچھ کھائی نہیں رہیں۔ میں جب سے تمہیں دیکھ رہی ہوں“ یاسمین بڑے پیار سے ناہید کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”میں نے تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھالیا ہے۔“ ناہید نے جواب دیا۔ شیریں کی جھکی ہوئی نظرس بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ ناہید نے جان بوجھ کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ پھر کوئی نیا شگوفہ چھوڑے گی۔ اس لئے ناہید نے اپنی توجہ پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرف مبذول کر دی۔

”کچھ جادو کر دیا ہے ان پر“ شیریں آہستگی سے بولی۔

”کن پر“ ساتھ بیٹھی ہوئی مسز ناصر بول اٹھیں۔ وہ بڑی پراشتیاق نظروں سے ناہید کو دیکھ رہی تھیں۔ ناہید نے گہرا کر دیکھا۔ شیریں مسکرا رہی تھی۔

”یہ بہت بڑی جادو گر ہیں بچ کے رہیٹھے گا۔“ وہ ہنستے ہوئے مسز ناصر سے مخاطب تھی۔

”واقعی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو چاہئے بھی بھول گئی۔ انہیں ہی دیکھے جانے کوئی چاہ رہا ہے۔“ مسز ناصر نے ہنستے ہوئے کمان کی باتیں سن کر یاسمین بھی آگئیں۔

”یاسمین“ مسز ناصر بولیں ”تم نے ہمارا تعارف تو کر لیا نہیں۔“

”آپ دیر سے پہنچیں تھیں“ یاسمین نے کہا ”یہ ہماری نئی دوست ہیں مس ناہید۔“

”ماشاء اللہ کیا پیاری پیاری صورت پائی ہے“ مسز ناصر تعریف کرنے لگیں۔ اور ناہید کے چہرے پر شفق کی سرخیاں لہرائے لگیں۔

”سیرت صورت سے بھی زیادہ حسین ہے“ یاسمین اس کے بالوں میں ڈھیلے ڈھالے ربن سے کھیلنے ہوئے بولیں۔ شیریں نے چبھتی ہوئی شریر نظروں سے اسے دیکھا ناہید کا رنگ سرخ ہو گیا۔

چائے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔ محفل میں صوفوں پر نرم نرم کشن بیٹھے والے کویوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے آغوشِ نعیش میں دھنسا جا رہا ہو۔ کمرہ دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ ناہید، شیریں اور مسز ناصر ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ عورتوں کی اکثریت ناہید کے حسن سے متاثر تھی اور بار بار اسی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اس تذکرے سے ناہید بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”آپ یہیں رہتی ہیں“ مسز ناصر نے ناہید سے پوچھا ”پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

ناہید اب تک اسی محلے سے ڈر رہی تھی۔ بغل میں بیٹھی ہوئی مسز ناصر نے چپکے سے وار کر ہی دیا آخر وہ اس سوال کا کیسے جواب دے۔ وہ سوچنے لگی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور کچھ مضطربانہ اس نے شیریں کی طرف دیکھا۔ بیگم ناصر اپنے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

”آپ یہاں نوادرِ معلوم ہوتی ہیں۔“ انہوں نے پھر کہا۔

”لیکن ایک بات ہے یاسمین۔ منصور تمہارے کسی فیصلے کے پابند نہیں ہوں گے۔“ زلفی نے کہا۔

یاسمین کو غصی آگئی۔ جب منصور کسی فیصلے کے پابند نہیں ہوں گے۔ زلفی نے کہا۔ تو پھر انہیں اپنی پسند کی ہوئی لڑکی دکھانے سے کیا فائدہ۔ زلفی بچاؤ سے یوں ہسلار ہے تھے جیسے وہ کوئی کم سن بچہ تھیں۔

آخر بڑی چپکلی چپڑی باتوں کے بعد زلفی بچانے یاسمین کو رضامند کر ہی لیا۔ منصور نے ان کی بحث میں کوئی حصہ نہ لیا۔ یاسمین نے اس امید پر لڑکی کو دکھانے کی حاضری بھری۔ کہ شاید ناہید کی من موہنی صورت دیکھ کر منصور اپنا ارادہ بدل دیں۔

اور اسی مقصد کے لئے یاسمین نے دوسرے ہفتے اپنی قریبی سہیلیوں کو چائے پر مدعو کیا ناہید اور شیریں کو بھی بلایا۔

قصرِ عتنا کے وسیع ڈرائنگ ہال میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ بڑی بڑی بیضوی میزوں پر چائے کا سامان بڑے قریب سے چنا ہوا تھیشے اور چاندی کے نفیس برتنوں سے میزیں جگ مگاری تھیں۔ بلند کھڑکیوں پر موسم کی مناسبت سے مین پر دے ڈال دیئے گئے تھے۔

خواتین چائے پینے میں مصروف تھیں دل چسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ گنتی کی چند عورتیں زمانے بھر کے موضوعات زیر بحث لاری تھیں۔ بحث برائے بحث ہو رہی تھی اور کچھ مقصد نہ تھا۔

ناہید سفید ربڑی لباس میں کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ کانوں میں سفید موتیوں کی بالیاں لرز رہی تھیں اور اس کے گھٹکھریالے بال ان بالیوں سے بار بار الجھ رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ غڑھا حال سورج کے لانے لانے سائے اس کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔ جس سے اس کا چہرہ کچھ اور روشن ہو رہا تھا۔ آج یاسمین نے کچھ اس اصرار سے بلایا تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی تھی۔ وہ خود بھی یاسمین کے لئے اپنے دل میں عجیب سی کشش محسوس کرتی تھی۔ اس دن سکول میں ان سے متعارف ہونے کے بعد دوبارہ ملنے کی تڑپ اس نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی اور آج ان کا شفقانہ سلوک اسے بڑا متاثر کر رہا تھا۔

”تکلف نہ کرو ناہید“ یاسمین نے بڑے پیار سے کہا۔

”شکریہ“ وہ جواب میں مسکرا دی۔ یاسمین دوسری طرف گھوم گئیں۔ چائے کے دوران وہ کئی بار ناہید کے پاس آچکی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد شیریں نے ناہید کے پہلو میں چپکلی کی۔ ناہید اچھل پڑی۔

”بڑی خاطر مدارات ہو رہی ہیں۔ خدا خیر کرے“ شیریں پلیٹ میں سموں رکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ناہید نے مڑ کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں شرارتیں اٹھائیاں لے رہی تھیں۔

”کہاں ہم اور کہاں قصرِ عتنا میں دعوتیں“ وہ پھر چپکے سے بولی ”دعا دیتے ہیں تمہارے دم کو“ یاسمین ناہید کے قریب آ رہی تھیں۔ شیریں اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

”جی“ یہ اس کا مختصر سا جواب تھا۔

”آپ کے والدین“

”وہ فوت ہو چکے ہیں“ ناہید جلد از جلد اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ مسز ناصر ایک سوال کے بعد دوسری سوال کرنے لگیں۔ یاسمین آگئیں۔ ناہید انکی طرف متوجہ ہو گئی۔ مسز ناصر کی باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”ناہید گانا سنیں گی“۔ شیریں نے یاسمین سے کہا۔

”ج“ وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھیں۔ ناہید نے شیریں کو گھورا۔ لیکن یاسمین مصر تھیں۔ اور مسز ناصر تو جیسے اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔

”ضرور سنیں گے“۔

گائے گان کاں کر دوسرے صوفوں پر بیٹھی ہوئی خواتین بھی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگیں۔

شیریں بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ناہید کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ آداب محفل کا خیال تھا۔ ورنہ وہ اس سے ضرور لڑ پڑتی۔

”سنائیے ناب“ پروین صوفے کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”کوئی پھر کتنی ہوئی غزل ہو جائے۔ لطف آ جائے گا“۔

”میں ستار کے بغیر نہیں گا سکتی“۔ ناہید نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا پروین کچھ مایوس سی ہو گئی۔

”ستار ابھی آ جاتی ہے“۔ یاسمین پولیس ”منصور کو بھی ستار کا بڑا شوق ہے“۔

یاسمین اٹھ کر چلی گئیں۔ شیریں نے ناہید کے پہلو میں پھر ہلکی سی ہتکلی لی۔ وہ خاموش رہی۔ ستار آگئی۔

ناہید ابھی۔ اک جھجک کے ساتھ ستار لے لی۔ ستار پر جھکی ہوئی وہ ایک فن کار کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ اک ماہر فن کی طرح اس نے تاروں کو دیکھا اور معز اب کی ہلکی سی ضرب سے تار جھنجھٹا گئے۔ اس کی غزلوں انگلیاں تاروں پر قس کر رہی تھیں اور آہنی تاروں کے ٹھنڈے ٹھنڈے ہونٹوں سے در دیلے گیت پھوٹ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ خالی ستار بجاتی رہی۔ خواتین کی باتیں ختم ہو گئیں۔ مباحثے ٹھنڈے پڑ گئے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ گاری تھی۔ نغمہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز ستار کے کمر اور یاس انگیز سروں میں مل کر فضا کے چھائے ہوئے سکوت کا سینہ چیر رہی تھی۔ اس کی آواز کا قدرتی سوز اس کے گلے کا زیر دم اور المیہ غزل کے جانگداز اشعار نے ماحول کو افسردہ بنا دیا۔

ڈرائینگ روم کی پچھلی کھڑکیاں گول باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ اس باغ میں ایک بوڑھے درخت سے ٹپک لگائے منصور مایوس سے کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں مرمریں حوض میں نصب شدہ نونائی مجسمے پر جمی ہوئی تھیں

جس کی آنکھوں سے پانی آنسوؤں کے قطروں کی طرح ٹپکتا تھا اور حوض میں گرنا تھا۔ فن کار نے اپنے فن کو عروج پر پہنچا یا تھا۔ سورج کی تیار کرنیں حوض کے پانی پر مائی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ سگرٹ کا ادھ جلا نکلا ہاتھ میں لئے منصور یوں تو بڑے اٹھاک سے اس مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کی نگاہوں کا تھوہید ہاتھ تھا کہ وہ کچھ اور ہی بات سوچ رہے ہیں۔

آج جس مقصد کے لئے یاسمین نے یہ چائے دی تھی۔ وہ مقصد انہیں بے مقصد نظر آ رہا تھا۔ یاسمین کی ضد پوری کرنے کے لئے زلفی چچائے فیصلہ دے دیا تھا منصور کو بھی ان کا دل رکھنے کی خاطر خاموش رہنا پڑا تھا۔ لیکن اس کا انجام..... وہ بھیا یک انجام کا تصور کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ کاش وہ اپنے دل کی دستوں کو یاسمین کے سامنے پھیلا سکتے۔

منصور دل گرفتہ ہو رہے تھے۔ اپنی محبت کی مختصر سی زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح نظروں میں گھوم رہے تھے۔ ناہید نے پہلی نظر میں ہی ان کی نظروں میں جو مقام حاصل کر لیا تھا وہ اپنی جگہ اٹل تھا۔ منصور راستے کی ہر دشواری کو کچل سکتے تھے۔ اور وہ پہلے ہی سے ان دشوار گزار راہوں کو طے کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کے راستے میں یاسمین نے معاشرے کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ یہ دیوار وہ یکہ غموں سے گرا سکتے تھے۔ لیکن اس کی زد میں یاسمین آ جاتی تھیں۔ یاسمین جو ان کی ایک ہی ایک بہن تھی جو مولن ذنگسار ہوتے ہوئے بھی دولت کی حد بندیوں کی قائل تھیں۔ منصور ان کا دل توڑتے ہوئے بھی گھبرا رہے تھے۔ اس وقت وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے۔ سوچتے سوچتے ان کا دماغ ٹھک چکا تھا۔ سگرٹ زیادہ پینے کی وجہ سے ان کا حلق سوکھ رہا تھا۔

نیلگوں آسمان رات کی آمد سے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے بے مقصد گھوم پھر رہے تھے۔ دھندلے چھا جانے کو کچل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ منصور نے سگرٹ پھینک دیا وہ ابھی تک سگدہ ہاتھ پر بڑھا کر انہوں نے سگرٹ کو کچل ڈالا دھواں اٹھنا بند ہو گیا۔ سگرٹ بجھ گیا کچھ دیر تک مسلے ہوئے سگرٹ کو دیکھتے رہے۔ انہیں اس وقت یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ سگرٹ کی طرح سگدہ رہے ہیں۔ سلگتے رہیں گے۔ ہر وقتیکہ موت کا قدم ان کی ہستی کو کچل دے۔ وہ عشق کی ٹھنڈی آگ میں سلگتے رہیں گے۔ اور دھواں اٹھتا ہی رہے گا۔

انہوں نے ایک گہری آہ بھری حسرت آمیز نظروں سے آسمان کو دیکھا۔ بادلوں کو دیکھ کر انہیں اس دن والی بارش یاد آگئی۔ وہ ناہید کے پاس بیٹھے تھے۔ میز پر کانڈات بکھرے تھے۔ ناہید ہن کے سرے سے حسب سابق کھیل رہی تھی۔ باہر مولا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج خوف ناک ہوتی جا رہی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے پھوٹا اندر آ رہی تھی۔ ناہید نے کانڈات سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے۔ میز پر رکھا ہوا خوب

یاسمین نے پروگرام کے مطابق ناہید کورات کے کھانے پر روک لیا۔ اس نے ہتیرا چاہا چلی جائے۔ لیکن یاسمین کے محبت آمیز اصرار کے سامنے اسے ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ اس کی تھکی ماندی روح بھی کسی ایسی ہی شفقت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے سستانے کا آسرا ڈھونڈ رہی تھی۔ سب مہمان چلے گئے۔ مسز ناصر ناہید کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتی گئی۔ اور شیریں اسے جھپتی ہوئی شریر نظروں میں بہت کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔

یاسمین منصور اور ناہید کا تعارف جلد از جلد کروانا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لئے باہر گئیں۔ منصور کو ڈرانگ روم میں آنے کا کہہ کر واپس آگئیں۔ ناہید کھڑکی کے قریب کھڑی سوچ میں متفرق تھی۔ یاسمین اس کے قریب آگئیں۔ انہیں اس پر بے ساختہ پیار آگیا۔ انہوں نے ہانسیں پھیلا دیں۔ اور وہ ان سے یوں لپٹ گئی جیسے ان سے مدتوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں خواہش بھٹنے لگی کہ کاش یہ لمحات ابدی ہو جائیں۔ وقت پہاڑوں پر جہی ہوئی برف کی طرح منجمد ہو جائے اور وہ اپنی بھوکی پیاسی روح کو لئے اسی سینہ سے چسبی رہے۔ جس میں محبت کی گرمی اور پیار کی ٹھنڈک تھی۔

برآمدے میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ناہید سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی روح ابھی تک کیف آمیز سرور محسوس کر رہی تھی۔ تیز برفی روشنی میں اس کا چہرہ دک رہا تھا۔ اور وہ عقیدت بھری نظروں سے یاسمین کو دیکھ رہی تھی۔ ادھر منصور دروازے کے عین وسط میں کھڑے بڑی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے آنکھوں کو کچھ اس انداز سے جھپکا جیسے اپنی بصارت پر یقین نہ ہو۔

”آؤ منصور“ یاسمین نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

ناہید نے چونک کر دیکھا۔ وہی اپالو کا مجسمہ۔ وہی انسان کا روپ دھارے ہوئے کوئی دیوتا۔ لانا باند تانباک چہرہ۔ روشن آنکھیں۔

منصور جو اس کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔ جو اس کے معبود کے معبود تھے۔ جن کی پرستش وہ چپکے چپکے کرتی تھی۔

منصور کی آنکھوں میں چاندنی راتوں کا عکس لہرانے لگا۔ وہ اک متانہ چال چلتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔

”ہماری دوست ناہید سے ملو منصور“۔ یاسمین ان کی آنکھوں میں اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے بولیں۔ ”اور ناہید یہ میرے بھائی منصور ہیں۔“

منصور کو اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے تپتے ہوئے صحرائوں کی جلتی ہوئی ریت کو ابریر رحمت نے سرد کر دیا ہو۔ آتشیں گولے فردوسی ہواؤں میں بدل گئے ہوں۔ کائنات مسکرا اٹھی ہو۔ اور یاسمین کی لاعلمی پر ناہید گھبرا گئی۔ منصور نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

صورت ٹھیل لپ بھوار کی زد میں تھا۔ ناہید نے اٹھ کر لپ کوٹنے والی میز پر رکھ دیا اور اس کا پلگ اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ کچھ اتنا سخت تھا کہ باوجود کوشش کے وہ نہ نکال سکی۔ وہ کچھ خفیف سی ہو کر منصور کی طرف دیکھنے لگی۔

بیکھے ہوئے موسم اور ناہید کی موجودگی ان کے جذبات میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔ گھرے فاختی کپڑوں میں وہ باولوں کا ایک جزوی معلوم ہو رہی تھی۔ بادل جو بھلیوں سے بھر پور تھا۔

”بس اتنی ہمت“ منصور ہنستے ہوئے اٹھے پلگ واقعی سخت تھا زور دار جھکے سے انہوں نے کھینچا وہ تو نکل آیا اس کے ساتھ ہی بجلی کا شعلہ سا پید ہوا نیلا نیلا شعلہ ناہید کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا“ منصور نے پاس کھڑی ہوئی ناہید کو دیکھا۔

”میں سمجھی“ وہ کنت زدہ سی آواز میں بولی ”آپ کا ہاتھ چھو گیا ہے۔“

منصور مسکرا دیے اور ناہید کو بغور دیکھنے لگے۔

”اگر چھو بھی جاتا تو کیا ہوتا۔“

”تو..... تو“ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اپنی بے ساختہ چیخ پر اسے ندامت سی ہو رہی تھی۔ اس نے محبوب سی نظروں سے منصور کو دیکھا اور انہیں اس کی آنکھوں میں محبت کا، خرز خاز ٹھاٹھیں مارتا، ناظر نظر آیا۔ جذبات کی ہلچل دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی۔ ناہید جلدی سے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی اور منصور کے جنوں کو ہوش آگیا۔

ناہید کی گہری گہری آنکھوں میں وہ اس سے پہلے بھی لہراتے ہوئے طوفان دیکھ چکے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں شعلہ بلند ہوا تھا۔ اور دونوں نے اپنا اپنا دامن اس کی لپیٹ سے بچانے کی بجائے اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ آگ تیزی سے جل رہی تھی اور اس کی چش دوں کو جھلس رہی تھی۔

منصور خیالات میں کھوئے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے کے خیال سے قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائیونگ روم کے پیچھے سے گزرے۔ فضا میں نقش تھی۔ نغمہ ہوا کی لہروں میں تھر تھرا ہٹ پیدا کر رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر کھڑکی کے قریب رک گئے۔ وہ سننے لگے۔ آواز ان کی روح کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔ اک یاس انگیز موسیقی اک مایوس ترنم جیسے کوئی دکھی روح اکیلی ویرانوں میں بھٹک رہی تھی بند راستوں سے ٹکرا کر اپنا ماتھا پھوڑ رہی ہو۔ تاریخ رہے تھے۔ نغمہ پکار پکارتا جا رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ان کا دل کوئی برے سے چھید رہا ہو۔ کوئی ان کے کچے زخموں میں نشتر چھو رہا ہو۔ وہ مضطرب ہو گئے۔ آنکھیں بند کئے دیوار سے ٹیک لگائے وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ نغمہ رک گیا۔ چیخ مدھم پڑ گئی۔ پکار خاموشیوں میں ڈوب گئی۔

منصور نڈھال سی چال چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔

خاندان کے سرفراز افراد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اور اسے اپنی نسبی پستی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔
 ”زلفی بچا آج رات نہ آسکیں گے۔“ منصور نے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”بات کچھ بڑھ گئی ہے۔“

”تو پھر شروع کیا جائے کھانا۔“ یاسمین بولیں۔ منصور بڑھ کر ناہید کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جو یاسمین نے دانستہ ان کے لئے خالی رکھی تھی۔ ناہید اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میڈیم ڈی سوزا کے لئے اس کا تاجا جب تعجب کن تھا۔ یاسمین نے جان بوجھ کر آج حرم سرا کے ڈائننگ ہال میں کھانے کا بندوبست کروا دیا تھا۔ وہ اپنی حسین دریافت کو سب سے متعارف کروانا چاہتی تھیں۔

ناہید کو بالکل بھوک نہ تھی۔ کچھ منصور کے ساتھ بیٹھ جانے سے رہی سہی بھوک بھی اڑ گئی۔
 ”شرماؤ نہیں ناہید۔“ یاسمین بار بار اس سے کہہ رہی تھیں۔ ناہید کی نظروں سے بے چین سی گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔ یہ گھبراہٹ اس کے حسن کا کاک لازمی جزو بن چکی تھی۔
 سب کھانے میں مشغول تھے۔ ناہید بھی سست رفتاری سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ کھانے سے زیادہ وہ چاندی کے چھری کاٹنے سے کھیل رہی تھی۔

”یہ کھیل کب تک جاری رہے گا۔“ منصور معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔ مچھلی کے کبابوں کی پلیٹ اس کی جانب بڑھا کر وہ اپنی پلیٹ پر یوں جھک گئے۔ جیسے کچھ کہا ہی نہیں۔ ناہید کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا۔ اور منصور نیچی نظروں سے اس کے خوب صورت ہاتھوں کو دیکھنے لگے۔ جن کے لمس نے ان کی رومانی دنیا میں قیامت مچا رکھی تھی۔

منصور کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اور ناہید سوچ رہی تھی کہ کھیل ہی تو کھیلنا جا رہا ہے۔ تحت الشعور میں چھپی ہوئی شرم طنبھری آنکھوں سے گھورتی ہوئی ابھرنے لگی۔ سب کھیل ہی تو ہے۔ ناہید دل میں کہہ رہی تھی۔ منصور۔ شرم۔ شرم۔ منصور ذہن میں دو نام گھوم رہے تھے۔ یہ اک دھوان کا کھیل ہے۔ اک دولت مند کا مذاق ہے شرم کی چھپتی ہوئی نظریں کہہ رہی تھیں۔ اور ناہید کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ منگلے رئیس ایسے کھیل کھیلا ہی کرتے ہیں۔ اور جانے کہاں سے تخیل کے پردوں کو چرتی ہوئی اسے اپنی ماں کی شکل نظر آئی۔ ماں۔ اس کے ساتھ بھی کسی ایسے ہی دھوان نے کھیل کھیلا تھا۔ اس کی ماں نے بازی ہار دی تھی۔ اور اس ہار نے آندھی کی طرح اسے اپنے نوانیت کے بلند مقام سے اڑا کر رذالت کی پستیوں میں پھینک دیا تھا۔ اس کی ماں۔ ایک طوائف تھی۔ ناہید کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ وہ ایک رندی کی لڑکی ہے۔ اسے اپنے آپ سے کراہت محسوس ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ گندگی کے ڈھیر تھے دبی ہے۔ اس سے تعفن آ رہی ہے۔ سڑناٹھ رہی ہے۔

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ناہید سنبھٹا گئی۔ آداب محفل کا خیال رکھتے بڑے تامل کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ منصور نے اس کا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت خوشیوں کے ہم آہنگ ہو کر نائج رہی تھی۔ ناہید کو پسینہ آ گیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ان کے ہاتھ کا دباؤ وہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ جھٹماٹھا تھا۔ اور آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ منصور کا یہ ڈرامائی انداز مسرت بخش بھی تھا۔ اور تکلیف دہ بھی۔

یاسمین دونوں کی کیفیت سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ منصور کی کشادہ آنکھوں میں انگڑائیاں لیتا ہوا خمار اور ناہید کے سراپا پر چھائی ہوئی گھبراہٹ کی کچکی ان کی جیت کا کھلم کھلا اعلان تھی۔ انہیں اس وقت ایسے خوشی ہو رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہو۔ کوئی میدان مار لیا ہو۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صوفے پر ناہید یاسمین کے پہلو سے چپکی لگی بیٹھی تھی۔ منصور کھڑکی کے قریب کھڑے چشم بندوق سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”باجی آپ کی دوست گوگنی ہیں۔“ انہوں نے کن آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ناہید جب سے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ یاسمین ہنسنے لگیں۔

”بڑے شریر ہو۔“ انہوں نے بھائی کو بڑے پیار سے ڈانٹا۔ ”بھاگو میاں سے اور ناہید کا دل ہول کھارہا تھا۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یاسمین کو اس کے بارے میں شیریں سے صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ لیکن اس کے اوصاف حمیدہ۔ اس کے لباس کی نفاست۔ اور ہاتھ میں پڑی ہوئی بڑے سے ہیرے کی انگوٹھی سے انہوں نے اس کے بہت معزز اور پر شکوہ خاندان کا اندازہ لگالیا تھا۔ ناہید کی لمحہ بہ لمحہ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ ان کے بھائی کے دفتری معمولی کلرک تھی۔ اور اس کا خاندان رسوائیوں کا پلندہ تھا۔

کھانے کی میز تنوعات سے پُر تھی۔ ہیرے سفید در دیوں پر سنہری پٹیاں لگائے بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ لذیذ کھانوں سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں اشتہا کو اور بڑھا رہی تھیں۔ زلفی بچا کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ صبح سے دولت آباد گئے ہوئے تھے۔ منصور انہیں دو دفعہ فون کر چکے تھے۔ لیکن ابھی ابھی انہوں نے اطلاع دی کہ وہ رات نہ آسکیں گے۔ انتظار بے کار تھا۔ یاسمین ناہید کے مقابل چوڑی میز کے دوسری طرف بیٹھی تھیں۔ ان کے دائیں طرف میڈیم ڈی سوزا مشرقی حسن کے اس لاجواب پیکر کو دیکھ رہی تھی۔ محل کے سب افراد کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ منصور کی دور پار کی بیوہ خالائیں اپنی معمر آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ حسد کی والدہ کی عینک ناک پر آگئی تھی۔ اور وہ عینک کے شیشوں کے اوپر سے بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی۔ یاسمین نے بڑے فخر سے اپنی اس دوست کا تعارف کرایا تھا۔ ناہید بڑی جھجک محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس وقت اک سربلند

”پانی لاؤں چھینے دینے سے شاید ہوش میں آجائیں۔“ یاسمین اسے صوفے پر لٹاتے ہوئے بولیں۔
”شام جب گانا سنا یا اسی وقت سے بڑی اداس تھیں۔“ انہوں نے مزید کہا۔ گانا ناہید گاری تھی۔ یہ
انکشاف منصور کے لئے اگر انوکھا نہیں تو کیف زامور تھا۔

”پانی لاؤں۔“ انہوں نے پھر کہا۔ ”یا ڈاکٹر کون فون کروں۔“

وہ گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

منصور صوفے کے قریب گھٹنے ٹیکے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ اس کی ٹھنڈی پیشانی پر تھا۔ اور
دوسرا اس کی نبض پر۔ ان کا گرم شخص ناہید کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمبے سانسوں سے الجھ رہا تھا۔ وہ بڑے غور سے
بڑے اٹھناک سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنے قریب سے اسے دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اڑی ہوئی رنگت۔ بند
آنکھوں پر پلکوں کی نوکیلی جھا لریں۔ اس کا سویا ہوا حسن ہزاروں فتنے جگا رہا تھا۔ منصور چاہ رہے تھے۔ یہ لمحات
اتنے طویل ہو جائیں کہ سرخ سیاہ صدیوں کے سینے پر پھیل جائیں۔ ان کا سلسلہ ابد سے جالے۔ وقت قہم
جائے۔ نف ساکن ہو جائے۔ اور وہ یونہی اس کی نبض پر ہاتھ رکھے اس کے اوپر جھکے رہیں۔

رک رک کر چلتی ہوئی سانسیں اعتدال پر آنے لگیں۔ ہموار ہونے لگیں۔ چرے پر زندگی کے آثار
ظاہر ہونے لگے۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔

منصور کی مدہوش کیفیت کا شمار آلود تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گئے ناہید نظر چھپکائے بغیر انہیں
دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی خالی خالی نظروں سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی۔

”آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔“ منصور نے اسے بتلایا۔ سارا واقعہ ناہید کی نظروں میں گھوم گیا۔ اس
نے اٹھنا چاہا۔

”بٹنی رہیں۔“ منصور بولے۔ ”ابھی ڈاکٹر آ رہا ہے۔“

”ڈاکٹر؟ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”بے ہوش جو ہو گئی تھیں آپ۔“ انہوں نے اس کی حیرانگی دور کرنے کے لئے پھر کہا۔

منہج کرنے کے باوجود وہ صوفے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی تھکان محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں
اور پاؤں کی انگلیاں شل سی ہو رہی تھیں۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔

منصور اس کے قریب دبیز قالین پر اس طرح دوڑا تو بیٹھنے لگے۔ جیسے کسی دیوی کے حضور میں عقیدت مند
پجاری نذرانہ پیش کر رہا ہو۔ اور ناہید یوں بیٹھی تھی۔ جیسے نذرانہ لینے میں کچھ پس و پیش کر رہی ہو۔ شرف قبولیت
بخشنے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔

ماں کی طوائفیت اس کی زندگی پر خونی دھبہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس دھبے کو اس نے اپنے تیز ناخنوں
سے کھرچ ڈالنا چاہا تھا۔ وہ دھبہ نہ اترتا۔ ناخنوں کی کھرچ سے اک زخم بن گیا۔ ایسا زخم جو دن بدن گہرا ہوتا
گیا۔ اور ہوتے ہوتے اس کی روح کا شگاف بن کر رہ گیا۔

اس نے ماضی کے خوف ناک مردہ چہرے پر چادر ڈال دی تھی۔ اپنی ماں کی حیثیت کسی کو نہ بتائی تھی۔
لیکن اس کا زندہ ضمیر پہلو میں نشتر چھوٹا تھا۔ اور مردہ ماضی کا چہرہ چادر کے پیچھے سے اپنی کھوکھلی آنکھوں سے
اسے برابر گھور رہا تھا۔ واقعات کی لپیٹ میں چھپا ہوا یہ کریمہ چہرہ اپنے خوف ناک اتار چڑھاؤ سے اسے ڈرا رہا
تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ سہمی ہوئی تھی۔ خوف کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد یاسمین ناہید کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد منصور بھی آ گئے۔ دونوں
بہن بھائی مسرور تھے۔ یاسمین اصلیت سے آگاہ نہ تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ ناہید کے بے پناہ حسن کے
سامنے منصور نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہی ان کی خواہش تھی۔ یہی تمنا تھی۔ اور جب خواہش پوری ہو جائے
تمنا بھر آئے۔ خوشی کسے نہیں ہوتی۔

ناہید کو خیالات کی تند و تیز پورش نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔ منصور کو اپنی طرف بغور
دیکھتے دیکھ کر وہ اور بھی گھبرا گئی۔

”کیس میرے خیالات کا عکس میرے چہرے پر تو نہیں پڑھ رہا۔“

میری پیشانی پر کوڑھ کے داغ کی طرح ان مٹ رہی کالفت تو
انہیں نظر نہیں آ رہا۔ ”ناہید کے دل میں اس خیال پر اک ابال سا اٹھا۔ دماغ میں لال لال شیاں شیاں آندھیاں
چلنے لگیں۔ کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے سر صوفے کے بازو پر لٹکا دیا اور اس کے حواس پر
غودگی سی چھا گئی۔“

”بابی ان کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے شاید۔“ منصور نے یاسمین سے کہا۔ وہ دیر سے اس کے
چہرے پر کشش کی بھیلی سکڑتی لہروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ یاسمین اس کے پاس آئیں۔
”ناہید“ انہوں نے اس کے شانے کو چھتا ہوا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ منصور جلدی سے اٹھ کر یاسمین کے قریب آ گئے۔ یاسمین نے دو تین دفعہ
اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے بڑی محبت سے اس کا سر اٹھایا۔ پیشانی کو چھوا۔ وہ پسینے سے تر تھی۔
آنکھیں بند تھیں۔

”یہ تو بے ہوش ہو گئیں ہیں منصور۔“

دونوں بہن بھائی بے حد گھبرا گئے۔

نے طنز آکھا۔

”اوروں کو نصیحت خود میاں نصیحت۔“ خلیق نے فائزہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

”دل تو آپ کا بھی جائے کو چاہ رہا ہو گا خلیق ماموں۔“ ناصرہ نے چوٹ کی۔ خلیق شرما گیا۔

وہ ناہید کی زلف بچپاں میں الجھ گیا تھا۔ اتنا کامل حسن دیکھنے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اور وہ بھی یوں کہ بیگم رحمان نے اس کے ساتھ اک سنہری سی داستاں چسپاں کر دی تھی۔ اور اس کا حصول بھی بڑا سہل بتایا تھا۔ وہ اس کا متوالا ہو گیا تھا اور باوجود ناہید کے اس دن کے سرورویئے کے اس نے اسے حاصل کرنے کو تن من کی بازی لگا دی تھی۔ چند دنوں کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ لیکن جانے کو جی نہ چاہا..... چھٹی بڑھانے کی درخواست بھیج کر وہ یہیں رک گیا تھا۔

بیگم رحمان کی جہانیدہ نظرس اس کی طبیعت کے رجحان کو پرکھ رہی تھیں۔ اس دن جب انہیں ناہید کے چلے جانے کا پتہ چلا تھا۔ تو انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اسے اس کے فطری شرم و حیا پر محمول کیا تھا۔

”ایمی ہو جاؤں میں بھی تیار۔“ ناصرہ نے پھر پوچھا۔

”میں بھی جاؤں گی۔“ فائزہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ایمی اسے ساتھ نہ لے جائیں۔ یہ ان سے بے ہودہ مذاق کرتی ہے۔ وہ خفا ہو جاتی ہیں۔“ ناصرہ نے

ماں سے شکایت کی۔

”کیا بے ہودہ مذاق کیا میں نے۔“ وہ تیز آواز سے بولی۔

”اس دن کیا بکواس کر رہی تھیں۔“ اس نے بھی غراتے ہوئے کہا۔

دونوں بینیں الجھ پڑیں۔ خلیق اور بیگم رحمان ہنسنے لگے۔

”آج تم دونوں نہیں جاسکتیں۔“ ماں نے بڑے پیار سے کہا۔ دوسری بیٹیاں تھیں۔ لاڈ پیار میں رہتی

تھیں۔ فائزہ تو بعض اوقات بد تمیزی پر بھی اتر آتی تھی۔

”آج مجھے اس سے کچھ ضروری کام ہے۔“ بیگم رحمان خلیق کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑی۔ خلیق کے

چہرے کا سانولارنگ اور گہرا ہو گیا۔

دونوں بہنوں کو جھگڑنا چھوڑ کر وہ باہر آگئی۔

”خلیق“ اس نے بھائی کو آواز دی۔ جو دونوں بہنوں میں مصالحت کروا رہا تھا۔

”آیا“

”ذرا دیکھو تو ذرا سہو ہے۔“

۹

”کہاں جا رہی ہیں امی۔“ فائزہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ بیگم رحمان ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

”ذرا ناہید کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ کئی دنوں سے وہ آئی نہیں.....“ کنگھی میں لپٹے ہوئے بالوں کو نکالتے ہوئے بولی۔

میں بھی جاؤں گی۔

”نہیں بیٹی تمہاری پڑھائی کا ہرج ہو گا۔“

فائزہ ساتھ جانے کے لئے چل گئی۔ وہ بار بار جانے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر خلیق اور ناصرہ بھی کمرے میں آگئے۔ ناصرہ کے ہاتھ میں موٹی سی کورس کی کتاب تھی۔ آج چھٹی تھی۔ اور وہ صبح ہی صبح کتابیں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ سالانہ امتحان قریب تھا۔

”کہاں سیر کو جانے کے لئے تڑپ رہی ہے بیٹی۔“ ناصرہ نے کہا۔ ”سالانہ امتحان سر پر آرہا ہے۔ اور جناب کو جیسے ہوش ہی نہیں۔“

”سیر کو تھوڑا ہی جا رہی ہیں امی۔“ فائزہ نے جواب دیا۔ ماں اسے دیکھ کر ہنس دی۔

”ذرا میرے بال تو باندھ دو ناصرہ۔“ اس نے کہا۔ ناصرہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ اور ماں کے پیچھے کھڑی ہو کر بال باندھنے لگی۔

”کہاں جائیں گی امی۔“

”ذرا ناہید کے ہاں جا رہی ہوں۔“ ماں نے جواب دیا۔

”ایمی میں بھی چلوں۔“ ناصرہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”اب تو پڑھائی کا ہرج نہ ہو گا۔ امتحان تو سر پر نہ آرہا ہو گا۔“ فائزہ منہ لمبورے میز پر بیٹھی تھی۔ میں

خلیق تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔ ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی نکالنے کو کہتا آیا۔

”آج پورا پورا بندوبست کر کے آؤں گی۔“

چھوٹی سی کالی موٹر میں داخل ہونے سے پہلے بیگم رحمان نے خلیق کے کان میں کہا۔ اس کی نظروں میں ناہید کا چہرہ گھوم گیا۔ حسین چہرہ جس پر جنتی رعنائیوں کے پرتو پڑ رہے تھے۔

موٹر چلی گئی۔ اور وہ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ ناہید کا خیال کر کے اسے بے پنے نشہ آرہا تھا۔

ناہید ابھی تک اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ چھٹی کے دن ویسے بھی دیر سے اٹھنے کی عادی تھی۔ لیکن آج تو دس بجتے والے تھے وہ ابھی تک نہ اٹھی تھی۔ ملازمہ کی مرتبہ آکر ناشتے کا پوچھ چکی تھی۔

نرم نرم نکلنے میں منہ چھپائے دونوں بازوؤں کا حلقہ ساکنے وہ الٹی لیٹی ہوئی تھی۔ منصور کا ہلکے سبز رنگ کا نرم اور قیمتی کپل ابھی تک اس کے شانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لہردار بال اس کی پشت اور نکلنے پر پھیلے ہوئے تھے۔

رات کے واقعے کی تلخی و تلطف نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس کی غلط ملط سی سوچ نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ رات کا ایک بلیک واقعہ محرک تصویروں کی طرح اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ وہ کبھی تو دیکھتے ہوئے کونکوں کی پیش محسوس کر رہی تھی کبھی نرم جسم پر سنے والی کالی گٹھائوں کی بوئوں کی ٹھنڈک۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ چاند کی کشتی میں سوار ہو چکی ہو بلکہ نرم چاندنی کی لہروں کے سینے پر خراماں خراماں چلی جا رہی ہے اور کبھی یوں لگتا جیسے اس کی اکیلی کشتی گردابوں میں پھنسنے لگی ہوئی ہے۔ طوفانی سمندروں میں چکر کھا رہی ہے۔ ان متغیر خیالوں نے اس کے دماغ میں بالکل چار کھی تھی۔ صبح سے اس نے چائے تک نہ پی تھی۔ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا لیکن اس کی دی ہوئی دوائی جوں کی توں میز پر پڑی تھی۔ قہر رعنا سے دو دفعہ ملازم اس کی خبر پوچھنے آچکا تھا۔

نکلنے پر سر رکھے آنکھیں بند کئے۔ وہ تخیل کے پردوں سے منصور کو صوفے کے قریب دوڑانے بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ سارا دے کر موٹر میں سوار کراتے ہوئے اس کے گرد کپل لیٹے ہوئے۔ بڑی شائستگی سے بستر پر لٹا کر اپنا سبز کپل اس پر ڈالتے ہوئے منصور کو وہ تصویر کی آنکھوں سے چوری چوری دیکھ رہی تھی۔ اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہرں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن ان مسرت افزا لحاظ کو ایک جانگسل خیال مجروح کر رہا تھا۔ اپنی بے ہوشی کی اصل وجہ کا خیال..... ماں..... ماں کی ذات اس کی ساری مسرتوں پر آتش گیر مادے کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

موٹر کے ہارن کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ شاید منصور آگئے۔ ”اس خیال پر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بالوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کیا۔ بستر سے اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ

بیگم رحمان دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر آگئی۔ ناہید کا دل بچھ گیا۔ اس کا پیچھا۔ اسی طرح بستر پر گر جائے۔ جس طرح بڑی دیر سے پڑی تھی۔

”خیر تو ہے۔“ وہ بڑی اپنائیت سے ناہید کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ابھی تک بستر میں ہو۔

ناہید نے اسے سلام کیا۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”کچھ طبیعت خراب ہے آج۔“

”موسم کی تبدیلی کا اثر ہو گا۔ کوئی دوائی لی ہوئی۔“

ناہید نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر دوائی کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔

ناہید کو بیٹھے دیکھ کر ملازمہ چائے لے آئی۔ ناہید ہاتھ منہ دھو کر آگئی۔ اور پھر بستر پر بیٹھ گئی۔ صرف

ایک پیالی چائے لے کر پینے لگی۔ بیگم رحمان نے بڑے اصرار سے اسے ساتھ کچھ کھانا چاہا۔ وہ کچھ بھی نہ کھا سکی۔

چائے پیتے ہوئے بیگم رحمان اور حرا دھڑکی فضیل علی باتیں کر رہی تھی۔ ہر بات ہر پھر کر خلیق پر آکر ختم ہوتی۔ ناہید کے لئے اس کا ذکر سنا تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ لیکن خاموش تھی۔ کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر رحمان کے احسانات اس کا منہ روکے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ سختی سے اسے منع کر دیتی۔

وہ گھنٹہ بھر اس کا دماغ چاٹتی رہی۔ ناہید کا تھکا ہوا دماغ چڑ رہا تھا۔

”ایک اکیلی اور پھر پیار بھی چند دنوں کے لئے ہمارے ہاں ہی چلی چلو۔“ اس نے کسی خوش کن خیال سے مغلوب ہوتے ہوئے پیش کش کی۔

”شکریہ۔“ ناہید نے کہا۔ ”معمولی طور پر طبیعت خراب ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”شام کو ناصرہ فاخرہ کو بھیجوں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ذرا امتحانوں کی تیاری میں مشغول ہیں۔“

”ان کا ہرج ہو گا۔“ ناہید نے کہا۔

”نہیں ہرج کیا۔ تم سے ہمیں عزیز کیا ہے بیٹی۔ شام کو خلیق کے ساتھ بھیجوں گی انہیں۔“

خلیق کے بار بار ذکر سے وہ پہلے ہی چڑ گئی تھی۔ اب شام کو اسے یہاں بھیجے گی۔ ناہید کا دماغ اس کے اصرار کا ثقل محسوس کرنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں اب تو۔“ ناہید نے نرم انداز میں اسے منع کرنا چاہا۔ ”ناصرہ‘ فاخرہ کو تکلیف نہ دیجئے۔ خود کسی دن آ جاؤں گی۔ ان کا امتحان ہے نا۔“

”تکلیف کا ہے کی۔“ بیگم رحمان نے جواباً کہا۔ ”تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ خدا کرے یہ تھوڑی بہت

”جو تم سن رہی ہو۔“ شیرس کو معلوم تھا۔ کہ ناہید خلیق کے نام سے چڑ جاتی ہے اس دن دعوت والا قصہ ناہید نے شیرس کو سنا تھا۔ اور صاف لفظوں میں اسے بتایا تھا۔ کہ اسے یہ بات قطعاً ناپسند ہے۔

”ابھی ابھی بیگم ر حمان گئی ہیں نا۔“ وہ ناہید کے پاس پٹنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”برآمدے میں مجھے مل گئیں۔ کتنے لگیں۔ آج شام خلیق ناہید کو نشانی کے طور پر انگوٹھی پہنانے آئیں گے۔“

”شیرس“ ناہید زور سے چیختی۔

”کیا تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ بے ساختہ ہنس دی۔ ”یونہی بیٹھی رہو گی کیا۔ اچھا خاصہ لڑکا ہے۔ جوان خوب صورت مکاؤ۔ اور پھر تمہارا دیوانہ۔“

”اف بند کرو یہ باتیں۔“ ناہید نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

”اگرے بھی اس بے چارے کا تصور بھی کیا ہے۔ تمہیں دیکھ کر کون ہوش و حواس میں رہتا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔ ”اللہ قسم میں لڑکا ہوتی تو اب تک تمہارا انگوٹھا بھی کر لیا ہوتا۔“

ناہید شیرس کی بات پر ہنس نہ سکی۔ اس کے لب پھڑپھڑائے۔ تھننے پھڑکے اور آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔ شیرس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی روشن آنکھیں ایسے معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے کشتیاں زیر آب آگئی ہوں۔ پانیوں میں ڈوب رہی ہوں۔ وہ بے تاب ہو گئی۔ اور اس کے گلے میں ہانسیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”اللہ..... کتنی جلدی رو دیتی ہو تم۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

ناہید کو تو جیسے دل کا غبار دھوئے کاہنا نہ مل گیا تھا۔ وہ روئے جارہی تھی۔ روئے جارہی تھی۔ شیرس اپنے مذاق پر نادم اسے چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی دل گرفتہ ہو گئی۔

”دیکھو ناہید تم چپ نہ ہوئیں۔ تو میں بھی روؤں گی۔“ اس نے اس کا ہچکا ہوا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ لیکن وہ ہنس پڑی۔ اس نے ناہید کو بتایا۔ کہ اس نے بیگم ر حمان کو کیسے ٹالا۔ اب خلیق شام کو اپنی عجائبیوں کے ساتھ کبھی نہ آئے گا۔

”جب میں نے کہا کہ ناہید کی مٹکی ہو چکی ہے۔ تو اللہ قسم بیگم ر حمان کا سانس اوپر کا اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔“ شیرس ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ ناہید بھی مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں ابھی تک آنسوؤں کی نمی تھی۔

”کننے لگیں ناہید نے تو کبھی تذکرہ ہی نہیں کیا تھا۔“ شیرس کے جاری تھی۔ ”میں نے کہا آپ بھی

کمال کرتی ہیں خالد جان۔ ناہید کی عادت سے واقف ہوتے ہوئے آپ اس بات کی امید کر سکتی ہیں۔ کہ وہ اپنی مٹکی کا قصہ آپ کے سامنے کرتی۔ وہ تو مجھے بھی اتفاقاً ہی پتہ چل گیا۔ میں نے خوب کرید اٹھا ہے بتاتے ہی ہی۔

لڑکا تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ بس آنے ہی والا ہے اب تو۔“

غیر متوجہ محسوس کرتی ہو۔ وہ بھی جلدی مٹ جائے۔ خدا وہ دن بھی کبھی لائے گا۔“

بیگم ر حمان کے الفاظ ناہید کے دماغ میں سویلوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ وہ آئی تو اس کا عندیہ لینے تھی۔ لیکن جانے کیوں صاف صاف بات کرتے ہوئے ہچکچائی۔ اشاروں کنایوں میں ہی بات کر کے چلی گئی۔

ناہید کو دعائیں دیتے ہوئے وہ اٹھی۔ اور شام کو دونوں بہنوں کو خلیق کے ساتھ بھیجنے کا کہتے ہوئے بیگم ر حمان چلی گئی۔ دروازے کا پردہ ابھی تک بل رہا تھا اور ناہید آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

بیگم ر حمان کمرے سے نکلی تو برآمدے میں شیرس مل گئی۔ وہ دو تین بار صبح سے ناہید کے کمرے میں جھانک گئی تھی۔ رات اس نے منصور اور ناہید کو موٹر سے اترتے دیکھا تھا۔ اور پھر جاتے ہوئے منصور ناہید کی ملازمہ کو بار بار اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہے تھے۔ اسے آرام سے پڑا رہنے دینے کا کہہ رہے تھے۔ وہ یہ سمجھ نہ سکی تھی۔ کہ اسے کیا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح دونوں سرشار سے موٹر سے اتر کر کمرے کی طرف بڑھے تھے۔ اس کی تیز نظریں بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔

منصور کے بائیں ہاتھ پر کبل تھا۔ اور دائیں ہاتھ سے ناہید کو سہارا دیے تھے۔ شیرس ناہید کو چھیڑنے، ستانے اور لطف اٹھانے کے ارادے سے صبح سے دو تین بار اس کے کمرے کی طرف آچکی تھی۔ اب آئی تو بیگم ر حمان کا سامنا ہو گیا۔ ناہید کے ساتھ وہ دو چار مرتبہ ان کے ہاں جا چکی تھی۔ بیگم ر حمان اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ برآمدے ہی میں دونوں کھڑی ہو گئیں۔

”آئیے اب میری طرف چلئے۔“ شیرس نے کہا۔

بیگم ر حمان رک نہ سکتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اپنے آنے کا نشانیاں کیا۔ جو بات کھلے لفظوں میں ناہید سے نہ کہہ سکتی تھی۔ شیرس سے کہی۔ وہ جانتی تھی کہ شیرس ناہید کی ہمد و مہراز ہے۔ خلیق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ مستقبل میں ناہید کے آرام و آسائش سے پُر زندگی کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا۔ کہ شیرس کو ہنسی آگئی۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔

اس کے جانے کے بعد شیرس ہنستی ہوئی پردہ اٹھا کر ناہید کے کمرے میں آگئی۔ ناہید بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں نرم نرم تکیہ پڑا تھا۔ جس پر دونوں کنبیاں رکائے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھامے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

”سنائے آج شام خلیق صاحب مٹکی کی رسم ادا کرنے آرہے ہیں۔“ شیرس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لعت ایسی دوستی پر۔ چکے چکے سارا معاملہ طے کر لیا۔ ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ کننے کو دوست بنا رکھا ہے مجھے۔“

”کیا کہہ رہی ہو شیرس.....“ ناہید پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

بے خبری کی نیند سو گئی۔ ملازمہ نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ رات منصور نے اسے اس کے آرام کا خاص خیال رکھنے کی بڑی سختی سے تاکید کی تھی۔

.....○.....

”حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔“ شیریں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ناہید کی خط و کتابت ہے اس سے۔“ میں نے جواب دیا پہلے تو نہیں تھی۔ لیکن جن حالات میں وہ سلطان پور پہنچی ضروری تھا۔ کہ وہ اسے اپنے حالات سے مطلع کرتی اور تو مونس و غمگسار کوئی تھا نہیں۔ رشتہ دار پہلے ہی جان کے لاگو ہو رہے تھے۔ وہی ایک تھا۔ جس سے ہمدردی کی توقع تھی۔ اور پھر وہ کوئی غیر تو ہے نہیں۔ اس کے مرحوم چچا کا ایک ہی ایک بیٹا ہے وہ۔ اللہ قسم مجھے بیگم رحمان کا بایوس چہرہ دیکھ کر ترس آ گیا۔ تمہارے جیسی شکل و صورت پائی ہوتی۔ تو خلیق بے چارے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیتی۔“

شیریں نے کچھ ایسی مضحکہ خیز شکل بنائی۔ کہ ناہید کو ہنسی آ گئی۔

شیریں مزے لے لے کر ساری باتیں جو اس نے بیگم رحمان کو ٹالنے کے لئے کہی تھیں۔ ناہید کو سناتی رہی۔ ناہید مطمئن ہو گئی۔ شیریں نے اک بڑا بوجھ اس کے دل و دماغ سے اتار دیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اپنی پیاری سی سنانولی سلونی دوست کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کبیل کہاں سے مارا۔“ شیریں کے دل میں رات والی بات کئی بل کھا رہی تھی۔ اور وہ ناہید کو ستانے کے لئے آخر بول ہی ابھی۔ ناہید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ وہ ملائم کبیل پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”رات کھانے کے بعد اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ واپسی پر سردی تھی۔ یہ کبیل.....“ وہ ہنچکچاتے ہوئے بولی۔

”یہ بات ہے۔“ شیریں آنکھوں کو نچاتے ہوئے بولی۔ ”جیسی رات نواب صاحب چھوڑنے آئے تھے۔“

”تم.....“ ناہید کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

”میں سونے کے لئے پانگ پر لیٹی تھی۔ کہ مجھے الہام ہوا۔ دل نے کہا اٹھو۔ اور دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے۔ چک کے پیچھے سے جھاٹکا۔“ شیریں آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بولی۔ ”ایک شہزادہ اور ایک شہزادی ایک دوسرے کی بانہوں کے سہارے جھومتے جھومتے چلے آ رہے تھے۔“

ناہید شرمائی۔ اس نے کبیل منہ تک کھینچ لیا۔ شیریں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اسے حجاب آ رہا تھا۔ ”اب سارا دن اس کبیل ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہو گی۔ دوپہر ہونے کو آئی اٹھو گی یا نہیں۔“ شیریں نے اسے گد گدایا۔

”اللہ قسم شیریں بڑی نیند آ رہی ہے سونے دو۔“

اس کا دل واقعی سونے کو چاہ رہا تھا۔ رات بھر وہ چین سے نہ سو سکی تھی۔ شیریں کے جاتے ہی وہ

”صبح“

”اور منصور“

”وہ روانہ ہو چکے ہیں۔“

”آپ بھی آجائے۔ پھر چلے جاتے“

”کام ہی کچھ اس نوعیت کا ہے۔ آج رات پھر رونا پڑے گا۔ کل رات کا تو مجھے افسوس ہی رہا۔
بھئی تمہارا درنا یا بندہ دیکھ سکا۔ ساتھ ہی ان کی ہنسی کی آواز آئی۔۔۔۔۔

”منصور نے آپ سے کچھ کہا“ یاسمین نے شوق سے پوچھا۔

”دادو دے رہے تھے تمہاری پسند کی“

یاسمین کو اتنی خوشی ہوئی جیسے کسی نے ہفت اقلیم کی بادشاہی دے دی ہو۔

”مان لیا نا پھر ہمیں زلفی بچا“ وہ اترا تے ہوئے بولیں۔

”مان لیامی مان لیا“ ان کے ہنسنے کی تیز آواز آئی۔

کچھ دیر وہ ان سے ناہید کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ موٹر کے بہان کی آواز آئی۔

”شاید منصور آگے خدا حافظ“ کہتے ہوئے انہوں نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے
برآمدے کی طرف آگئیں۔ منصور انہیں وہیں مل گئے۔

کھانے کے بعد دونوں ڈرائیونگ روم میں آگئے۔ یاسمین اصل موضوع چھیڑنے کا سوچ رہی تھیں۔
اور منصور لمبے درپے کا پردہ ہٹاتے سرگٹ پیتے ہوئے باغ کی اونٹنی کو فضا سے خطا اٹھا رہے تھے۔ یاسمین دیکھ
رہی تھیں کہ آج منصور ضرورت سے زیادہ چمک رہے تھے۔ بات بات پر دل کھول کر قہقہے لگا رہے تھے۔
بڑے دلوں کے بعد انہوں نے ان کے چہرے پر اتنی جاندار ہنسانہ۔ دیکھی تھی۔ آخر انہوں نے ناہید کا ذکر
چھیڑ دیا۔

”منصور تم نے ان کا گانا نہیں سنا۔ رات وہ بے ہوش ہی ہو گئیں۔ ورنہ میں ضرور سنوائی تمہیں“ وہ ناہید
کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ منصور نے چاہا۔ کہہ دیں باقی میں ان کے گانے کے ہوش رہا طلسم
سے آگاہ ہوں۔ لیکن چپ رہے۔ یاسمین اٹھ کر ان کے قریب کھڑکی میں کھڑی ہو گئیں۔ منصور نے سرگٹ
راکھ دان میں رکھ دیا۔

”باقی آپ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے مسئلے ہوئے سرگٹ کو دیکھتے ہوئے
بولے۔

”ابھی تو کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ عاصم آباد کی رہنے والی ہیں۔ اور ان کے

۱۰

یاسمین نے ابھی کھانا نہیں کھا یا تھا۔ دوپہر کو زلفی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے منصور کو بلا بھیجا تھا۔ وہ اتنی جگہ میں
تھے۔ کہ جاتے ہوئے یاسمین سے مل کر نہ جاسکے تھے۔ صبح سے دو دفعہ فون کر چکی تھی۔ منصور یا زلفی دونوں نہ
ملے تھے۔ داروغہ نے ہی جواب دیا تھا۔ ابد رات کے آٹھ بجتے والے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ
لوٹا تھا۔ زلفی کا تو انہیں انتظار نہیں تھا۔ منصور کا وہ بے مبری سے انتظار کر رہی تھیں۔ وہ رات کے معاملے پر
ان سے جادوئے خیالات کرنا چاہتی تھیں۔ ناہید ان کی منتخب شدہ لڑکی تھی۔ زلفی کی ایما پر انہوں نے منصور سے
کا تعارف کروایا تھا۔ گو منصور کی والمانہ حرکتوں سے انہیں اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے
بارے میں وہ ان کے منہ سے آخری فیصلہ سننے کی ہمتی نہیں۔

ناہید کے بارے میں انہیں شیریں سے باتوں باتوں میں صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ عاصم آباد کی رہنے والی
ہے۔ اور اس کے والدین حیات نہیں۔ انہوں نے قیافہ شناسی سے کام لیتے ہوئے اسے ایک ذی وقار اور عالی
خاندان سے منسوب کر لیا تھا۔ اس کی طبعی شرافت اس کے قیامت خیز حسن اور اس کے شانستہ اطوار سے انہوں
نے سب اندازہ لگا یا تھا۔

سرراہ پڑی ہوئی کسی دلفریب تصویر کے گرد سنہری سنہری حاشیے بڑھادیے جائیں۔ اسے خوش نما فریم
میں لگا دیا جائے تو یہ زیادتی نہیں۔ کوئی غلطی نہیں بلکہ جاذب النظر تصویر کا حق ہے۔ جو ادا کیا جائے۔

آٹھ بج چکے تھے۔ یاسمین برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ منصور ابھی تک نہیں آئے تھے۔ یاسمین فون
کرنے کے ارادے سے پھر گیلری کی طرف آئیں۔ نمبر بلا یا زلفی بول رہے تھے۔

”آج آپ سارا دن کہاں غائب رہے۔ تیسری دفعہ فون کر رہی ہوں“ یاسمین نے گلے کے انداز میں کہا۔

”بس کام ہی کچھ ایسا تھا۔ آکے بتائیں گے۔“ زلفی نے جواب دیا۔

”آہیں گے کب“

میں باپ مرچکے ہیں " یاسمین نے جواب دیا۔

"آپ نے کیونکر کہا تھا۔ کہ وہ کسی باعفت خاندان کی چشم و چراغ ہیں " منصور آہستگی سے بولے۔

"یہ تو میں نے محض قیافے سے کہا تھا۔"

"قیافہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ناممکن" وہ بڑے دھڑلے سے بولیں "گو میں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں جانتی۔ لیکن میرا قیافہ

غلط نہیں ہو گا۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔ یہ مشکل کام توڑا ہی ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں باجی " منصور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ یاسمین کا دل اچھلا۔ پاس پڑی ہوئی کرسی کی پشت کے سارے یوں کھڑی تھیں۔ جیسے اپنے آپ کو گرنے سے بچا رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر باپوسی پھیل گئی۔

"میں انہیں جانتا ہوں " منصور پھر بولے۔

"تم اسے جانتے ہو " یاسمین خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ لیکن منصور کے بچے ہوئے لمبے سے ان کی خوشی دیر پا نہ ہو سکی۔

"وہ میرے دفتر میں ملازم ہیں " منصور نے اسی لمبے میں کہا۔ یاسمین حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔

ناہید ملازمت پیشہ لڑکی ہے۔ اپنی سماعت پر انہیں یقین نہ آیا وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جیسے کھڑے رہنا دشوار تھا۔

چند لمبے وہ ساکت صامت بیٹھی رہیں۔ منصور ان کے چہرے کا گہری نظروں سے مطالعہ کر رہے تھے۔ یاسمین

کے رویے سے انہیں روحانی اذیت ہو رہی تھی۔ اور یاسمین کو منصور کے بیان سے ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔

"وہ دنیا میں یکہ و تنہا ہیں " منصور یاسمین کو دیکھ کر تعجب سے مسکرائے "قرڈائر میں پڑھ رہی تھیں۔ چند

ناگزیر وجوہ کی بنا پر تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی " اور پھر انہوں نے مختصر لفظوں میں ناہید کی روداد ان کے گوش گزار

کر دی۔

یاسمین نے منظرِ ناہید پہلو بہ پہلو لاوا ابھی تک خاموش بیٹھی تھیں۔ منصور کی بتائی ہوئی باتوں کو جھٹلانا چاہتی

تھیں لیکن زندہ حقیقت سے انحراف کیسے کرتیں۔

"تمہیں ناہید نے سب کچھ بتایا ہو گا۔" آخر وہ بولیں۔

"نہیں منصور کو نہی آ رہی تھی۔ یاسمین کا جوش دودھ کے ابال کی طرح ختم ہو گیا تھا۔

"تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہو گئیں یہ باتیں"

"ڈاکٹر حمان نے بتایا تھا۔

"ان کا بیان متند توڑا ہی ہو سکتا ہے۔" یاسمین کو اپنے قیافے کی شکست پر نڈلت سی ہو رہی تھی۔

"میں کل خود ناہید سے مل کر سب باتیں پوچھوں گی۔"

"آپ تو انہیں پسند کر چکی ہیں۔" منصور کھڑکی کے ریشمی لہراتے ہوئے پردے کو قابو میں کرتے

ہوئے بولے۔ "آپ کا صدیوں کی عظمت کا حامل خاندان اپنے دامن میں ایسی لڑکی کو نہ دے سکتا ہے۔ جس

کے خاندان کا آپ کو کوئی علم نہیں جسے اپنی روزی کمانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

یاسمین ایک دم کوئی جواب نہ دے سکیں۔

"ہو سکتا ہے وہ ملازمت مجبوری کی بنا پر کر رہی ہو۔ اس سے یہ ثابت توڑا ہی ہوتا ہے۔ کہ اس کی

خاندانی حیثیت کچھ بھی نہیں۔" یاسمین کی نظروں میں ناہید کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اداس اور مغموم چہرہ۔

"میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔"

"تو گو یا پسند کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے۔" منصور بے تاب ہو کر بول اٹھے پردہ انہوں نے سختی سے پکڑ

رکھا تھا۔

"کیا مطلب " وہ چپیں پچیں ہو کر بولیں۔

"آپ ان کے بارے میں جاننے کی خواہش مند ہیں۔ بالفرض وہ آپ کے قائم کردہ معیار پر پوری نہیں

اتر تیں۔ اس صورت میں آپ کا عملی قدم کہاں پڑے گا باجی۔"

منصور نے کچھ اس باپوسی سے کہا۔ کہ یاسمین تڑپ اٹھیں۔ ناہید جو بھی تھی۔ جیسی بھی تھی۔ وہ اسے

قبول کر چکی تھیں۔ اس کے غیر تسلی بخش حالات سن کر ان کے قدم ڈگمگائے ضرور تھے۔ لیکن دل اس کا فریفتہ ہو

چکا تھا۔ اور کچھ اپنے الفاظ کا پاس تھا۔ وہ کرسی سے اٹھیں۔ منصور کے قریب آکر غور سے ان کے چہرے کو

دیکھتے ہوئے بولیں۔

"تمہارا ناہید کے متعلق کیا خیال ہے منصور۔"

انہوں نے چاہا۔ کہ دل چیر کر یاسمین کو دکھادیں۔ ناہید ان کے نیچات کی پرواز تھی۔ ان کے افکار کی

بلندی تھی۔ ان کی روح کی لطافت تھی۔ ان کی زندگی بن چکی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے ان کے متعلق۔" منصور نے اٹنا انہیں سے پوچھا۔

"میں " یاسمین بولیں۔ "میں تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں منصور۔ جانے کیوں۔ پہلی نظر

ہی میں وہ مجھے اتنی پسند آ گئی۔ جیسے وہ میری اپنی بہن ہو۔"

منصور کا چہرہ چمک اٹھا۔ آنکھیں جوش مسرت سے کچھ سرخ ہو گئیں۔

"باجی۔" وہ جھپکے۔ "شکر ہے میری اور آپ کی پسند کی ٹکڑ نہیں ہوئی۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔"

پھانسی کے نکل جانے پر چہن تو نہیں رہتی کک ضرور رہتی ہے۔ یاسمین کو بھی ناہید کے خاندانی حالات

جائے کیوں وہ ایک دم لفافہ نہ کھول سکی۔ لفافہ بٹوے میں رکھ لیا اور اعجاز کے کمرے میں آگئی۔
 ”اعجاز صاحب میں گھر جارہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اعجاز اسے شوق بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کے لئے وہ جلدی سے واپس مڑی۔ ”شاید میں کل بھی نہ آؤں۔“ کہتے ہوئے وہ پردہ اٹھا کر باہر آگئی۔ اعجاز دیکھتا ہی رہ گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے لفافہ کھولا۔ منصور کا خط تھا۔ وہ خط پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ کبھی اس کا منہ سرخ ہو جاتا۔ اور کبھی زردی کھٹ جاتی۔ پنک کے تکتے کے سہارے کھڑی وہ خط پڑھ رہی تھی۔ اس نے یہ مختصر سا خط کی دفعہ پڑھا۔ اور ہر دفعہ اس طرح پڑھا جیسے پچھلی دفعہ عبارت سمجھ میں نہ آئی ہو۔
 گو خط کی تحریر بڑی شستہ اور مختصر تھی۔ لیکن ایک ایک لفظ میں کئی جہاں آباد تھے۔ کئی دنیا میں بس رہی تھیں۔ امنگوں اور آرزوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے بڑی تنہا سے بڑی چاہت سے انہوں نے شادی کی پیشکش کی تھی۔

”کیا امید رکھوں کہ واپسی پر ہماری امیدیں مسرت بکثارت ہوں گی۔“ خط کے خاتمے پر انہوں نے بڑے ارمان سے لکھا تھا۔
 شادی۔

تقدیر امنگوں کی سیرابی۔ تکمیل انسانی۔ دور وحوں کا حسین ملاپ۔ ربط باہم کی ابدیت۔ لیکن ناہید خط پڑھ کر مسرور نہ ہو سکی۔ وہ اس وقت کچھ سوچ نہ سکی۔ اس کا دماغ جیسے جم گیا تھا۔ منصور کا طیارہ فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ اور ناہید کے دماغ پر ایک ہی خیال غالب آ رہا تھا۔ کہ وہ اس سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اور وقت انہیں اور دور لے جا رہا ہے۔

لفافے کو مٹھی میں لئے وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ منصور کو گئے کئی دن گزر چکے تھے۔ اور مسلسل کئی دنوں سے وہ ایک ہی بات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک ہی مسئلہ تھا۔ جو وقت سے دقتیں ترہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت کی سوچ نے اسے چڑھا سنا دیا تھا۔ وہ امید و نیم کے بھنوروں میں بھنسی ہوئی تھی۔ وہ شادمانوں اور نا کامیوں کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف سنا مستقبل تھا۔ اور دوسری طرف گھٹاؤ ناخانی۔ جو دن بدن پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اس کے پھیلاؤ میں اس کا حال اور مستقبل آتے جا رہے تھے۔

منصور کے بغیر زندگی تاریک عاروں میں چٹکھانے والے بھوتوں کے آگے ڈال دینے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ ایک رنڈی کی لڑکی تھی۔ ایک بیوا کی اولاد تھی۔ رنڈی جو سماج کے سینے کا گمراہ گھوا ہے۔ بیسوا جو اس کی جھانکی کمرستہ ہونا سہ ہے۔ کیا منصور اس گھٹاؤ کے فاسد مادے کو قبول کر لیں گے۔ اس رشتے ہوئے ناسور کے مواد کو اپنا سکیں گے۔ بہ رضائے غبت قبول کر لیں گے۔ نہیں..... ان کے دل میں ارض و سما کی وسعتیں سا

معلوم کر کے کچھ ایسی ہی کھک ہو رہی تھی۔ لیکن ناہید کو وہ دل و جان سے پسند کر چکی تھیں۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ منصور بھی اس کے گھماں میں تو وہ دونوں کو شادی کے بندھنوں میں بکڑنے پر رضامند ہو گئیں۔ لیکن کوئی رسمی کارروائی کرنے سے پہلے ہی انہیں واپس جانا پڑا۔ اور اپنی دوبارہ آمد تک اس فرض سے بکدوش ہونے کو ملتی کسنا پڑا۔ زلفی بھی ایک ماہ کا دورہ ختم کر کے واپس ہو گئے۔

منصور کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ خاندانی جاہ و حشم کی سنگلاخ چٹانیں پھل مٹی تھیں۔ معاشرے کی کھڑکی کی ہوئی دیواریں موم ہو گئی تھیں۔ راستہ ہموار تھا۔ اور منزل قریب دکھائی دے رہی تھی۔ اتنی قریب کہ وہ جب چاہتے ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتے تھے۔ وہ شاداں و خراماں بڑھتے گئے۔ ناہید اور ان کے ملاپ کے مسدود راستے کھل چکے تھے۔ ان کی زندگی میں بہاریں جنم لے رہی تھیں۔

بہاریں جاودانی نہیں ہوتیں۔ خزاں انہیں روند ہی جاتی ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں پگلا خود فریب انسان جاودانی بہاروں ہی کا متنی رہتا ہے۔

منصور کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے پیرس گئے تھے۔ ان کا دورہ دو ہفتے کا تھا۔ ناہید اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کہ یہ پندرہ طویل دن کیسے گزریں گے۔ دفتری خشک زندگی کا اسے آج پہلی دفعہ تجربہ ہوا تھا۔ فائل کھلے پڑے تھے اور کاغذات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے کاغذات تمہ کئے۔ فائل بند کر کے دراز میں رکھے۔ اس سے دفتر میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ اس ارادے سے ابھی۔ کہ شونے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔

”آجاؤ۔“ وہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ شونے بڑے ادب سے ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”کس نے دیا۔“ وہ لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”سرکار دے گئے تھے۔“ شونو منصور کا ذاتی ملازم تھا۔

”بکب دیا۔“

”جانے سے پہلے۔“

”اور تم اب لائے ہو۔“

”سرکار نے کہا تھا۔“

ناہید چند لمبے حیرت سے کبھی لفافے کو اور کبھی شونو کو دیکھتی رہی۔

”جاؤ۔“ شونو چلا گیا۔ لفافہ ہاتھ میں لئے وہ سوچتی رہی۔ کہ اس میں کیا لکھا ہو گا۔ منصور صبح جانے سے پہلے کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ اس لفافے کے متعلق تو انہوں نے کچھ اشارہ بھی نہ کیا تھا۔

ری تھی۔

فریدوں بھی سیرا کے ساتھ وہ ڈبی ڈھونڈنے لگا یا سمین نے بچوں کو جھڑکا۔ وہ سم گئے۔ آخر بڑی مشکل سے منصور نے بچوں کو سلا پھسلا یا۔ انہوں نے انگوٹھی یا سمین کو بھی نہ دکھائی تھی۔ وہ یہ تحفہ ناہید کے لئے لائے تھے۔ اپنی معنی کی نشانی کے طور پر اس کی سفید سفید نرم و گداز انگلی میں پہنانے کے کیف آنکلیں تصور سے محوم رہے تھے۔

شام کو انہوں نے سلطان پور جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یا سمین۔ نواب صدیق اور ان کی والدہ بھی ان کے پیچھے بڑگئے وہ جتنا جلدی وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ یہاں اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ آخر سب کے اصرار پر انہیں رکنا ہی پڑا۔ صبح پر روانگی ملتوی کر دی۔

رات کو فریدوں اور سمیرا ان سے بڑے مزے کی باتیں سن رہے تھے دونوں بچے ان کے بستری میں آگئے تھے۔ منصور کے لئے وقت گزارنے کا یہی بہترین مشغلہ تھا۔ وہ بچوں کو اپنے سفراء پریرس کے دوران قیام کی دلچسپ باتیں سن رہے تھے۔

”ماموں حضور“ فریدوں اکتا کر بولا۔ ”پریوں کی کہانی سنائیے۔“

”ہاں تم نے ٹھیک کہا فریدوں۔“ سمیرا نے تائید کی۔

اور منصور کو ناہید کی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ فریدوں نے اسے پریوں کی شہزادی کہا تھا۔ بچے شور مچا رہے تھے۔ اور وہ اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

”سنائیے نا۔“ بچے بولے۔

”کیا۔“

”پریوں کی کہانی۔“

”فریدوں تم نے ایک دفعہ ہمارے ہاں پریوں کی شہزادی دیکھی تھی نا۔“

”کہاں ماموں حضور۔“ فریدوں کے ذہن سے بات نکل گئی تھی۔ منصور نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ کچھ یاد آتے ہی چلا یا۔ ”دیکھی تھی۔“

”جھوٹ“ سمیرا نے اس کی بات جھٹلانے کی کوشش کی۔

”ماموں حضور میں نے کوئی جھوٹ بولا ہے۔“

”نہیں بھی سمیرا۔ فریدوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ انہوں نے پریوں کی شہزادی دیکھی تھی۔“

”بس۔“ فریدوں نے سمیرا کا منہ چڑایا۔

”بس لڑو نہیں۔“ منصور نے انہیں پیار سے ڈانٹا۔ ”ہاں تو فریدوں اگر ہم اس پریوں کی شہزادی کو

جائیں۔ ان کے نظریات میں فلک کی بلندیاں سمو جائیں۔ پھر بھی وہ ایک رنڈی کی لڑکی کو نہ اپنا سکیں گے۔ وہ جانے اسے کیا سمجھ رہے ہیں۔ اس کی اصلیت سے آگاہ ہوتے ہی وہ کراہت سے منہ پھیر لیں گے۔ ان کی محبت دودھ کے ابال کی طرح ختم ہو جائے گی۔ یہ خیال سوہان روح تھا۔ وہ منصور کا تحفہ کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ جن نظروں میں وہ حوروں کا تقدس پا چکی تھی۔ ان سے گرنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ انکار کر دے گی۔ وہ اپنے بارے میں منصور کو کچھ نہ بتائے گی۔ یہ اس کی تفحیک تھی تذلیل تھی۔ جو اسے گوارہ نہ تھی۔ انکار..... اس خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لافانہ ابھی تک اپنی تقدیر کی طرح اس کی مٹھی میں تھا۔

دینے والے نے تو اسے کچھ اس فیاضی سے دینا چاہا تھا۔ کہ اسے شکوہ کرنا ہی داماں ہو جاتا۔ لیکن اس کے دامن کی فرسودگی اتنی وزنی دین کی تحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے اپنا دامن پھیلانے کی بجائے سیٹ لے۔ یہی وہ کر سکتی تھی۔ یہی مناسب تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ کوئی مضطرب حرکت نہ کر رہی تھی۔ لیکن اس خاموشی میں ہزاروں طوفان تھے۔ کالی کالی خوف ناک آنندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

اس کا ماضی مرا نہیں تھا۔ اک خوفناک بدروح بن کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ خونخوار بدروح۔ جو اس کے مستقبل کو کھا گئی۔ اس کی ساری مسرتوں کو ہڑپ کر گئی۔ اس کے راستے میں سانج کی چنی ہوئی دیواریں حائل نہ تھیں معاشرے کی لگائی ہوئی قیود نہ تھیں۔ طبقاتی خلیجیں راستہ روکے ہوئے نہیں تھیں۔ اسے تو اس کے ماضی نے مارا تھا۔ ماضی جس سے بدبو نہیں اٹھ رہی تھیں۔ تعفن آ رہی تھی۔

منصور کا پندرہ روزہ دورہ ختم ہو گیا۔ وہ زلفی کے پاس بھی دو دن کے لئے گئے تھے۔ زلفی نے یا سمین کے بچوں کے لئے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ منصور خود بھی بچوں کے لئے بیش قیمت تحائف لائے تھے۔ اس لئے وہ سیدھے ناظم پور ہی اترے۔

بچے ان کی آمد پر خوشی سے پھولنے لگے۔ ان کے لئے خوبصورت کھلونے لائے تھے۔ سمیرا اور فریدوں چھینا چھنی کر رہے تھے۔ یا سمین بڑے فخر سے ساری چیزیں اپنی ساس کو دکھا رہی تھیں۔ ساس ہر چیز کے ساتھ لمبی چوڑی دعائیں دے رہی تھیں۔ وہ ان کے رشتے کی بھو بھیجی تھیں۔ لیکن انہیں اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں۔

”وہ بھی دکھائیں ماموں حضور۔“ سمیرا ان کے کپڑوں کی تہ میں پڑی ہوئی چھوٹی سی سفید ڈیہ کے لئے پھلی۔

”وہ کچھ نہیں۔“ منصور نے جلدی سے ڈیہ کپڑوں کے نیچے کر دی۔

ڈبی میں پلاٹینم کی بڑے سے ہیرے والی خوبصورت انگوٹھی تھی سفید انگوٹھی ان کی امیدوں کی طرح چمک

چھوٹی سی میز پر کین کی خوب صورت نوکری میں سلائی کی چیزیں پڑی تھیں۔ ساتھ والی بڑی میز پر اخبار کھلا پڑا تھا۔ لیکن وہ کسی طرف دھیان دیئے بغیر خلاؤں میں گھور رہی تھی۔
چوکیدار کی آواز نے اس کے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔
”کیا سینو۔“ اس نے پوچھا۔

”نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔“

”چوکیدار کے الفاظ پر وہ اچھل پڑی۔“

”کون بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔“

”سرکار۔“ چوکیدار نے سامنے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... ”آپ کو بلارہے ہیں۔“
ناہید نے گردن گھما کر دیکھا۔ منصور اپنی شاندار رولس رائس کے پاس کھڑے تھے۔ ایک پاؤں پائیدان پر رکھے وہ ہوا میں کوئی چیز اچھال رہے تھے۔ گرے پتلون اور سفید بٹن شرت پہنے تھے۔ اور ان کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔
”مجھے بلایا ہے۔“ اس نے مستعجب ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“

منصور سامنے کھڑے تھے۔ ناہید کوئی ہمانہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ اٹھی..... اور اک باوقار چال چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔ منصور نے اسے آتے دیکھ کر چھوٹی سی ڈیہ پتلون کی جیب میں ڈال دی۔ مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔ چشمہ اتار کر سیٹ پر رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں میں غمار انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مستیاں جھوم رہی تھیں۔ بڑھ کر انہوں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ ناہید کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ باہر کھڑی رہی۔

منصور نے ”آئیے بھی۔“ التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ناہید اس ”آئیے بھی“ کی نوعیت کو سمجھ گئی۔
منصور سامنے کھڑے تھے۔ اس کا جی چاہا۔ بھاگ جائے۔ اس کا ٹھوس ارادہ انہیں دیکھ کر متزلزل ہونے لگا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کہ اس کا انکار صرف اس پر ہی نہیں بلکہ منصور پر بھی اک ناروا ظلم ہو گا۔

”مجھے آپ سے کچھ ضروری کام ہے۔“ ان کی نگاہوں میں بجلبوں کی کوند تھی۔ جس نے ناہید کا خرمن مبرو قرار جسم کر ڈالا۔ وہ کبھی بھی انکار نہ کر سکے گی۔ وہ اپنی زندگی کی باروں کو خروٹا بن کر کبھی کچل نہ سکے گی۔ اس کا جی چاہا۔ اپنے ماضی کو منصور سے اسی طرح چھپائے رکھے۔ جس طرح ابھی تک ان کی نظروں سے مستور تھا۔ اسے یہاں کون جانتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ضمیر دل کی اس جھوٹی آواز پر ملامت کر رہا تھا۔ دھوکہ اور وہ بھی منصور سے دھوکہ اس خیال ہی سے وہ کانپ گئی۔ تو پھر..... پھر اسے چلا جانا چاہئے۔ ان کے ساتھ۔ وہ اپنے خط کا جواب بالکل نہیں گے۔ وہ انکار کر دے گی..... بلاوجہ انکار کر دے گی۔

اپنے گھر لے آئیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“

فریدوں جیرانگی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”لیکن ماموں حضور۔“ سیرابولی۔ ”پریوں کی شہزادیاں تو جنوں کے دیس میں رہتی ہیں۔ گھروں میں کہاں رہ سکتی ہیں۔“ سیرابولی نے اپنی دانست میں بڑی عافلانہ دلیل دی تھی۔ منصور کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چھو دی۔

”نہیں سیرا۔ جب کوئی شہزادہ جاتا ہے۔ تو انہیں جنوں کے پنجے سے چھڑا لیتا ہے۔ پھر وہ گھروں میں ہی رہنے لگتی ہیں۔“

سیرا کو ان کی باتوں پر جیسے یقین نہ آیا۔ وہ بے اعتباری سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ فریدوں کو گھسنے لگا تھا۔ اور منصور کا دل بلاوجہ اضطراب سے گھبرا رہا تھا۔

ناہید نے چاہا۔ کہ منصور کے خط کا جواب لکھ کر بھیج دے۔ انکار..... اپنی ناراضماندی کا اظہار لکھ کر دے۔ لیکن جب بھی قلم اٹھایا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ قلم سے کاغذ پر لکھنا نہیں چاہتی۔ بلکہ کسی بے گناہ کی گردن پر چھری چلانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ کئی دفعہ کی کوشش جب ناکام ہوئی تو اس نے لکھ کر انکار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

منصور آگئے۔ وہ آمناسامنا کرتے ہوئے گھبرائی۔ لیکن انہوں نے اس خط کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ ناہید کو کچھ حوصلہ ہوا۔ لیکن معاملہ کب تک التوا میں ڈالا جاسکتا تھا۔

منصور کو آئے دوسرا دن تھا۔ پہلے دن کی طرح یہ دوسرا دن بھی خیریت گذر گیا تھا۔ صرف ایک دفعہ منصور نے ناہید سے پوچھا تھا۔

”آج شام کو آپ کہیں جاتو نہیں رہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے ان کے سوال کی نوعیت کو سمجھے بغیر جواب دیا تھا۔

اور اب شام کی چائے پینے کے بعد اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں ایک آرام کر سی پر نیم درازا سی سوال پر غور کر رہی تھی۔ موسم بے حد رنگین تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تیز ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر گہرے گہرے بادل فیل مست کی طرح جھومتے چلے آ رہے تھے۔ دور کسی ٹکڑے پر بجلی چمک رہی تھی۔ بادل پھیلنے جا رہے تھے۔ اور ان کے سینے میں بجلیاں کہیں گرنے کو تڑپ رہی تھیں۔ فضا رومان انگیز تھی۔ وہ اس وقت سرمئی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ قیض کے سرمئی رنگ پر سرخ سرخ پھول تھے۔ جو موسم کی مناسبت سے بڑے بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ بالوں کو نیم دائرے کی شکل کے جوڑے میں باندھ کر سرخ رین ڈالا ہوا تھا۔ اس کی سفید براق گردن پر یہ جوڑا بے حد بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ ملازمہ چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔

تھا۔ سڑک کے ایک طرف سبز گل پوش پہاڑیوں کے لامتناہی سلسلے تھے۔ اور دوسری طرف سبز سبز گھاس کے قدرتی فرش سے مزین میدان۔ دور چاندی کی کلبیر کی طرح سطحیں چمک رہا تھا۔
”واپس چلے نا۔“ ناہید نے پھر کہا۔ موٹر اک جھکے کے ساتھ رک گئی۔ منصور اترے اور بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

”تشریف لے جائیے۔“ وہ سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھوں میں معصوم شرارت کی چمک تھی۔ ناہید نے حیرانگی سے پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ موٹر کا کھلا ہوا دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔
”کیا سوچ رہی ہیں اب آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔“ وہ قدرے جھک کر اسے مخاطب کر رہے تھے۔

”کہاں جاؤں۔“ وہ حیرت زدہ سی بولی۔

”یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں آپ نے واپس جانے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میں آپ کو روکتا نہیں۔“ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولے۔ ناہید کا پریشان حسین چہرہ ان کے جذبات میں تلاطم پیدا کر رہا تھا۔
”میں..... اکیلی کیسے جاؤں۔“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

”میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ وہ ناہید کی بات پر بے ساختہ ہنس دیئے۔ ”واپس جانا ہے۔ تو اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ اور اگر میرا ساتھ چاہتی ہیں..... تو میں۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بڑی ہی سنجیدگی سے بولے۔ ”میں تو بڑھتا ہی جاؤں گا پلٹوں گا نہیں۔“

ناہید کے پاس اب کوئی جواب نہ تھا۔ منصور نے دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ اس نے ان کی شرارت پر کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ ہی داد دیتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنی انگلیوں کو مسلے جا رہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی۔ کہ منصور کی اتنی جوان جوان امتگوں کا۔ اتنی تومند مسرتوں کا ان کمزور انگلیوں سے گلا بھی گھونٹ سکے گی یا نہیں۔

منصور نے اسے غور سے دیکھا۔ ان کی خوشیوں کے دل ڈوبنے لگے۔ ان کی مستیوں کو ادھکے ہی آنے لگی۔ ان کا دل بھج گیا۔ اور جب وہ ناہید کے ساتھ سلطان پور کی سب سے حسین جگہ پر پہنچے جہاں گھٹے درختوں کے دامن تلے دریائے سطح پر نغمے گنگنا رہا تھا۔ ان کی طبیعت کی ساری جولانی۔ ساری شوقی کا نور ہو چکی تھی۔ کسی آنے والے خطرے سے ان کا دل مضطرب ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی درد کی ٹپسیں اٹھنے لگی تھیں۔

ناہید ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی دریائے لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ جن میں ہوا کے زور سے تلاطم پیدا ہو رہا

معاہدہ التوا میں نہ ڈالا جاسکتا تھا۔ جتنی جلدی فیصلہ ہو جائے بہتر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ہمت ٹوٹتی نظر آئی۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور وہ بار بار ادھ یا بلار ادھ موٹر کی سپرنگ وار سیٹ میں دھنسنے لگی۔ اس کے اور منصور کے درمیان صرف سیاہ چشما اور ایک قیمتی کیمرا پڑا تھا۔

شائدار موٹر بڑی تیزی سے صاف و شفاف سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ منصور آنے والے دور کے کیف و سرور سے محروم سے رہے تھے۔ اور ناہید سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اور ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ اور منصور بار بار اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کی طبیعت تو خراب نہیں۔“ انہوں نے اس کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر پوچھا۔

”نہیں۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

”کہیں پھر بے ہوش ہونے کا پروگرام تو نہیں بن رہا۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے

تھے۔ ناہید کسمسما کر رہ گئی۔

ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور افق کے سینے سے کالے کالے بادل دھوئیں کی طرح اٹھ رہے تھے۔ جو بڑھتے جا رہے تھے، پھیلتے جا رہے تھے۔ اور ان کالے کالے گہرے گہرے بادلوں میں بجلیاں کہیں گرنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ منصور نے دو چار بار قریب بیٹھی ہوئی ناہید سے بات چیت کرنا چاہی۔ لیکن اس نے ہر بات کا اختصار سے جواب دے کر بات کی طوالت کو ختم کر دیا۔

”آپ جا کہاں رہے ہیں۔“ ناہید نے سنسن سڑک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر موٹر بھاگی جا رہی تھی۔

”جہاں سے واپس آنے کی تمنانہ کی جاسکے۔“ منصور نے شوخ سنجیدگی سے جواب دیا۔ منصور کے اس بے ساختہ جواب سے اس کی روح تھرا اٹھی۔ وہ نہ تو ان کی طرف دیکھ سکی۔ نہ ہی کوئی لفظ منہ سے نکال سکی۔ منصور نے کن انکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی کو اس کے شرم و حیا پر محمول کرنا چاہا۔ لیکن نہ تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخیاں لہرا رہی تھیں۔ نہ ہی کسی لطیف احساس کی چھٹیڑ چھاڑ تھی۔ وہاں تو اک دیر ان چپ تھی۔ اک دہشت زدہ خاموشی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ یوں بیٹھی تھی جیسے کسی عزیز کی قبر فاتحہ پڑھ رہی ہو۔ کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ منصور کچھ بھج سے گئے۔

”واپس چلے۔“ ناہید نے مضطربانہ ان کی طرف دیکھا۔

”اگر میں انکار کر دوں تو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرائے۔ ناہید نے گھبرا کر سر جھکا

لیا۔

موٹر اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ سڑک سنسن تھی۔ فضا دریاں انگیز تھی۔ سلطان پور کا حسن اپنے جوبن پر

تھا۔ وہ اس پتھر کی طرح ہی کچھ بے حس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ منصور اس کے سامنے کھڑے درخت کی جھولتی ہوئی شاخوں سے سبز بڑیاں نوج رہے تھے۔

”واپس چلئے۔“ ناہید نے منصور کی طرف نگاہ اٹھائی۔ جو بڑی محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا۔“ انہوں نے ناہید کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

ناہید کوئی جواب نہ دے سکی۔ اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ عالم نزع میں ہو۔

”میرا خط ملا تھا۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”جی۔“ وہ بمشکل کہہ سکی۔ منصور کی گرفت درخت کی پکلیلی شاخوں پر اور سخت ہو گئی۔ ناہید کا عزم ایک بار پھر ڈگمگایا۔ اس کا دل چاہا۔ کہ منصور کی پیشکش کو قبول کر لے۔ ان کے بغیر وہ شاید ایک سانس بھی نہ لے سکے گی۔ لیکن دماغ نے اپنی استدلال پیش کر دیں۔ دل اور دماغ اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ جس طرح نزع کے وقت موت و حیات۔

”کیا فیصلہ کیا آپ نے۔“ انہوں نے بڑی بے دلی سے پوچھا۔ ناہید خاموش تھی۔ اور اس کی خاموشی سے جواب اخذ کرنا کچھ مشکل نہ رہا تھا۔

”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں دیران تھیں۔ حلق میں کانٹے بڑے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ منصور کو اپنی ناکامی کا یقین ہو چلا تھا۔ ان کے چہرے پر بھوری بھوری چٹانوں کی سختی ابھر رہی تھی۔ ناہید بے جان مورق کی طرح کھڑی تھی۔

”ناہید“ منصور نے اس کے قریب آتے ہوئے بڑی اپنائیت سے اسے پکارا۔ ان کی آنکھوں میں اجڑے دیار کی دیرانیاں تھیں۔ چہرے پر نامعلوم سی زردی پھیل گئی تھی۔ ”میں نے اب تک جو کچھ سمجھا وہ غلط تھا کیا۔“

”آپ غلطی بھی تو کھا سکتے ہیں۔“ ناہید نے بڑی ہمت سے جواب دیا۔ لیکن اس کی آواز کانپ گئی۔ ”کیا..... کیا.....“ وہ کچھ نہ سوچ سکے۔ الفاظ ان کے گلے میں انک گئے اپنے خالی ہاتھوں کو بے چینی سے ملتے ہوئے وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ناہید سے کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ تک سفید پڑ چکے تھے۔ سڑک پر کھڑی ہوئی موٹر کی طرف جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے۔ منصور کچھ دیوانگی کے انداز میں اس کی طرف بڑھے۔ اسے سختی سے شانوں سے پکڑا کہ اس کا منہ اپنی طرف گھمایا۔

”آپ نے انکار کر دیا۔“ وہ جانی ہوئی بات کو جاننے کے لئے کہہ رہے تھے۔

ناہید کی خاموشی میں طوفانوں کی ہلچل تھی۔

”آپ بولتی کیوں نہیں۔ جواب دیجئے۔“ منصور نے اسے تقریباً جھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو میری تجویز سے اختلاف ہے۔“

”جی۔“ جانے کیسے اس کے لبوں سے آواز نکلی۔ اور اس ”جی“ نے منصور کی تمام رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ ان کے ہاتھ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح اس کے شانوں پر سے گر گئے۔ ناہید تیز قدم اٹھاتی ہوئی موٹر کی طرف چل دی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ دماغ سنسنار ہوا تھا۔ اس نے جیتی جاگتی زندگی کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔

منصور چند لمحوں میں کھڑے رہے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو گیا ہے بادل زور سے گر جا۔ بجلی بے تابی سے تڑپتی اور منصور تیزی سے بڑھے۔ ناہید کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں ہاتھ گرے پتلون کی جیبوں میں ڈالے تھے۔ بلاٹینم کی انگوٹھی کی چھوٹی سی ڈبلی جیب میں پڑی ہوئی ہاتھ کو پچھو کی طرح ڈنک مار رہی تھی۔ ”میں اس انکار کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ انہوں نے اک طویل لمبی سانس لی۔ اور بے چین آہ نے ان کے ہونٹوں پر دم توڑ دیا۔

ناہید کے قدموں میں پھر آزمائش لپٹ رہی تھی۔ لیکن اس نے اسے سختی سے جھٹک دیا۔ وہ بظاہر بڑے مطمئن انداز میں بولی۔

”ایسا سوال کرنے کا نہ آپ کو کوئی حق ہے۔ اور نہ میں جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔“ یہ ناہید کے الفاظ نہ تھے۔ گرم گرم ریت تھی۔ جو منصور کی آنکھوں میں ڈال دی گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کہیں قریب ہی بم پھٹا ہو۔ اور ان کا دل و دماغ اس سے مجروح ہو گئے ہوں۔ ان کے نکلے نکلے ہو گئے ہوں۔ ریزے ریزے ہو گئے ہوں۔ اس وقت منصور کو دل و دماغ کے ان زخموں سے بہتا ہوا چمکیلا خون نظر آ رہا تھا۔ سرخ سرخ گرم گرم خون۔ جوان جوان امنگوں کا خون تھا جو پھیلا جا رہا تھا۔ سبز سبز گھاس پر ہرے بھرے درختوں پر۔ لہرائی بل کھاتی دریائے سسطیر کی لہروں پر۔ سیاہ بادلوں کے تاریک سینے پر انہیں اس خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے موٹر کی جانب بڑھے۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ننگے پاؤں نوکیلے کانٹوں پر چل رہے ہوں۔ قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ ناہید موٹر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ منصور نے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

آج تک منصور کے ساتھ جتنی بار بھی ناہید کو آنے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے اس کے لئے اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر ہی جگہ دی تھی۔ آج پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ کہ یہی اس کی صحیح جگہ

تھی۔ اب تک وہ غلط جگہ پر بیٹھتی چلی آئی تھی۔ لیکن جانے کیوں اسے اس بات کا بڑا دکھ ہوا تھا۔ اس کا زخمی دل تڑپ اٹھا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے کے کونے کو دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی۔ کہ کہیں سینے میں تڑپتے ہوئے جذبات چیخ بن کر نہ نکل جائیں۔ منصور سٹیرنگ پر بٹکے ہوئے بڑی تیزی سے موٹر چلا رہے تھے۔ دونوں قریب تھے۔ لیکن ان کے درمیان جیسے صدیوں کا فاصلہ آچکا تھا۔

گیٹ کے باہر اترتے وقت ناہید نے آخری نگاہ منصور پر ڈالی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور چہرے پر کچھ زردی سی پھیل گئی تھی۔ ناہید کانپ گئی۔ ہنکے ہنکے قدم اٹھاتی جانے وہ کس طرح اپنے پلنگ تک پہنچ گئی۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ اور وہ اسی انداز سے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں۔ ساری تمنائیں۔ ساری آرزوئیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی تھیں۔ اور آنکھیں بھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے ظلم کی شدت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ کوئی تقدیر کی بھول نہ تھی۔ اس نے تو کند چھری سے ان جیتی جاگتی خوشیوں کا گلا خود کاٹا تھا۔ اس نے پانی کے ہوتے ہوئے اپنی انگلیوں کو ترسا ترسا کر مارا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ دماغ میں اک قیامت مچی ہوئی تھی۔ ذہن میں شور اٹھ رہا تھا۔ جیسے کہیں ماتم ہو رہا ہو۔ کسی جواں مرگ کی میت پر سینہ کو پی ہو رہی ہو۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور بستر پر گر گئی۔ خشک آنکھیں تر ہو گئیں۔ اور بتے ہوئے آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگ گیا۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ آج سب سے زیادہ غصہ اسے اپنی ماں پر آ رہا تھا۔ اس کا بی چاہ رہا تھا۔ کہ اس کی نعش قبر سے اکھاڑ لائے۔ اور اس سے پوچھے۔ کہ تو ماں ہے یا ڈاکین۔ تو نے مجھے جنم کیوں دیا تھا۔ پیدا ہوتے ہی گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ حلق میں زہر کیوں نہ پکادیا تھا۔ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے اسے زندہ رکھ کر کیوں ظلم کیا تھا۔ اسے ایسے معلوم ہوا جیسے اس کی ماں بچ اس کے سامنے کھڑی ہو۔

”ماں“ اس نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ ”تو بڑی ظالم ہے ماں۔ تو نے تاجے کی سرنخی کو طمع سے چھپانا چاہا۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ طمع تاجے پر کتنی دیر ٹھہر سکے گا۔ تو طوائف تھی۔ اپنی بیٹی کو شرافت کے لبادے میں چھپا دیا۔ لیکن یہ لبادہ کب تک اوڑھا جاسکتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا۔ تو نے کچھ پر اس خیال سے سفید چادر ڈال دی۔ کہ کچھ نظر نہ آئے اتنا بھی نہ خیال کیا۔ کہ اجلی اجلی چادر پر کچھڑ کے نمایاں دھبے کتنے بڑے معلوم ہوں گے۔ چھپائے نہ چھپ سکیں گے۔ ماں تو جب تک زندہ تھی۔ میرے لئے اک جیتا جاگتا عذاب تھی۔ مگر کبھی تو نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ تو میری خوشیوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئی۔“

آنسو اب بھی روانی کے ساتھ اس کی خوب صورت آنکھوں سے بہہ رہے تھے اس کا تکیہ بھیگ چکا تھا۔ اس کی روح جذبات کے سینچے پر چڑھی ہوئی تھی۔ منصور کے بغیر زندگی ویران تھی۔ اجیرن تھی۔ یہی سوچ سوچ کر

اس کا دماغ تپ رہا تھا۔

اسے ماں کی شادی کا قصہ فرضی معلوم ہونے لگا۔ فیروز کے جیلے کانوں میں گونجنے لگے۔ ”تو رنڈی کی لڑکی ہے۔ تو گناہ کی تخلیق ہے۔“

ماں نے واقعی اک کمائی کھڑی تھی۔ اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے۔ اس کی ذہنی تسکین کے لئے۔ اس کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اس کی ماں رنڈی تھی۔ اور وہ اس رنڈی کے گناہ کا شمر۔ سوچتے سوچتے وہ رونے کو بھول گئی۔ اور اسے کچھ یونہی سا مبر آ گیا۔ جو میت کے اٹھ جانے کے بعد پسماندگان کو آجاتا ہے۔

.....○.....

کے اندر سے وحشت نکلتی رہی تھی۔ اپنے آقا کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔

”میں کیا چھ رہا تھا۔“ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا سرکار۔“

”سرکار کے بچے۔“ وہ گرجدار آواز میں بولے ”تو کیوں تنگ کرتا ہے۔ کیوں ستاتا ہے مجھے میں تجھے

مار ڈالوں گا۔“

شمو خوف سے کانپنے لگا۔ آج آقا کو کیا ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ”پھر ستائے گا۔“ وہ اس کی طرف لپکے۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے پیشانی پر پڑے تھے۔ انہوں نے شمو کا گریبان پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

شمو دوڑ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ منصور نے اک زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن اس قہقہے سے دیوانگی شرح تھی۔ شمو حیرت ڈراور ہشیمان کے طے جلتے جذبات سے ہانپ رہا تھا۔

”بزدل ڈر گیا۔“ منصور زور سے ہنسے ”ادھر آ۔“

وہ ڈرنا ڈرنا قریب آ گیا۔

”کیوں بھاگا تھا تیا۔“ منصور نے شمو کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھا۔ منصور کا ذاتی ملازم تھا۔ اور قریباً پانچ سال سے وہ ان کی خدمت کر رہا تھا۔ اس کا فرض منصور کا لباس تبدیل کروانا۔ اور ان کے ڈر سنگ دم کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اسے اپنے آقا سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ قریباً انہی کا ہم عمر تھا۔ اور اسی قہر عتاکر بلند چھتوں تلے اس کا بچپن گزرا تھا۔ جوانی آئی تھی۔ اس کا باپ دادا اس خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے۔

”تیا کیوں بھاگا تھا۔“ منصور نے اسے جھنجھوڑا۔

”سرکار۔“ وہ سہم کر انہیں دیکھنے لگا۔

”تو مجھے جلا دیتا ہے۔“

”نہیں سرکار۔“

”میں ظالم ہوں۔“

”نہیں سرکار۔“

”مجھ میں بڑی برائیاں ہیں۔“

”نہیں سرکار۔“

”تو پھر تو کیوں بھاگتا ہے۔ مجھ سے کیوں کتراتا ہے۔ بول۔“ منصور نے اسے پھر جھنجھوڑ ڈالا۔ شمو ہاتھ

۱۱

”کیوں تنگ کرتے ہو شمو۔“ منصور نحیف آواز میں بولے۔ وہ آنکھیں بند کئے۔ مسہری پر چت پڑے تھے۔

”سرکار۔“ شمو ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”جو توں کے تھے کھول رہا ہوں۔“

وہ مسہری پر بوٹوں سمیت پڑے تھے۔ بڑی حیرانگی سے انہوں نے پہلے شمو کو اور پھر اپنے پیروں کو دیکھا۔

”شمو میں سو گیا تھا کیا۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

”شاید سوئے ہوئے ہی تھے سرکار۔“ وہ مودبانہ بولا۔ ”مجھ نہ بھر سے آپ کو پونی پڑے دیکھا میں نے سمجھا۔ آپ سوئے ہوئے ہیں۔ سرکار اس لئے جوتے نہ اتارے کہ کہیں نیند خراب نہ ہو۔“

منصور کو جیسے کوئی ڈرنا خواب یاد آ گیا ہو۔ کمرے میں ملگجاسا اندھیرا چھا رہا تھا۔ بادل برس کر مطلع صاف ہو چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے خشکی بڑھ گئی۔ بھیگی ہوئی ہوائیں۔ کچھ معطری تھیں۔ منصور نے کروٹ بد لانا چاہی۔ سارا جسم شل تھا۔ انگ انگ میں درد کی نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اور ٹھنڈک کے باوجود سارے کپڑے پسینے سے تر ہو رہے تھے۔ انہیں اتنا یاد تھا۔ کہ ناہید کو گھر پہنچانے کے بعد وہ قصر رعنا کے پورچ میں کار ٹھہرا کر اندر آئے تھے۔ مسہری پر کس وقت گرے۔ یہ انہیں ہوش نہ تھا۔

”میں سویا ہوا تھا شمو۔“ انہوں نے شمو کو گھور کر دیکھا۔ شمو سہم کر کھڑا ہو گیا۔

”شائد سرکار۔“

”شاید کیا۔ تیا کیوں نہیں۔“ وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شمو ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”آپ لے لے سانس لے رہے تھے سرکار بڑے بڑے مگرے سانس۔“ وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔ منصور

باندھے کھڑا قہر کانپ رہا تھا۔ کیا ہو گیا آقا کو۔ اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔

”جاؤ“ منصور نے اسے چھوڑ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ انہیں پکڑ سا آگیا۔ شمو انہیں سارا دینے کے لئے جلدی سے بڑھا۔

”چلے جاؤ“ منصور تنگی سے چیخے۔ کھڑے رہنا دشوار تھا۔ مسری کے تکیے کا سہارا لیا۔ شمو خواب گاہ سے نکل گیا۔ لیکن پردے کی اوٹ سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا۔ کہیں سرکار گر نہ جائیں۔

منصور بڑی دیر تک کھڑے رہے۔ پھر بے تابی سے ٹپکنے لگے۔ کسی پہلو قرار نہ آیا۔ کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی آبنوی میز پر قیمتی گلدان میں رنگارنگ پھولوں کا گلہستہ پڑا ہوا تھا۔ وہ بے خیالی میں پھولوں کی پتیوں کو چوتے رہے۔ ان کی آنکھوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ بال بھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

بڑی تناس سے خریدی ہوئی انگوٹھی جس کا سفید رنگ امیدوں کی طرح چمک رہا تھا۔ ان کی پتلون کی جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے جیب سے انگوٹھی نکالی۔ سفید ڈبی میز پر رکھ دی۔ اور انگوٹھی کو چند ثانیے دیکھتے رہے۔ ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ان پر پھر اک جھوٹا سی کیفیت طاری ہو گئی۔ غصے سے انگوٹھی کو دیوار پر دے مارا۔ انگوٹھی دیوار سے ٹکرائی۔ اک دم دم سی صدا بلند ہوئی۔ اور وہ اچھل کر ان کے قدموں میں آگری۔ انہوں نے پیر انگوٹھی پر رکھ دیا۔ اور پوری طاقت سے اسے کچلا۔ وہ مونے قالین میں دھنس گئی۔ انہوں نے پیر ہٹایا۔ چپکتے ہوئے ہیرے والی انگوٹھی قالین کے نرم نرم بالوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اور ہیرا اشرا ت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں انہیں انگوٹھی پر پیار آگیا۔ وہ ان کی مقدس محبت کی یاد گار تھی۔ وہ ناہید کی امانت تھی۔ اور اسے پاؤں تلے روند کر انہوں نے بڑا ظلم کیا تھا۔ جھک کر انہوں نے بڑی جاہت سے انگوٹھی اٹھالی۔ ڈبیہ میں بند کی۔ اور الماری میں رکھ دی۔ اپنی حماقت پر انہیں رنج ہو رہا تھا۔ دماغ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ وہ بہترین گریں گئے۔ جیسے زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار دی ہو۔ اور واقعی انہوں نے آج زندگی کی سب سے بڑی بازی ہاری تھی۔

وہ پولو کے بہترین کھلاڑی تھے۔ وہ درندوں کے شکاری تھے۔ کسی میدان میں انہیں شکست نہ ملی تھی۔ لیکن آج زندگی کے میدان میں وہ ایک کمزور سی لڑکی سے ایسی مات کھا کر آئے تھے۔ کہ دنیا ما فیہا کی ہوش ہی نہ رہی تھی۔

رات انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔ شمو کو سختی سے ہدایت کی۔ کہ کوئی ان کے کمرے میں آنے کی جرأت نہ کرے۔ شمو نے جو کچھ ان کی حالت دیکھی تھی۔ محل کے سب نوکروں کو کہہ سنائی۔ نوکر اور دیگر افراد دودھ و دوا

چار کھڑے سر جوڑے چمے گونیاں کر رہے تھے۔ کوئی بھی ان کے جنون کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ اور نہ ہی کسی کو ان کے پاس جانے کی جرأت ہو سکی۔

رات گزر رہی تھی۔ آج رات بھی ان کے مقدری کی طرح سیاہ تھی۔ خواب گاہ کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جگہ بزرگ کے مہین پردے ابھی تک لہرا رہے تھے رات کو مونے پردے بھی مگر ادینے جاتے تھے۔ لیکن آج کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ ہی منصور کو انہیں گرانے کا ہوش تھا۔ وہ ناہید کے انکار کے اچانک اور جانگسل صدمے سے پاگل سے ہو رہے تھے۔

انکار کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

”قتبائی خلیجیں“ انہوں نے سوچا۔ ”لیکن انہیں پانا جاسکتا تھا۔ یہ تو اتنی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر کیا وہ کسی اور کو“ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی ان کا دل چیخ اٹھا۔ ”نہیں ایسا ہرگز نہیں۔“ جھوٹے مکار و عبا ز دل۔ تو نے ہی مجھے ڈوبا یا“۔ منصور سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے۔ ”تو اتنا جھک گیا۔ کہ تجھے پاؤں تلے روند ڈالا گیا۔ تیری وقت خاک میں ملا دی گئی۔ تجھے حقیر زے کی طرح مسل ڈالا گیا“۔

ہیکے ہیکے خیالات نے منصور کی پریشانی جنون کی حدوں تک پہنچادی۔ ان کی حالت مخدوش ہو گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ شمو دو ایک بار کچھ کھلانے کیلئے بڑی ہمت کر کے ان کے پاس گیا۔ لیکن انہوں نے بھری ٹرے الٹ دی۔ برتن جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئے۔ اور ٹوٹے ہوئے برتنوں کو دیکھ کر انہیں اپنا دل یاد آیا۔ جو ان سے کہیں زیادہ چور چور تھا۔

ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے گرتی گئی۔

اور اس گرتی ہوئی حالت کو شمس نے سنبھالا دیا۔ وہ نوکروں کے منع کرنے کے باوجود ان کے پاس گئی۔ ان کی حالت دیکھ کر اسے دلی صدمہ ہوا۔ رنگ پیچا پڑ چکا تھا۔ بال پیشانی پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ ہونٹوں پر خشک پیڑیاں جمی تھیں۔ اور روشن اور کشادہ آنکھوں میں چمک کی جگہ ایک خوف ناک غمراؤ تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے بڑے پیار سے انہیں ہسلا یا۔ بڑی دیر تک ان کی خوشامدیں کرتی رہی۔ چائے منگوائی زبردستی انہیں پلائی جانے کیا جاو تھا۔ شمس کی باتوں میں..... کہ منصور بھولے بھالے بچے کی طرح اس کی باتیں مانتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ انہیں تیار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔

منصور دو دن بعد اپنی خواب گاہ سے باہر نکلے۔ محل کے دیرینہ خدام کے لٹکے ہوئے چروں پر بشارت آگئی۔ اپنے محبوب آقا کی پریشانیوں سے وہ سب پریشان تھے۔ گوان کے پاس ان پریشانیوں کا مداوا نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ کوئی وجہ جانتے تھے۔ پھر بھی یہ ان کی عقیدت مندی تھی۔

پھر شمس نے معمول ہی بنالیا۔ وہ ہر روز چار بجے شام آتی۔ منصور تیار ہوتے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے

جاتی۔ کبھی آبشار پر کبھی دریائے سطیر کے کنارے کبھی کسی پرواق ہوٹل میں۔ کبھی کلب شمس کی کوششوں سے منصور کے ہونٹوں کی چھنی ہوئی مسکراہٹ توند لوٹ سکی۔ ان کی آنکھوں کی لازوال چمک توند عود کر آسکی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا۔ کہ جذبات کا ظالم کسی حد تک ختم گیا۔ شمس نے ان کے احساس کو چمکایا۔ اور وہ اس پر خار راستے پر پھر سے گامزن ہو گئے۔ بے دلی کے ساتھ۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اب انہوں نے نوکروں پر بلاوجہ برسنے چھوڑ دیا۔ اور ان کی جینو نانہ حرکتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور بظاہر بڑے پرسکون نظر آنے لگے۔

اور بڑے دنوں بعد ناہید دفتر آئی۔ وہ دفتر آنے پر مجبور تھی۔ یہاں وہ کسی اور کو نہ جانتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے اسے جدوجہد کرنا ہی تھی۔ اس دوران میں اس نے کئی بار کام چھوڑ دینے کے متعلق سوچا تھا۔ لیکن یہی ایک محفوظ جگہ تھی۔ جہاں وہ اپنی عزت چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کا قیامت خیز حسن۔ اور اس کی بھرپور جوانی اس کے لئے اک مستقل خطرہ تھی۔ جب سے شیریں نے بیگم رحمان کے سامنے ناہید کی معافی کا جھوٹ موٹ قصہ گھڑا تھا۔ اس کا لفتات بھی محض رسمی ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اب ڈاکٹر کے گھر کا سہارا بھی جا تارہا تھا۔ ان سارے حالات کے پیش نظر وہ یہیں نوکری کرنے پر مجبور تھی۔

تقریباً دوپہر کی غیر حاضری کے بعد آج وہ دفتر آئی۔ یہ عرصہ اس نے جس کش مکش اور ذہنی غلبان میں گزارا یہ کچھ وہی جانتی تھی۔

محل کی بالائی بالائی میں منصور جیسے کوئی بڑا ہی دقیق مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں ستون کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ اور قصر عمارت کے پھاٹک کے قریب انہیں ناہید کا سایہ نظر آیا۔ ناہید آ رہی تھی۔ سرخ بجری والی سڑک پر بڑے محتاط قدم رکھتے ہوئے آ رہی تھی۔ اس نے ہلکے بزرگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ بالوں کی آوارہ لٹیں حسب سابق نورانی پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ دھوپ تو اتنی نہیں تھی۔ شاید آنکھوں کی سوزش کو چھپانے کیلئے اس نے چشمہ لگا رکھا تھا ہاتھ میں چری سیاہ بیگ تھا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

منصور نے اسے دیکھا۔ جمع کی ہوئی صبری ساری قوتیں منتشر ہو گئیں۔ زبردستی مسلط کیا ہوا سکون جاہ ہو گیا۔ ان کا سر چکرانے لگا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو قہقہہ کر کر پی بیٹھ گئے۔ طوفان ایک دفعہ پھر اٹھ رہا تھا۔ آندھیاں پھر امنڈ رہی تھیں۔ زلزلے پھر جھٹکا دے رہے تھے۔ شمس کی بڑی محنت سے کھڑی کی ہوئی دیواریں دھڑا دھڑا کر رہی تھیں۔

ناہید نے دفتر پہنچ کر پچھلا کام نکالا۔ وہ کام دیکھ رہی تھی۔ اور اعجاز اس کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کئے جا رہا تھا۔

”کیا بتاؤں مس ناہید..... آپ تو اتنے دن غیر حاضر رہیں۔ نواب صاحب کی حالت بڑی مخدوش ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں پچھلے چنگے اس دن سیر سے لوٹے ہیں۔ پھر جانے کیا ہو گیا۔ ہنسی ہنسی باتیں کرنے لگے۔ نوکروں کو یونی ڈانٹنے لگے۔ جس دن بارش ہوئی اس دن کی بات ہے یہ۔“

اعجاز کی باتیں پچھلے ہوئے سیرے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ وہ بظاہر کاغذوں کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ لیکن اس کا سکون تیسرے نرس ہو کر رہ گیا تھا۔

”اس دن مجھے بلا بھیجا۔ جب میں گیا۔ تو غصے میں آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں بولے۔ کس نے بلایا ہے تمہیں میں چپ چاپ واپس پلٹنے لگا۔ تو اور بھی غصہ آ گیا۔ انہیں کہنے لگے۔ اب جا کیوں رہے ہو۔ عجیب حالت تھی ان کی جانے کیا ہوا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ بڑی مخدوش حالت رہی چند دن انہیں دیکھ کر دل پھٹا جاتا تھا۔“

”مجھے بڑا کام کرنا ہے اعجاز صاحب“ وہ بڑی رکھائی سے بولی۔ اعجاز خفیف ساہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اس کی باتیں شعور میں زہریلے کیڑوں کی طرح ڈنگ مار رہی تھیں۔ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ منصور کی اس حالت کی وہی تو ذمہ دار تھی۔ اپنے عیب دار ماضی کو چھپانے کیلئے اپنی ماں کی طوائفیت کے گھناؤنے چہرے کو چھپانے کیلئے اس نے منصور کو لوٹ لیا تھا۔ تباہ کر دیا تھا۔ کچل ڈالا تھا۔ وہ اتنی انجان نہ تھی۔ کہ منصور کی اس حالت کو کسی اور بات پر یا حادثے پر محمول کرتی۔ وہ مجرم تھی۔ اور اب اسے احساس جرم بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ اور پھر چند دن جو اس نے گزارے تھے۔ ان کی خلش اور اضطراب اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ منصور، وہ ان کے بغیر زندہ رہنا تو درکنار مر بھی نہ سکتی تھی۔ اس نے انکار کر کے صرف اپنے آپ پر ہی نہیں منصور پر بھی ایسا ظلم کیا تھا۔ جسے خدا بھی معاف نہیں کرتا۔

”میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس نے معمم ارادہ کر لیا۔ ”میں اپنے ماضی کو ان کے سامنے نکال کر دوں گی۔ اپنی نسبی پستی کو ان کے سامنے برہنہ کر دوں گی۔ پھر فیصلہ وہ خود کریں گے۔ چاہے تو اس بے نقاب ماضی کے گھناؤنے اور مکروہ چہرے کو دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ حسب نسب کی برہنگی کو حقارت سے ٹھوکر مار دیں۔ اور چاہے بڑے احترام سے ان کی ستر پوشی کیلئے اپنا وسیع دامن پھیلا دیں۔ نتیجہ محرومی ہو یا کامرانی۔ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ وہ اس فیصلے سے مطمئن ہو کر کام میں لگ گئی۔

شام کے چار بجنے والے تھے۔ وہ ابھی تک اپنے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اک نگاہ گھڑی پر ڈالی۔ اور اک عزم میم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ لمبے یونی کھڑی رہی۔ اور پھر جلدی سے پردہ اٹھا کر باہر آمدے میں آگئی۔ سامنے کے کمرے سے ہوتی ہوئی وہ پچھلے برآمدے میں نکل گئی۔ اور بڑی تیزی سے بل کھاتے ہوئے سنہری ریلنگ والے زینے کی طرف بڑھی جگہ تھی۔ جہاں اس کی محبت نے جنم لیا تھا۔ جہاں اس کا سادہ اور

معصوم دل محبت کی کش مکش سے آگاہ ہوا تھا۔ وہ چند سینکڑ زینے کے پاس ٹھہری اور تخیل کے پردوں پر زینے پر کھڑے ہوئے اپالو کے مجسمے کو دیکھتی رہی۔ قدم اٹھے۔ زینہ ملے کر کہ وہ چوڑی گیلری میں پہنچ گئی۔ خواب گاہ کے باہر شوپہرے دار کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے منصور کے بارے میں شمو سے پوچھا۔

”سرکار اندر ہیں۔“ وہ سسے ہوئے لمبے میں آہستگی سے بولا۔

”میرے آنے کی اطلاع کر دو۔“ وہ اپنے سیاہ چشمے کو چھوٹے سے ریشمی رومال سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

”لیکن مس صاحبہ۔“ شوخوف زدہ ہوا تھا۔

”لیکن کیا۔“ اس نے شمو کے سراپا کو گھورا۔

”آج سرکار کو پھر دورہ پڑا ہے کسی سے نہیں ملتے۔ طبیعت بڑی خراب ہے ان کی۔“ شمو نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے۔“ ناہید نے تحکمانہ انداز سے کہا شوڑتے ڈرتے خواب گاہ کے دروازے کی طرف گیا۔ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ ناہید دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔ اس کاچی چاہا۔ کہ بھاگ جائے۔ وہ منصور کے سامنے کچھ نہ کہہ سکے گی۔ ایک لفظ نہ کہہ سکے گی۔ واپس چلی جائے۔ وہ ابھی ارادہ کر رہی تھی۔ کہ منصور کی گردار آواز آئی۔

”ان سے کہہ دو چلی جائیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔“

ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر تاریک عماروں میں پھینک دیا ہو جہاں صاف ہوا کی پہنچ نہ ہو۔ جہاں زندگی نے کبھی جھانکا نہ ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی زہریلی گیس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ وہ بے حس و حرکت چند لمبے کھڑی رہی۔ احساسِ ندامت و شکست نے اسے جھنجھوڑا۔ شومنہ لٹکائے باہر آ گیا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ناہید گیلری پار کر کے زینے پر پہنچ گئی اس کی دنیا تیر و بالا ہو چکی تھی۔ گرتی ہوئی عمارتوں کے لمبے سے اٹھتی ہوئی دھول سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

جائے کیوں منصور کو اپنے وحشیانہ سلوک پر ندامت سی ہوئی شمرے کے غلوں نے انہیں سنبھال دیا تھا۔ اپنا وقت ضائع کر کے وہ ہر روز ان کے پاس آتی تھی۔ انہیں سیر کے لئے لے جاتی تھی۔ ان کی دلچسپی کیلئے نئے نئے راستے تلاش کرتی تھی۔ اور آج انہوں نے اسے اس بری طرح جھڑک دیا تھا۔ یہ نوانیت کی توہین تھی۔ دوستی کا پیمانہ تھا۔ ابھی بیس ہو گئی۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ جلدی سے اٹھے۔ بکھرے بالوں کو درست کیا۔ جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اور کوئی پانچ منٹ بعد وہ تیزی سے چکر کھاتے ہوئے زینے سے اتر رہے تھے۔ شمرے

زینے پر کھڑی تھی۔ اس کی سفید موٹر پورچ میں تھی۔

بغیر کوئی بات کے منصور خفیف سے اس کے ساتھ چل دیے شمرے کو ر آمدے میں بیٹھے ہوئے ملازم سے معلوم ہوا تھا کہ آج ان کی طبیعت پھر خراب ہے۔ اس لئے اس نے بھی کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھی ان کے ساتھ ہی وہ چپ چاپ واپس اتر آئی۔ دونوں خاموشی سے موٹر میں بیٹھ گئے۔ موٹر جب قصر عتا کے پھاٹک کے قریب پہنچی تو ناہید ایک درخت کا سارا لے کھڑی تھی۔ منصور شمرے کے پہلو میں بیٹھے تھے شمرے موٹر ڈرائیو کر رہی تھی۔ موٹر تیزی سے گزر گئی۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے موٹر سڑک پر سے نہیں اس کے دل پر سے گزر گئی ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندر میرا اچھا گیا اور اس اندر میرے نے کئی حقیقتوں کے چہرے روشن کر دیئے۔

شمرے و منصور منصور و شمرے دو نام بڑی تیزی سے گردش کر رہے تھے ہلکی کے دو پاٹ تھے یہ دو نام جن میں ناہید پس جا رہی تھی۔

راستہ بھر منصور شمرے کی دریاوی پر غور کرتے رہے۔ آج وہ انہیں سلطان پور کی حسین آبشار پر لے گئی۔ قدرت کا حسن بھی منصور کو اتنا متاثر نہ کر سکا۔ جتنا شمرے کے کردار نے کیا تھا۔ رات کا کھانا پچھوٹل میں کھایا اور تقریباً بارہ بجے وہ انہیں خواب گاہ تک پہنچا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

منصور اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ اور کئی گھنٹے اس کی قربت میں رہے تھے۔ لیکن ان کا دل ابھی تک اک گراں بارو جو سے دبا ہوا تھا۔ ضمیر کی جھین تھی۔ جو چین نہ لینے دے رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے شمو نے انہیں کچھ بتایا ہی نہ ہو۔“ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے شمو کو آواز دی۔ وہ مستعد سپاہی کی طرح دروازے کے باہر ان کے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

”سرکار نے یاد فرمایا۔“

”ہاں۔“ منصور نے سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا ”شمو شام تم نے میرا جواب مس صاحب کو پہنچا دیا تھا۔“

”نہیں سرکار۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔“ شمو خاموش ہو گیا۔

”وہ کیا“ انہوں نے لائٹ سے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تو خود ہی باہر کھڑی تھیں۔ سرکار انہوں نے خود ہی جواب سن لیا تھا۔“

”کہاں کھڑی تھیں۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔ شمرے ان کی نظر میں بلندیوں پر اڑ رہی تھی۔ وہ اس کے اخلاق کے سدھانے ہوئے۔ جس نے اتنی تلخی کو اپنی شیریں مسکراہٹوں میں ڈوبا دیا تھا۔

”سرکار دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ جب میں باہر نکلا۔ تو وہ تیزی سے زینے کی طرف چل دیں۔ سرکار ان کا رنگ خوف ناک طور پر زرد تھا۔ وہ کانپ رہی تھیں۔ ستون کو پکڑ لیا تھا۔ ورنہ گر جاتیں۔“

شمو کے جا رہا تھا۔ اور منصور سوچ رہے تھے۔ کہ شمر نے اپنی بگڑی ہوئی حالت پر اتنی جلدی کیسے قابو پایا تھا۔

”لیکن انہوں نے مجھ سے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔“ وہ سرگٹ کاش لگاتے ہوئے بولے
 ”آپ ان سے ملے تھے سرکار“ شمو بڑی حیرت سے بولا۔ منصور کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔
 ”ابھی تو تمہارے سامنے گئی ہیں۔“ منصور نے اس کی حیرانگی دور کرنے کیلئے کہا۔
 ”وہ..... یہ“..... اس کی زبان لکت کھا گئی۔ منصور کے ذہن کو اک جھٹکا سا لگا۔

”کیا بات ہے شمو۔“

”وہ یہ تو نہیں تھیں سرکار۔ وہ تو دفتر والی مس صاحبہ تھیں۔ جنہیں میں اس دن آپ کا خط دینے گیا تھا۔“

”ناہید تھیں۔“ سرگٹ ان کے ہاتھ سے چھٹ گیا۔

”جی سرکار۔“ جبکہ کر جلا ہوا سرگٹ اٹھاتے ہوئے شمو بولا۔

”تم نے پہلے کیوں نہ بتایا شمو۔“ انہوں نے چیخ کر کہا ”اف۔“

شمو ڈر کر باہر نکل گیا۔ وہ سمجھا شاید آقا کو پھر دورہ پڑا ہے۔ اور اتنے دنوں سے وہ سمجھ گیا تھا۔ کہ تمنا ان کے دورے کا سب سے بڑا علاج ہے۔

منصور کو کچھ نہ سمجھ آ رہا تھا۔ کہ کیا کریں۔ شمر ہر روز چار بجے شام انہیں لینے آیا کرتی تھی۔ اور آج بھی انہوں نے شمر ہی سمجھ کر ترش کلامی سے کام لیا تھا۔ شمو کے انکشاف سے وہ شمر دورہ گئے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں بے کار ہو رہی تھیں انہیں صرف یہی احساس تھا۔ کہ وہ کسی معصوم کے جذبات کے قائل ہیں۔ کسی بے گناہ کے غلوں کے غاصب ہیں۔ وہ دیر تک کمرے کے وسط میں کھڑے بے مقصد خالی ہاتھوں کو ملتے رہے۔ وہ ٹچلا ہونٹ سختی سے دائیوں تلے دبائے ہوئے تھے۔

”وہ آئی تھیں۔ کیوں آئی تھیں۔“ ان کے شعور میں ان سوالوں سے گرہیں پڑ رہی تھیں۔

”شاید تجدید محبت کیلئے۔“ یہ خیال جانفزا تھا۔ لیکن ان پر اپنے ہیمانہ سلوک کا خیال کر کے لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ گھنٹہ بھر تذبذب کے عالم میں کھڑے اپنے ہاتھوں کو مسلتے رہے۔ پھر تیزی سے خواب گاہ سے باہر نکل گئے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ وہ اس وقت منصور کو آسمان کے دل کا گمراہ گھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ننھے ننھے چمکتے ہوئے ستارے فلک کی چھاتی کے بے شمار زخم معلوم ہو رہے تھے۔ اور خشک چاندنی بلند ہست پر بیوگی کی سفید چادر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ جلدی سے گیرج کی طرف گئے۔ موٹر نکالی۔ قصر عتا کے پھاٹک تک گئے موٹر جھٹکے کے ساتھ روک

لی۔ گھڑی دیکھی ڈبڑھ بج رہا تھا۔ رات کے تاریک سے میں ایک نوجوان اور اکیلی لڑکی کے پاس جا نا دیا لوں کی نظروں میں معیوب تھا۔ وہ ناہید کے لئے چھین ہوئی نظروں اور طنزیہ باتوں کا سامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔

وہ بے قراری سے قصر عتا کے چمنوں میں ٹھلنے لگے۔ ان کا زخم خوردہ دل اس ناگہانی صدمے سے تڑپ اٹھا تھا۔ ان کی پھر درد روح اس عظیم بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ان کے دماغ سے دھوئیں اٹھ رہے تھے۔ وہ اپنے سر کو بار بار جھک رہے تھے۔ اپنے وحشیانہ سلوک پر انہیں بچھتاوا آ رہا تھا۔ وحشیانہ سلوک اور وہ بھی ناہید کے ساتھ۔

رات انہوں نے سر و شمشاد کے بلند و بالا درختوں تلے کھڑے۔ اوجھتی ہوئی روشنیوں پر پھرتے۔ فواروں کے گرد چکر کاتے اور سنگ مرمر کے بے جان مجسموں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتے گزرا۔ دل کا درد برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اور اس کے کچھ کے بیکل کئے ہوئے تھے۔ پانچ بجنے والے تھے سپیدی سحر بھٹ رہی تھی۔ چاندنی کارنگ پیکا پڑ رہا تھا۔ شفق اور چاندنی ایک دوسرے میں حلون کر گئی تھی۔ منصور قصر عتا سے باہر آگئے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر ان کے قدم ہوشل کی جانب اٹھنے لگے۔ وہ غیر اختیاری طور پر درجیب کی جانب چل دیے۔ ناہید سے مل کر وہ جلد از جلد اس نئی غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ ناہید کے کمرے کی نئی روشن تھی۔ منصور بے تابی سے پھاٹک کے سامنے کی سڑک پر ٹھل رہے تھے۔ زندگی اک کاٹانی ہوئی تھی۔ جو ہر پہلو سے مسلسل جھجے جا رہی تھی۔

موسم کچھ گرم تھا۔ یاسینے کی جلتی ہوئی پھٹی کی تپش ناہید کو کمرے میں جس معلوم ہوا وہ باہر چمن میں نکل آئی۔ وہ رات بھر بستر پر بے چینی سے کمرٹیں بدلتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اور ان میں جلتی ہوئی چنگاریوں کی چمک تھی۔ رات بھر کی بے داری نے آنکھوں کی جلن کو اذیت ناک بنا دیا تھا۔ منصور کے الفاظ لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اس کے دل و دماغ کو داغ رہے تھے۔ اس کے دل میں اہل رہے تھے۔

وہ ان کے غیر شائستہ اور تباہ کن رویے پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ اپنی محبت کو کچل دینا چاہتی تھی۔ اپنے عشق کو غارت کر دینا چاہتی تھی۔ اس محبت نے اس عشق نے آج سے اس قدر ذلیل کیا تھا۔ اتار سوا کیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کھلی ہوا میں مٹلتی رہی۔ پھر جانے کیا خیال آگیا۔ وہ قلم پر بیٹھ کر وضو کرنے لگی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی اور کھلی پھولے خاطر خواہ اثر کیا۔ ہلکے نیلے ریشمی گھیر دار فزاک اور اس کی ہم رنگ شلوار اور دوپٹے میں وہ آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی۔ کالار۔ ریشمی باریک سکارف اس کے بالوں میں بندھا ہوا تھا۔

وہ بڑی عقیدت سے سبز گھاس پر بارگاہ ایزدی میں جھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے خشک سوتے اس بارگاہ عالی میں اہل پڑے۔ وہ سجدے میں سر رکھے بڑی دیر تک روتی رہی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھننے میں نہ آتا تھا۔ وہ اس ذات بابر کات کے حضور میں اپنے دل کا سارا اور اپنی ہستی کی ساری جلن آنسوؤں سے مٹا رہی تھی۔ رونے

سے اس کے دل کو کچھ قرار آگیا۔ ہاتھ پھیلا کر اس نے بڑے خضوع و خشوع سے اپنے رب حقیقی سے دعا مانگی۔ رات بھر کی ذہنی جنگ سے بھی وہ منصور کے خیال پر غالب نہ آسکی تھی۔ اس وقت اس نے اپنے اللہ سے امداد مانگی۔ ”یا خدا منصور کی یاد میرے دل سے اسی طرح نکال دے جس طرح میری ان کے دل سے نکالی ہے۔“ یہی اس کی دعا کا مفہوم تھا۔ وہ شاید مستعجاب ہو گئی۔ کیوں کہ وہ منصور کا خیال دل سے نہ بھلا سکی۔ ان کی یاد دل کے ہر گوشے سے اسی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ جس طرح وہ منصور کے ہر حواس پر۔ نہ وہ اسے محو کر سکے تھے۔ نہ وہ کر سکی۔

پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نظریں منصور کی نظروں سے ملیں۔ وہ اک پرانے درخت کے تنے کے ساتھ لگے بڑے محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ناہید گم سم سی دوزانو بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ انہیں اپنے تخیل کا کرشمہ سمجھی۔ لیکن وہ زندہ حقیقت کی طرح سامنے کھڑے تھے۔ ناہید کو اٹھتا دیکھ کر وہ اس کے قریب آگئے۔ ان کا چہرہ اتر ہوا تھا۔ کشادہ پیشانی بوجھل تھی۔ روشن آنکھیں سرخ تھیں۔ اور ان میں اک جہا ہوا آزار تھا۔ وہ بار بار اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیر رہے تھے۔

منصور اتنے قریب تھے۔ کہ ان کی موجودگی کا احساس تشبہ نہیں رہا تھا۔ ”ناہید۔“ انہوں نے اسے یوں پکارا۔ جیسے آکا دینے والی غیریت۔ اور تھکا دینے والی بیگانگی کو ختم کر دینا چاہتے ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہو چکی ہے۔ جسے گرا دینے کا خیال بھی مضحکہ خیز تھا۔

ناہید چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تھلا اٹھی۔ اس کی بیٹگی ہوئی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ ”کل آپ میرے پاس آئی تھیں۔“ منصور کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ ”جی ہاں۔“ اس نے ان پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ اور اس کے لہجے کی تہی کو منصور نے شدت سے محسوس کیا۔

”میں اپنے ہمسا نہ سلوک پر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ دراصل میں نے آپ کو شمشہ سمجھا۔“ الفاظ ان کے حلق میں انک گئے۔ اور وہ متاسف سے کھڑے اپنے بوٹوں سے گھاس کو کچلتے رہے۔ ”شمشہ۔“ ناہید نے طنز یہ کہا۔

”یقین مانئے۔ میں نے آپ کو شمشہ سمجھ کر۔“ منصور کے الفاظ نے جیسے جوا لاکھی کا منہ کھول دیا۔ بارود کو آگ دکھا دی۔ ناہید کا تھکا ہوا دماغ چھٹنے لگا۔ وہ بصد مشکل اپنے آپ کو قابو میں رکھ رہی تھی۔ اس کے گال تھمتھاٹھے تھے۔ اور آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

شمسہ کے پہلو میں منصور کو بیٹھے دیکھ لینے کے بعد ان کی بات کی صداقت پر یقین کرنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔

”یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ نواب صاحب۔ جس کے لئے آپ کو معافی مانگنا پڑے۔“ وہ تہی سے مسکرائی۔ اور جانے کے ارادے سے قدم اٹھائے۔

”میں اپنی خطا کی کافی سے زیادہ سزا بھگت چکا ہوں۔“ انہوں نے بڑھ کر ناہید کا راستہ روک لیا۔ ”جب تک اس غلط فہمی کا زوال نہ ہو جائے میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔“

”غلط فہمی۔“ ناہید کاجی چاہا۔ کہ اک فلک شگاف قہقہہ لگائے۔ اس نے اپنے کو بمشکل روکا۔ پھر بھی بے قابو ہنسی اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ منصور کا دل اچھلا۔ وہ سمجھے ناہید نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ وہ بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یوں پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے شعلوں نے ان کا منہ جھلس دیا ہو۔ ناہید کے لبوں پر ہنسی تھی۔ جس میں دنیا بھر کا سمیٹا ہوا زہر تھا۔ جوا لاکھی کی کھوتی ہوئی آگ تھی۔ ”آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ منصور بے چارگی سے بولے۔

”معافی مانگ کر آپ اپنی جلیل القدر شخصیت کی توہین کر رہے ہیں نواب صاحب۔ آپ نے اپنے حق کا جائز استعمال کیا۔“ وہ ان کی طرف بے باکانہ دیکھتے ہوئے طنز یہ ہنسی۔ ”آپ کا تمل۔ آپ کا وقار۔ آپ کی عزت آپ کی شہرت آپ کو حق دیتی ہے کہ جس سے چاہیں اور جیسا چاہیں سلوک روارکھیں۔ ہم جیسے بے آسرا لوگ آپ کے رحم و کرم پر ہی تو پڑے ہیں۔“

ناہید کی باتیں منصور کے بلند کردار کی تنگی پیچھے پر کوڑے برسا رہی تھیں۔ غلط فہمی دور ہونے کی بجائے پیچیدہ ہو گئی تھی۔ منصور اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکتے تھے۔ اور ناہید کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا اور کانوں سے سنا ہوا واقعہ بھولا نہیں تھا۔ اس کے الفاظ منصور کی چھاتی میں زہر آلود تیروں کی طرح چبھ رہے تھے۔ لیکن وہ بڑے تحمل سے کام لے رہے تھے۔ چپ چاپ ناہید کی باتیں سن رہے تھے۔

”میرے کردار کی ٹوٹ آپ کے ذہن پر اس بری طرح نقش ہو چکی ہے۔“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ان کا سانس سینے میں بمشکل سارہا تھا۔ ”شاید کوئی وقت آئے۔ جب آپ کو یہ نقش اپنے ذہن کا سب سے بڑا داغ محسوس ہونے لگے۔ خیر۔“ وہ قدرے رک کر بولے۔ ”میں صرف آپ سے اک بات پوچھتا ہوں۔“

اور ناہید کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بولے۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ کہ زندگی کے سب سے بڑے تعلق سے لاتعلقی کے بعد آپ کس لئے تعریف لائی تھیں۔“

”اس تعلق کی آخری کڑی بھی توڑنے کے لئے۔“ ناہید نے جلدی سے جواب دیا۔ آج اس کی بے زبانوں کو زبان مل گئی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کا سارا زہرا گل رہی تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ افق پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔

”میں اپنا استعفیٰ پیش کرنے آئی تھی۔“ ناہید نے سفید جھوٹ بولا۔ منصور نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ان کے صبر و قرار پر جیسے بجلی گر گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور آنکھوں کے لال لال ڈورے اور گہرے ہو گئے۔ وہ زور سے چیخے۔

”آپ مجھے ذلیل کرنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ اتنا ذلیل کر لیجئے۔ کہ دل کی کوئی حسرت باقی نہ رہے۔“ وہ اک جھٹکے کے ساتھ پلٹے۔ اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ناہید سانس روکے کھڑی رہی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا۔ کہ زنجیر بن کر ان قدموں سے لپٹ جائے۔ جو اس کے منصور کو اس سے دور لے جا رہے تھے لیکن وہ ایمانہ کر سکی۔ اپنے ہاتھ کی چاروں انگلیاں دانتوں تلے دبائے۔ وہ دور جاتے ہوئے منصور کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور منصور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

.....○.....

ٹانخ۔ ٹانخ۔ ٹانخ۔

گیندر راڈ سے ٹکرا رہی تھی۔

نواب ذوالفقار علی خان کی لندن والی اقامت گاہ کے ایک وسیع کمرے میں بلیر ڈکھلایا جا رہا تھا۔ آج انہوں نے اپنے مشرقی اور مغربی دوستوں کو اپنے عزیز بھتیجے منصور کی آمد پر ایک پر تکلف دعوت دی تھی۔ کھانے کے بعد مہمان ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ کچھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ کچھ بال روم میں جوان جوان بانہوں کے سہارے ڈانس کر رہے تھے۔ کچھ ریفریشمنٹ روم میں تازہ دم ہو رہے تھے۔ اور کچھ اس روشنی سے جگمگاتے طویل و عریض ہال میں بلیر ڈکھیل رہے تھے۔

منصور برابر بار رہے تھے۔ اور بلیر ڈکے چیمپئن کی یہ بار موضوع بنتی چلی جا رہی تھی۔ ”آپ آج کھیل کے موڈ میں نہیں ہیں مسٹر منصور۔“ لارڈ ہیرسن نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”جیسی تو برابر بار رہے ہیں۔ ورنہ مسٹر منصور اور ہار دو متضاد چیزیں ہیں۔“ مس آر تھرا اپنے نائیلان کے خوبصورت لباس میں بڑی جاذب نظر آ رہی تھی۔ اور منصور کی یہ ہار انہیں کھٹک رہی تھی۔

”یہ تو بلیر ڈکے مانے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ورنہ یہ ہار ماننے والے کہاں ہیں۔“ مسٹر پیڑ نے داد کے طور پر کہا۔

کھیل جاری تھا۔ اور میز کے گرد تماشائی بکثرت جمع ہو گئے تھے۔ منصور نے پھر بازی ہار دی۔ تماشائی پھر ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ اور اس خواہ مخواہ کی ہمدردی سے منصور کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ ہار ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ اور وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اب وہ کبھی بھی نہ جیت سکیں گے۔

کھیل پھر شروع ہو گیا۔ منصور بڑی بے دلی سے کھیل رہے تھے۔

”اگر طبیعت ٹھیک نہیں مسٹر منصور تو کھیل ملتوی کر دیا جائے۔“ لارڈ ہیرسن نے راڈ روک کر پوچھا۔

”نہیں کچھ ایسی بات تو نہیں۔“ منصور ہزیمت خوردہ ہنسی ہنسے۔

”تو پھر کبھی سے کیلئے نا۔“ روہی ہیرٹ نے اپنی نیلگوں آنکھوں سے انہیں بڑے پیار سے دیکھا۔ ”آپ کئی بازیاں ہار چکے ہیں۔ یہ بات آپ کے شان شاہان نہیں۔ آپ تو اتنے بڑے کھلاڑی ہیں۔“

”ضروری تھوڑا ہی ہے مس ہیرٹ۔“ منصور نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کہہ بڑا کھلاڑی ہریازی جیت لے۔“

منصور نے بڑی حسرت سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں مایوس تمناؤں کی تڑپ تھی۔ راڈ آہنگی سے رکھ کر وہ میز سے ہٹ گئے۔ کھیل کچھ دیر کے لئے ملتوی ہو گیا۔ وہ تلخ سی ہنسی ہنستے ہوئے ریفر شمنی روم کی طرف چلے گئے۔

”آج کل کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں مسٹر منصور۔“ جیمز نے ان کے جانے کے بعد کہا۔

”واقعی۔“ مس برگنز ابولیں۔ ”کل مسز میکالے کے ہاں بھی کچھ اچھے اچھے تھے۔ میں نے ڈانس کے لئے کہا۔ تو بڑی خوبصورتی سے ٹال گئے۔“

”پہلے تو ان کی آمد سے بڑی چل پل ہوا کرتی تھی۔ اتنے ہنس کچھ انسان کا یوں چپ ہو جانا واقعی تعجب کن ہے۔“ مسٹر اسٹیلین نے اضافہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں زیادہ مہمانوں کی تعداد ان کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ مس روہی ہیرٹ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی خوبصورت نیلی نیلی آنکھوں میں غم کے سائے ڈول رہے تھے۔ یہ سنہری سنہری بالوں والی سرخ و سفید گڑیا لارڈ ہیرٹ کی اکلوتی صاحب زادی تھی۔ دل ہی دل میں منصور کو چاہے جارہی تھی۔ منصور کی آمد اس کے لئے صد ہا خوشیوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ اور جب وہ چلے جاتے تھے۔ تو روہی کی دنیا کچھ دنوں کے لئے اندھیر ہو جایا کرتی تھی۔ اور پھر ان کے دوبارہ آنے کے انتظار میں تنہی کے دن کاٹا کرتی تھی۔ لیکن اس دفعہ وہ کچھ اس انداز سے آئے تھے۔ کہ روہی کا دل ڈوب کر رہ گیا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ اور وہ اپنا بے تاب دل تھامے منصور کے پیچھے رینجیشنٹ روم میں آگئی۔

بیگم سعید ملک اپنی قیمتی بنارس ساڑھی کا زریں پلو کے ہوئے بلاؤز سے چھلکتے ہوئے سینے کی دلدوز بندشوں پر ڈالے ہوئے منصور کے قریب کھڑی تھی۔ منصور کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ اپنے سوکھے ہوئے حلق کو پانی سے تر کر رہے تھے۔ اور کھڑکی میں خورشید کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔

”کیا بات ہے منصور۔“ بیگم ملک نے پوچھا۔

”پانی پی رہا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”پانی پی رہے ہیں۔ یا کھیل رہے ہیں۔“ وہ ساختہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

”جو کچھ لیجئے“ وہ گلاس پکڑے ابھن تک کھڑے تھے۔

آپ کی مگنی کا کیا بنا منصور۔ ہم تو عثمانی سے انتخاب بیٹھے ہیں۔ اور ہنس دی اور منصور کے چہرے پر ایک اذیت ناک لہر دوڑ گئی۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گر جاتا۔ اگر وہ بلدی سے اسے ٹرے میں نہ رکھ دیتے۔

”ذہنی بھائی تبارہ تھے کہ آپ کی مگنی ہونے والی ہے۔ وہ اپنے بے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

اور یہ بھی تو بتایا تھا کہ آپ کو اپنی پسند کی بہترین لڑکی ملی ہے۔ خورشید قریب آتے ہوئے بولے۔

منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بیگم سعید ملک نے ان کے گلے پر پھری رکھی تھی۔ جو خورشید نے بڑھ کر چلا دی۔ لیکن اس اذیت کے باوجود مسکرا رہے تھے۔

ہم نے سبھا تھا کہ اس دفعہ بیگم بھی ساتھ آئیں گی۔ لیکن آپ اکیلے ہی آگئے۔ بیگم مک اپنے جوڑے میں گھسے ہوئے پھول ٹیک کر تے ہوئے بولی۔

اس دفعہ تو صاف کیا۔ اگر اگلے سال آپ اکیلے آئے۔ تو ہوائی اڈے سے ہی واپس بیج دیا جائے گا کچھ منٹو۔ خورشید نے ان کا شانہ ہلایا۔

بالکل ٹیک۔ بیگم مک نے قفقہ لگایا۔ خورشید نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ منصور بکیمانے سے کھڑے رہے۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتے تھے۔ ایسی تنہائی جس میں ان کے خیالوں کا بھی گذر نہ ہو۔ شور و غوغا سے ان کی طبیعت پریشان ہو رہی تھی۔

نمائندے تعلقات منقطع ہونے پر وہ اپنے دل مضطر کو لیے لندن آ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی ان کی وحشت کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

نمائند اور ان کے درمیان ناچاکی کے علاوہ اک خوف ناک غلط فہمی بھی عامل ہو چکی تھی انہوں نے اس سے معافی مانگ کر یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس دن معاملہ کتنا اُبھا تھا۔ کہ منصور کے لیے اپنا گھر ہی بیگانہ ہو گیا اور وہ پہلی فرصت میں لندن آ گئے۔ یہاں آ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا قدم آگے بڑھنے کی بجائے خود انہیں ہی کچل رہا ہے۔ نمائند سے دوری بھی اذیت ناک تھی اور قربت بھی تکلیف دہ۔

”مسٹر منصور“ روہی ہیرٹ آگئی ”آج ڈانس میں میں آپ کی پارٹنر بنوں گی وہ ان کی ہانوں میں ہانیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”ہم کیوں پیچھے رہیں مسز ملک۔“ خورشید نے مسز ملک کی طرف بازو بڑھا دیا۔ اور وہ اس کے بازو پر جھولتی ہوئی مسکرا دی۔ دونوں ہنستے ہوئے بال روم کی طرف چل دیئے۔

”معاف کیجئے مس ہیئرٹ میں آج ڈانس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔“

منصور نے بڑی شائستگی سے اپنا بازو اس کی سرمرس بانہوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔“ وہ مایوسانہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میری طبیعت پریشان ہے۔“ وہ لمبے درپے سے باہر باغ کی سوئی ہوئی فضا کو گھورتے ہوئے بولی۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے منصور۔“ روہی نے وارفتگی کے عالم میں اپنا نازک ساسر منصور کے چوڑے

کندھے پر ٹکا دیا۔ قیمتی ڈنر سوٹ میں لبوس یہ مشرقی شہزادہ روہی کی نقشہ تمناؤں کا حاصل تھا۔ وہ اس چوڑے

شانے پر سر رکھے مدہوش سی جذبات کی دنیا میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور منصور کو سر دیوں کی وہ دوپہریاں آگئی جب

وہ ناہید کو ہسپتال کے بس شینڈل سے اپنے ہمراہ موٹر میں لے آئے تھے۔ اور ایک موٹر پر جھکا گئے سے ناہید کا سر

ان کے اسی شانے سے ٹکرا گیا تھا۔ کتنا فرق تھا۔ ناہید کے فیئر رادی اور مس روہی کے دانستہ ٹکراؤ میں۔ اس دن

توان پر جذبات کا کیف آور سر چھا گیا تھا۔ ان کی رگ دپے میں مسرت برقی لہرس دوڑ گئی تھیں۔ اور انہوں نے

بیشکی فضا ہے ”کی خواہش بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ اور آج روہی کا بے جان ساسرا انہیں اپنے کندھے

پر اک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔ روہی نے اس طرح

انہیں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”مجھے مایوس نہ کرو۔“

منصور نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا۔ ”میں تمہیں کچھ نہیں دے سکے روہی۔ میں خود قہری دست ہوں۔ مجھ سے

سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔ میرا متاع حیات لوٹ لیا گیا ہے۔ مجھے کنگال کر دیا گیا ہے۔ تمہیں دینے کے لئے

میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یوں دیکھ کر میری بے بسیوں کا تسخیرنا اڑاؤ۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔

میں مجبور ہوں۔ بے بس ہوں روہی۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔“

وہ بے قراری سے ٹٹلنے لگے۔ روہی بڑھی۔ اور اپنی سڈول بانہیں منصور کے گلے میں حائل کرنا

چاہیں۔ مشرق کو مغرب کی اس آزاد روی پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ منصور نے روہی کے اٹھتے ہوئے بازوؤں کو

اپنے ہاتھوں پر ہی تھام لیا۔

”اپنے کوتاہ زان نہ بنائیے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

”میں مایوس ہونا نہیں چاہتی منصور۔“ وہ انداز سپردگی سے ان کی جانب بڑھی۔

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرنے کے قابل نہیں ہوں مس روہی۔“ وہ اسی سنجیدگی سے بولی۔

”منصور۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“ وہ بڑی تمنائے بولی۔

”مجھے افسوس ہے..... کہ میں.....“

”منصور۔“ روہی نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں آپ کی محبت کی بھوکی

ہوں۔“

”مس روہی۔“ منصور مضطرب ہو کر بولی۔ ”انگاروں کو چھوئے کی کوشش نہ کیجئے یہ آپ کو بھی

جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔ جن میں بے شمار پھولوں کو چھوڑ کر خاروں سے نہ اچھٹے۔ ٹوٹی ہوئی بانہوں سے

سارے کی فضول توقع پر قوی بازوؤں کو رد نہ کیجئے۔ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

آپ کے لئے سارا دینے والوں کی کمی نہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر تو مند سارا آپ کو مل جائے گا۔

منصور کے لمبے میں اک رقت تھی۔ اک کرب تھا۔ اک کھولن تھی۔ روہی تمیزی سی انہیں دیکھتی رہی۔

وہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ اور پھر اپنی خوبصورت آنکھوں کو ننھے سے ریشمی رومال سے خشک کرتی ہوئی تیزی سے باہر

نکل گئی۔

لندن کی گہما گہمیوں سے منصور کو چڑھو گئی۔ زلفی انہیں سکاٹ لینڈ لے گئے۔ چند دن اچھے گزروے

اور پھر طبیعت کا چڑچڑاپن عود آیا۔ زلفی وہاں سے لوٹ آئے۔ اور سوزر لینڈ چلے گئے۔ گل پوش وادیوں اور

برف پوش پہاڑیوں نے منصور کے دل کے داغوں کا تسخیرا ڈیا۔ ان کی جلن کو ٹھنڈا نہ کیا۔ زلفی انہیں جگہ جگہ

لے پھرتے رہے۔ پیرس کے ہوٹل۔ افریقہ کے جنگل کوئی بھی توان کی نقشہ مسرت روح کا دوانہ نہ کر سکا۔ چار ماہ

مسلل سکون و چین کی تلاش میں گنوا دینے کے بعد وہ لندن واپس آ گئے۔ قرار کہیں بھی نہ مل سکا۔ پھانس نکالنے

کے لئے انہوں نے ساری کھال چھیل ڈالی۔ لیکن پھانس نہ نکلی۔ وہ چھپے گئی۔ اور مسلسل چھپے گئی۔ اور اس

آوارہ گردی اور صحرائوں کی گلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت دھندلا رہی تھی۔ کنکن اپنی آب و

تاب کھور ہاتھ۔ سونا میلا ہو رہا تھا۔ چاند کو گن رہا تھا۔

زلفی بڑے متشکر تھے۔ کئی بار انہوں نے منصور کو طبی معائنے کے لئے کہا۔ لیکن ہر دفعہ انہوں نے

ہنس کر ٹال دیا۔

”میں کوئی بیمار تھوڑا ہی ہوں۔“

”بیمار نہ سہی کمزور تو ہو رہے ہو۔ چہرہ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔“

”یہ سب آپ کا وہم ہے۔ ورنہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں مجھے۔“

زلفی خاموش ہو جاتے لیکن منصور کی گرتی ہوئی صحت سے وہ بعض اوقات بڑے پریشان ہو جاتے۔

سارا دن منصور نے عجب پریشانی میں گزارا۔ ناہید کو بھلا دینے کے انہوں نے جتنے جتن کئے تھے۔ وہ سب الٹ ثابت ہوئے۔ وہ دن بدن شدت سے یاد آرہی تھی اور منصور کی بھاکے لئے وہ ہوا اور پانی کی طرح ضروری ہو کر رہ گئی تھی۔

اسی شام زلفی کے ساتھ چائے پیتے ہوئے منصور کو چکر سا آگیا۔ ایسے چکر انہیں دو چار پہلے بھی آچکے تھے۔ لیکن آج وہ دیر تک بے ہوش پڑے رہے۔ جب انہیں ہوش آیا۔ تو وہ اپنے بستر پر پڑے تھے۔ اور بوڑھا ڈاکٹر گریگوری ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ زلفی پریشان تھے۔ اور ان کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھے تھے۔ ”فکری بات نہیں مسٹر ڈاکٹر۔ کمزوری ہے۔ ٹانگ استعمال کریں ٹھیک ہو جائیں گے۔“ بوڑھا مدبر ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ لیکن منصور کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردی میں زلفی کی عمیق نظرس کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔

دوسرے دن منصور نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔

”ٹھیک ہونے پر چلے جانا۔ ابھی تمہیں سفر نہیں کرنا چاہئے۔“ زلفی کچھ سوچ رہے تھے۔

”میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔“ منصور ضدی بچے کی طرح چل گئے۔

”منصور“ زلفی ان کے اصرار کو نظر انداز کرتے ہوئے متفکرانہ لہجے میں بولے۔

”جی“ منصور نے لینے لینے جواب دیا۔ کمرہ بیڑے گرم تھا۔ اور باہر دھند چیلی ہوئی تھی۔ ابھی دوپہر کے تین ہی بجے تھے۔ لیکن ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے رات ہو گئی۔ کمرے کی جی جی رہی تھی۔ اور اس کی روشنی دھند کے عکس سے کمزور کمزور سی نظر آرہی تھی۔

”ایک بات پوچھوں۔“ زلفی نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”ٹال تو نہ جاؤ گے۔“

منصور جان گئے۔ کہ وہ کیا پوچھیں گے۔ ان کا دل زور سے دھڑکا۔ اور وہ چپ چاپ لینے رہے۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ وہ کرسی ان کے پیٹک کے قریب کرتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے میں اک

باپ کی بے لوث چاہت اور ایک دوست کا پر غلوص پیار تھا۔

بے اختیار منصور کا پی چاہا۔ کہ زلفی کی چھاتی سے لگ کر اپنے سارے غموں کو اشکوں کے سیلاب میں بہا

ویں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ لاوا باہر نکلنے کے لئے کلبلا رہا تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ پڑا کے پتھر لے سینے کو

جلانے والی سیال آگ اگر بہہ نکلی تو اس کی زد میں آنے والی ہر چیز جل کر خاستر ہو جائے گی۔ اس لئے بڑی

ہمت سے وہ ہر پڑنے والی دراز کا منہ بند کر رہے تھے۔ لاوا اندر ہی اندر کلبلا رہا تھا۔ اور سیال آگ اندر ہی اندر

کھول رہی تھی۔ منصور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے زلفی کا چین و سکون بھی غارت ہو جائے۔

”کیا کسی چٹان سے ٹکرا گئے۔“ زلفی نے زخمی سی مسکراہٹ سے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

منصور دنیا میں انہیں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ اس دفعہ منصور بغیر اطلاع کے آئے تھے۔ اور تقریباً چار ماہ سے انہیں کے پاس تھے۔ زلفی اس کی وجہ تو نہیں جانتے تھے۔ لیکن سمجھ رہے تھے۔ کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ کئی بار کریدنا چاہا۔ لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے ٹال گئے۔

بڑے دنوں کے بعد آج پچھلی دھوپ نکلی تھی۔ مشرقی برآمدے میں ہلکے سبز کپڑے والی خوبصورت آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ کین کے خوبصورت میزوں پر اخبار پڑے تھے۔ موسم پر نکھار تھا۔ حد نگاہ تک حسین مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ دور بر فانی چوٹیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔

زلفی اور منصور آئے سانسے بیٹھے تھے۔ زلفی کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ پڑھنے سے زیادہ اخبار کی کالی کالی سطروں کو گھور رہے تھے۔ خیالات کین اور گھوم رہے تھے۔ منصور میز پر رکھی ہوئی پچھلی طشتری میں پڑی ہوئی آج کی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ کئی خطوط تھے۔ دوستوں کے۔ کارندوں کے۔ یاسمین کے۔ اور سیکرٹری اعجاز کے۔ ہر خط بڑی بے دلی سے پڑھ کر وہ واپس طشتری میں رکھ رہے تھے۔ یاسمین کا خط پڑھ کر ان کے چہرے پر گھڑی بھر کے لئے رونق آگئی۔ بڑے مزے مزے کی باتیں لکھی تھیں انہوں نے۔

”کس کا خط ہے۔“ زلفی نے ان کے چہرے پر بڑے دنوں کے بعد مسکراہٹ دیکھی تھی۔

”باقی کا۔“ انہوں نے خط زلفی چچا کے ہاتھ میں دے دیا۔ زلفی خط پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ اور

منصور نے بے توجہی سے اعجاز احمد کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑا طویل خط تھا۔ وہی فرسودہ باتیں۔ وہی ضروری امور پر تبادلہ خیال۔ وہی حساب کی پڑتال۔ سب روکھی پھکی باتیں تھیں۔ اس کا ہر خط ایسا ہی خشک اور بد مزہ ہوتا تھا۔ کاروباری قسم کا۔

منصور نے بغیر ختم کئے خط طشتری میں رکھ دیا۔ ان کی اپنی زندگی بھی آج کل کچھ اس خطی کی طرح روکھی پھکی گذر رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر ہلکے نیلے رنگ کا لفافہ اٹھانا چاہا۔ لیکن جلدی سے پھر اعجاز کا خط ہاتھ میں لے لیا۔ خط کے آخری پیرا گراف میں انہیں ناہید کا نام نظر آیا۔ ایک ہی سانس میں وہ سارا پیرا گراف پڑھ گئے۔ صرف تین سطور ناہید کے بارے میں تھیں۔

”مس ناہید کچھ بیماری رہتی ہیں۔ شاید مسلسل کام کا نتیجہ ہے۔ یا پچھلے دنوں کے موسم کے جس کا۔

اگر اجازت ہو۔ تو انہیں کم از کم دو ماہ کی رخصت دے دی جائے۔ تاکہ ان کی صحت بحال ہو جائے۔“ منصور

نے سارا خط پھر سے پڑھا۔ صرف یہی سطور ناہید کے متعلق تھیں۔

منصور کو عمر میں پہلی بار اعجاز پر اتنا غصہ آیا۔ کہ وہ اگر قریب ہوتا تو عجب نہیں وہ اس کا گلابی گھونٹ

دیتے۔ ناہید کی صحت گر رہی تھی۔ اور وہ ان سے اجازت مانگ رہا تھا۔ کہ چھٹی دے یا نہ دے۔ فوراً نوکر کو بلا کر

بحری تار دیا گیا۔ کہ ناہید کو چھٹی دے دی جائے۔

غلط تھی۔ وہ فطرت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ جس میں قدرت نے ودیعت کی تھی۔

انہوں نے ناہید کو چاہا تھا۔ اسے پالینے کی آرزو کی تھی۔ یہ آرزو اب بھی اپنی جگہ پر اٹل تھی۔ اسی طرح تھی۔ جس طرح اس سے تعلقات کشیدہ ہونے سے پہلے تھی۔ انہوں نے اپنی اس فطری خواہش کا گلا گھونٹنے کی فضیلت کو شش نہیں کی تھی۔ اس تمنا کا دھارا کسی اور طرف موڑنے کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ گو وہ ناہید کو نہ پاسکے۔ اس کا حصول ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ لیکن یہ تندر خواہش زندہ تھی۔ وہ ان کی ہستی کو چاٹ رہی تھی۔ منصور نے کوئی احتراز نہ کیا۔ اور اس جان دار تو مند خواہش کی خوراک بن گئے۔ ان کی صحت گرتی گئی۔ اور جب اڑے پر زلفی منصور سے الوداع کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے۔ تو زلفی کا دل بے حد پریشان تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا۔

”منصور ہنس ہنس کے جینا سیکھو۔“

اور منصور ہنس دیئے۔ شاید زلفی کے مقصد حیات پر۔



”یہ تو افسوس ہی رہا۔ کہ کوئی چٹان حائل ہی نہ ہوئی۔“ منصور آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ واقعی انہیں سنگلاخ چٹانوں نے نہیں کھلا تھا۔ ہموار میدانوں نے مارا تھا۔

”منصور تم کچھ چھپا رہے ہو۔“ زلفی بولے۔ ”لیکن تم اس بات کو جتنا ڈھکا چھپا سمجھ رہے ہو وہ اتنی ہی عریاں ہے۔ میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں زلفی بچپا“ منصور پلنگ کے تکتے سے سر ٹیک کر تقریباً بیٹھے ہوئے بولے۔

”تم غلط کہہ رہے ہو۔“ زلفی بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”سگریٹ نکالا۔ لائٹس سے روشن کیا۔

بھر مینیل پیس پر پڑی ہوئی تصاویر کو بڑے استہاک سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”تمہارا روگ میرا جانا بوجھا ہے منصور۔“ زلفی کے لمبے میں برف کی منجمد رودت تھی۔ منصور ہنس دیئے۔

انہوں نے ہنسی میں بات ٹالنا چاہی۔ لیکن زلفی بیحد سنجیدہ تھے آج۔ منصور خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے۔ زلفی اٹھ کر بے تابی سے شملنے لگے۔ ”سگریٹ کے کش پر کش لگاتے ہوئے وہ بولے۔ یہ دور کبھی مجھ پر بھی آیا تھا۔ لیکن دیکھ لو.....“ انہوں نے پلٹ کر منصور کی حیران حیران نظروں سے مسکراتی ہوئی نظرس ملائیں۔ مسکراہٹ جس سے لمبو ٹپک رہا تھا۔ زخمی نسل تڑپتی ہوئی مسکراہٹ جب کسی مرد کے ہونٹوں پر پھیل جائے تو اس کے جذبات کا تجربہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ منصور ابھی تک حیرانگی سے زلفی بچا کو دیکھ رہے تھے۔ جو زندگی میں شاید پہلی بار اتنے سنجیدہ نظر آئے تھے۔

”ناکامیوں نے مجھے نکل جانا چاہا۔ لیکن میں ان سے مرعوب نہیں ہوا۔ میں نے ان کا منہ چڑایا۔ میں نے انہیں بچھاڑ دیا۔ جینا ہے تو ہنس ہنس کے جیو۔“ منصور نے دیکھا کہ زلفی کی بڑی بڑی آنکھوں سے آزار چھلک رہا تھا۔ اور ان کے گوشے بھیگے گئے تھے۔ زلفی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

منصور کو ان کی زندگی کے اس حادثے کا جس کا انہوں نے اشارہ ذکر کیا تھا۔ کچھ علم نہ تھا۔ اسی لئے وہ بڑی دیر تک حیران سے بیٹھے رہے۔ زلفی کو انہوں نے ہمیشہ ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے دیکھا تھا۔ لیکن آج یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ کہ زخم بھر جائیں۔ گھاؤ مٹ جائیں۔ لیکن ان کے نشان کبھی نہیں مٹتے۔ اور ان اُن مٹ نشانوں سے زخموں کے آزار کی تلخ یاد ہمیشہ وابستہ رہتی ہے۔ تو پھر زخموں کے مندل ہونے کا فائدہ؟ گھاؤ بھر جانے کا حاصل؟ منصور سوچ رہے تھے۔ کیوں نہ ان زخموں کے کھلے منہ پر پے در پے کچو کے لگنے دیئے جائیں۔ تاکہ کچو کو ان کی اذیت سے زخم اپنے درد کی شدت کا احساس ہی کھو دیں۔

زلفی نے فطرت کو تہذیب کے دائرے میں لا کر اس کی شکل مسخ کر ڈالی تھی۔ انہوں نے اس کے منہ پر ظاہر داری کے پردے تان دیئے تھے۔ لیکن تنگی فطرت ان پردوں کے پیچھے کسمسار رہی تھی۔ باہر آنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ زلفی کو قدم قدم پر اسے چھپانے کا اہتمام کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بات منصور کے نظریے کے مطابق

کے ہاتھ میں کانڈا اور پنسل تھی۔ کسی ضروری بات کے متعلق ناصرہ سے کچھ پوچھنا تھا اسے یہ تو اک بمانہ تھا اندر آنے کا۔ ناہید کی معنی کے بارے میں جب سے ساتھ اس کے حصول کا خیال ہی بھوڑا تھا۔ لیکن اس کے دیدار جمال رخ زیبائی ہمیشہ کے لئے نہ سہی گھڑی بھر کے لئے ہی سہی کی تمنا کو دل سے نہ نکال سکا۔ شیریں نے ذومعنی نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ ناہید کا چہرہ لال بھوکا ہو گیا۔ کچھ تو خلق کے بے مہار اندر آنے کا غصہ تھا۔ اور کچھ شیریں کی شرارت آمیز نظر کا۔ ناصرہ ناہید کی بیزاری سمجھ گئی۔ اور جلدی جلدی خلق کی باتوں کا جواب دے کر اسے واپس بھیجنا چاہا۔ لیکن وہ تو جیسے چپک سی گیا کھڑکی کے ساتھ شیریں نے چپکے سے ناہید کے بازو میں پتھلی لی۔ وہ تھلا کر رہ گئی۔ مصلحت خاموشی ہی میں تھی۔

”آپ کو کس نے بلاوا بھیجا تھا خلق ماموں“ فاخرہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”کیا بلاوا“ وہ حیران ہو کر بولا۔

”آپ جو اس بے تکلفی سے تشریف لے آئے۔“

”میرا آثار جرم ہے“ وہ جیسے ناہید سے پوچھ رہا تھا۔

”قطعی جرم“ فاخرہ بولی ”تشریف لے جائے۔ ورنہ چالان ہو جائے گا“ خلق و حشائی سے ہنستا ہوا ناہید پر وداعی نظرس ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ چھوڑ چھوڑ پھر شروع ہو گئی۔ ناہید کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ اس ہنسی مذاق میں پوری طرح حصہ نہ لے سکی۔

چائے چاروں نے وہیں قالین پر لی۔ اس اثنا میں ناہید سارے کپڑے استری کر چکی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں شیریں چٹ پٹے سے قصے سناتی رہی۔ فاخرہ الٹی سیدھی باتوں سے سب کو ہنساتی رہی۔

”چلو شیریں“ ناہید نے کہا ”تم تو ایسے بیٹھی ہو۔ جیسے واپس جانتی نہیں۔“

”کہاں جانا ہے آپ کو“ ناصرہ نے پوچھا۔

”گھر“ سادگی سے جواب دیا گیا۔

”کیا کہنے“ فاخرہ آنکھیں نہچاتے ہوئے بولی ”اب آپ کو جانے توڑا ہی دیں گے۔ چند دن باقی ہیں۔“

اتنے دن تو تیس رہیں گی آپ۔ خدا خدا کر کے آئی ہیں۔ اب واپس جانے کی بھی رٹ لگادی۔“

”ٹھیک ہے ناہید“ شیریں بظاہر سادگی سے لیکن دل ہی دل میں ناہید کی چڑ سے محفوظ ہوتے ہوئے بولی۔ ”سات آٹھ دن تو رہ گئے ہیں۔ اللہ قسم مجھے چھٹیاں ہوتیں۔ تو میں یہاں سے ایک منٹ کے لئے نہ ہلتی۔ تم تو دیسے بھی چھٹی پر ہو۔ گھر اکیلی کیا کر دو گی۔ یہاں اچھی رہو گی۔“

ناہید نے گھبرائی ہوئی نظروں سے شیریں کو دیکھا۔ وہ یہاں ایک گھنٹہ بھی رکنے کی روادار نہ تھی۔ خاص کر خلق کی موجودگی میں تو وہ یہاں سانس لینا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ بہانے کے لئے موزوں الفاظ سوچنے لگی۔

اور سنری پوچھا کچھ دینتوں چاروں کام میں مشغول تھیں۔ شیریں کی باتوں پر دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ ناہید بھی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی یہاں آنے سے اسکا طبیعت بڑی ہل گئی تھی۔ ورنہ گھر پہ تو جیسے اس پر اس دن سے ہنسی حرام ہو گئی تھی۔ جس دن سے منصور اس سے جدا ہوئے تھے دن رات سوچوں میں الجھتے گزر رہے تھے جذباتی کش مکش اور ذہنی غلبان نے اسے مضمحل کر دیا تھا منصور چار ماہ لندن گزار کر واپس آ چکے تھے۔ اور جدائی کا ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی آن پر مرٹنے والی تھی۔ اندر ہی اندر یہ غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ کسی کے سامنے دل کا غبار نکالنے کا خیال تک بھی نہ کیا تھا۔ شیریں اس کی بڑی قریبی دوست تھی۔ لیکن اس نے اپنے اور اس کے درمیان بھی رازداری کے پردے تان رکھے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ پردے اتنے باریک تھے کہ شیریں کی تیز آنکھیں ان کے پار سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

”دولہا بھائی کیسے ہیں“ ناہید نے پوچھا۔

”بجیریت ہیں“ شیریں نے جلدی سے جواب دیا۔ تینوں ہنسنے لگیں ناصرہ نے سر جھکا لیا۔

”میرا مطلب ہے شکل و صورت کیسی ہے“ ناہید مسکراتے ہوئے بولی۔

”تصویر دکھاؤں حیران رہ جائیں گی دیکھ کر“ فاخرہ بولی ”ڈارون کا مقولہ صحیح نظر آنے لگتا ہے ان کی تصویر دیکھ کر۔ گستاخی معاف باجی“ وہ ہنسنے ہوئے بولی شیریں اور ناہید نے بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔

”تم لاؤ تو تصویر۔ ہم فیصلہ خود کریں گے“ شیریں بولی۔

”کہاں رکھی ہے باجی۔ دولہا بھائی کی تصویر“ فاخرہ نے ناصرہ کو چھیڑا۔ اور تصویر لینے چلی گئی۔

”دل کے آئینے میں“ شیریں نے فی البدیہہ کہا۔

”بڑی شریر ہیں آپ“ ناصرہ نے اک حجاب آلود نگاہ بہہ ڈالتے ہوئے کہا۔

فاخرہ لپک کر تصویر لے آئی۔ ناہید نے استری کا پلگ اتار دیا۔ پلگ اتارتے وقت کوئی بھولی بری بات یاد آ گئی۔ اور وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ شیریں نے جھپٹ کر تصویر لے لی۔ سوئی دوپٹے کے ساتھ ٹانگ کر وہ تنقیدی نظروں سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ ناہید بھی تصویر پر جھک گئی۔

تصویر اک خوش رو جوان کی تھی۔

”دائیں آنکھ بائیں آنکھ سے قدرے بڑی ہے“ شیریں نے ہنسنے ہوئے تنقیدی۔

”بڑی باتیں آتی ہیں تمہیں شیریں“ ناہید نے اسے ٹوکا۔

”لو تم خود ہی دیکھ لو۔ اچھا ناصرہ تم دیکھو اور انصاف کرو“ شیریں نے تصویر ناصرہ کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ ناصرہ جو تختائی میں جانے لگتی بار تصویر کو ہر زاویے سے دیکھ چکی تھی۔ شیریں کی بات پر شرما گئی۔

چارالہز جوانیاں ہنسی کھیل میں مشغول تھیں کہ خلق کمرے میں آ گیا۔ سب سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ اس

”اچھا مجھے تو اجازت دو“ شیرس اٹھتے ہوئے بولی۔

”رات کو چلی جائیے گا“ فخرہ نے کہا۔ ناہید بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں پھر آ جاؤں گی۔ ابھی مجھے بھی جانے دو“ اس نے فحشی انداز میں کہا۔

لیکن ناصرہ اور فخرہ نے ایسی ضد پکڑی کہ اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ شیرس شرارت سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”بھئی ناصرہ کے پاس دو ایک سیلیوں کا رہنا ضروری ہے۔ اور ناہید آج تم اس کے پاس رہو گی توکل کو تمہارا وقت آئے گا۔ تو وہ تمہارا ساتھ دے گی۔“

شیرس کی باتیں ناہید کو تیر کی طرح لگیں۔

”ہم تو آپ کی شادی پر بن بلائے ہی پہنچ جائیں گے“ فخرہ بولی ”اللہ قسم میں تو مہینہ بھر رہو گی آپ کے پاس۔“

ناہید بظاہر مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کا دل لہو لہان ہو رہا تھا۔

”کب تک آرہے ہیں ان کے وہ“ ناصرہ نے شیرس سے پوچھا۔

”ابھی گئے“ شیرس نے ایک دم جواب دے کر ناہید کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ پیکا پڑ گیا تھا۔ اور وہ کھا جانے والی نظروں سے شیرس کو گھور رہی تھی۔

”کب آئے ہیں تو کچھ بتا دیں نہیں“ فخرہ بولی۔

”میں کوئی“ شیرس ناہید کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی ”کوئی۔ کوئی میرے خیال میں پندرہ دن ہوئے ہیں۔ کیوں ناہید“

منصور کو لوٹے پورے پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اور شیرس درپردہ ناہید کو انہیں کے بارے میں کہہ کر تنگ کر رہی تھی۔

”پھر تو ان کی شادی بھی قریب ہی ہوئی“ ناصرہ نے کہا۔

”بالکل“ وہ آنکھیں منکھاتے ہوئے بولی۔ ناہید دل ہی دل میں چچو کتاب کھا رہی تھی۔

برآمدے میں ڈاکٹر حمان کی آواز آئی۔ لڑکیاں چپ ہو گئیں۔ ناہید نے موقع غنیمت جانا۔ اور انہیں سلام کرنے کے ہمانے جلدی سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے غلوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

”اب تو کبھی نظری نہیں آتی بیٹا۔ بہت کام ہو گیا ہے دفتر میں۔“

”جی نہیں۔ کام تو کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔“

”کچھ کمزور نظر آرہی ہو“

”پچھلے دنوں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی“ اس نے تھکڑا کہا۔ اب ابھی ہوں۔۔۔۔۔

”مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں“ ڈاکٹر بولا ”بھئی تکلف نہ کیا کرو۔ جب کوئی تکلف ہو۔ یا تو خود آ جایا کرو۔

یا اطلاع کر دیا کرو۔ میں آ کر دیکھ جایا کروں گا۔“

”شکریہ“ وہ مسکرا کر بولی۔ پھر ڈاکٹر اس کی دفتری زندگی کے متعلق پوچھتا رہا۔ شیرس بھی آگئی۔ وہ گھر جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو سلام کیا۔

”اباجان“ فخرہ بولی ”یہ بھی گھر جانا چاہتی ہیں۔ اب شادی میں دن ہی کون سے رہ گئے ہیں۔ انہیں کئے نا اتنے دن بیس رہیں۔ دفتر سے بھی چھٹی پر ہیں۔“

”نہیں بیٹا“ ڈاکٹر بڑی اپنائیت سے بولا ”اب کون جانے دے گا۔ بسن کی شادی ہے۔ جا بھی کیسے سکتی ہیں۔“

ناہید مرعوب ہو گئی۔ ڈاکٹر کے احسانوں نے ایک بار پھر اسے رک جانے پر مجبور کیا۔ شیرس چلی گئی۔ اور وہ خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوئی واپس آگئی۔ ناصرہ کو اس کے رک جانے سے بڑی خوشی ہوئی۔

شام ہو رہی تھی۔ فخرہ ناصرہ کی مطلوب چیزیں لانے کے لئے بازار جانے لگی۔

”آپ چلیے میرے ساتھ۔“ اس نے ناہید سے کہا ”بائی کی کچھ چیزیں لانا ہیں۔ ادھر ہی سے آپ کے ہاں جائیں گے۔ آپ اپنے کپڑے بھی لے آئیے گا۔“ تجویز معقول تھی۔ ناہید نے اس سے اتفاق کیا۔

دونوں بازار جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ناصرہ نے چیزیں لکھوا دیں۔۔۔۔۔ اور فخرہ ماں سے پیسے لینے چلی گئی۔ اور جب وہ پیسے لے کر آئی تو ناصرہ نے پوچھا۔

”جاؤ گی کیسے موٹر تو اباجان لے گئے ہیں۔“

”بس سے چلے جائیں گے۔ آتی دفعہ مانگہ پکڑ لیں گے۔“

یہیں سے واپسی کا تاکہ لے لو۔ آتے آتے رات ہو جائے گی۔ اور پھر تم نے ہوٹل بھی تو جانا ہے۔“

”یہی ٹھیک ہے تاکہ یہیں سے لے لیتے ہیں۔ زیادہ اچھا ہے گا۔“

ناہید نے بھی دونوں بنوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

دونوں برآمدے میں آگئیں۔ سامنے سے بیگم رحمان کپڑوں کا ایک بڑا سا بنڈل اٹھائے ہانپتی چلی آ رہی تھیں۔ ناہید نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے بنڈل پکڑ لیا بیگم رحمان کا سانس پھول رہا تھا۔

”کہاں رکھوں انہیں۔“ ناہید نے پوچھا۔

”ناصرہ کو دینے جاری تھی۔ میرا تو سانس ہی پھول جاتا ہے۔ دو قدم کوئی چیز اٹھا کر نہیں چلا جاتا۔“ وہ

ابھی تک ہانپ رہی تھی۔

ناہید ناصرہ کو کپڑے دے کر آئی تو بیگم رحمان کہہ رہی تھی۔

”اس وقت اکیلی نہیں جاؤ فائزہ۔“

”ناہید جو ساتھ ہیں امی۔“

”ناہید بھی تو لڑکی ہے۔ کوئی مرد تو ہوا ہی ہے۔“

”شام ہو رہی ہے آپا۔“ رئیسہ خالہ چک اٹھا کر باہر آگئی۔ یہ ابھی بچیاں ہیں زمانے کی ہوا کو کیا

جائیں۔ خلیق کے ساتھ چلی جائیں۔ وہ بھی بازار جا رہا ہے۔“

”یہ تو بہت ہی اچھا ہے ذرا بلانا تو اسے“ بیگم رحمان نے رئیسہ سے کہا۔ خلیق تو جیسے ناک ہی میں تھا۔

جھٹ سے آواز سننے ہی باہر نکل آیا۔

”تم بازار جا رہے ہو نا خلیق“ بیگم رحمان بولی۔

”جی ہاں“ خلیق نے جواب دیا ”آرائش گھر سے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔“

”یہ بھی تو وہیں جا رہی ہیں“ بیگم رحمان نے کہا ”اکٹھ ہی چلے جاؤ۔“

”بہت بہتر“ خلیق ناہید کے ساتھ جانے کے خیال سے جھومتے ہوئے بولانا ناہید کا جی چاہا کہ جانے سے

انکار کر دے۔ لیکن مجبور تھی۔ خاموشی ہی رہ گئی۔

خلیق خوش خوشی اور ناہید بادل خواستہ فائزہ کے ساتھ چل دیئے۔ بیگم رحمان اور رئیسہ خالہ انہیں

حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ گئیں۔ رئیسہ خالہ نے بھی ناہید کے متعلق سب کچھ سنا تھا۔ اور کل جب سے

اسے دیکھا تھا۔ خلیق کی محرومی پر اسے برا افسوس آ رہا تھا۔

آرائش گھر بازار کی سب سے بڑی دوکان تھی۔ معمول طبع کی زندگی کی آسائش اور آرائشی کے سارے

سامان وہاں سے مل سکتے تھے۔ بڑی بڑی لمبی شیشے کی الماریاں اور چمکتے ہوئے کاؤنٹر گاہک کی توجہ کامرکز بن جاتے

تھے اور وہ بہت کچھ بلا ضرورت بھی خریدنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ناہید لکھی ہوئی چیزیں بتا رہی تھی۔ سیل مین بڑے ادب سے مطلوبہ اشیاء نکال کر کاؤنٹر پر رکھ رہا تھا۔

فائزہ چیزوں کی قیمتوں کے متعلق استفسار کر رہی تھی اور خلیق ناہید کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوئے کاموقع

دیکھ رہا تھا۔ ناہید کو اس کا یوں قریب قریب کھڑے ہونا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے دوپٹے کو اپنے

شائوں پر لیٹ رہی تھی۔

”لپ اسٹک کا یہ رنگ کیسا ہے گا“ فائزہ نے سیاہی مائل سرخ رنگ کی لپ اسٹک ناہید کو دکھائی۔

”مجھے اس معاملے میں کورابی سمجھو۔“ ناہید نے آہستہ سے کہا ”ان لوازمات کے خریدنے کا کبھی اتفاق

نہیں ہوا۔“

”ماشاء اللہ آپ کو ان کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ خلیق نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ناہید کے تو

جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

”تم چیزیں پیک کر آؤ فائزہ“ کہتے ہوئے وہ باہر تانگے میں آ بیٹھی۔

تھوڑی دیر بعد خلیق چھوٹے بڑے کئی بنڈل اٹھائے باہر آ گیا۔ ناہید کے پاس پچھلی سیٹ پر اس نے

لفافے پھیلے اور بنڈل رکھ دیئے۔ ایک گول سا پیکٹ لڑھک کر ناہید کے قدموں میں آگرا۔ خلیق جلدی سے جھکا

اور پیکٹ اٹھا کر سیٹ پر رکھا۔ لیکن ٹھوکر لگنے سے دو تین پیکٹ اور ناہید کے قدموں کے قریب آ گئے۔

خلیق بوکھلا گیا۔ جلدی سے پیکٹ اوپر رکھے۔ دباؤ سے ایک نیچے کا پیکٹ پھر لڑھک کر گر گیا۔ وہ سٹ پٹا

گیا۔ اور کھسیانہ ہو کر ناہید کے پیروں کے قریب پڑا ہوا پیکٹ اٹھانے کیلئے جھک گیا۔

ناہید کو جانے کیوں اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ خلیق جھکا ہوا تھا۔ اور ناہید کے ہونٹوں پر ہنسی چل رہی

تھی۔

ہارن کی تیز آواز پر گھوڑی اچھلی اور ناہید نے چونک کر دیکھا۔

پچھلی موٹر کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے دو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں روشن اور حسین آنکھیں جن

میں طنز کا انجماداس نقطے پر پہنچا ہوا تھا۔ کہ اس پر کبھی طاری ہو گئی۔ موٹر لمحہ بھر کے لئے رکی۔ اور پھر بڑی تیزی

سے آگے نکل گئی۔

کار میں منصور تھے۔ ناہید کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ انہیں آئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ناہید جھٹی پر

تھی۔ اس لئے انہیں ملنے یاد رکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ آج سرراہ انہیں دیکھا بھی تو یوں کہ ناہید اپنی نظروں

میں چوری ہو گئی۔ موٹر کا یوں ہارن دے کر نکل جانا ایسے تھا۔ جیسے کسی کے کروہ گناہوں کو جتلا کر ستر پوشی کر

دی جائے۔

ناہید کو خلیق کی سرسری سگی پر ہنسی آئی تھی۔ خلیق اس کے قدموں میں جھکا ہوا تھا ایسی حالت میں منصور نے

اسے دیکھ لیا تھا۔ ناہید نے چاہا کہ اس معمولی سے واقعے کو کوئی اہمیت نہ دے۔ لیکن وہ جھپٹتی ہوئی نظریں بہت کچھ

کہہ گئی تھیں۔ طنز میں جگمگاتے ہوئے تیر چلا گئی تھیں۔ جو اس کے دل میں بیوست ہو گئے تھے۔

اس نے بہتر اس واقعے کو نظر انداز کرنا چاہا۔ اپنے دماغ سے اس کا خیال ہٹانا چاہا۔ اس کا اب منصور سے

تعلق ہی کیا رہ گیا تھا۔ واسطہ ہی کیا تھا۔

بظاہر دونوں لا تعلق تھے۔ لیکن وہ لا تعلقیایں مل کر ایک ایسا تعلق بن چکی تھیں جس سے انحراف ایک مسلم

حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔ اور یہ اسی تعلق کا واسطہ تھا۔ کہ ناہید آج منصور کی گھورتی ہوئی نظروں کی

وجہ سے گھبرا گئی تھی۔

منصور سے اس کے تعلقات ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن دونوں کی روحیں جن بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ انہیں کوئی نہ توڑ سکا تھا۔ منصور چار ماہ ولایت رہ آئے تھے اور ناہید کا دل باوجود داغ کی پر زور استدلال کے لمحہ بھر کے لئے بھی ان کی یاد سے غافل نہ ہوا تھا۔ وہ اس کے دل کے اتنے ہی قریب تھے جتنے شروع سے تھے وہ نہ اپنے مقام سے ہٹے تھے۔ اور نہ ہی اس نے ہٹانے کی فضا مل سہی کی تھی۔

اور آج وہ یہ تو نہ جان سکی۔ کہ ہوا کیا ہے۔ پر اتنا سمجھ گئی کہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ اور یہ ہوا ہوتا بن کر اس کے اعصاب پر مسلط ہو گیا۔

راستہ بھر فائبر اور خلیق چیزوں کے متعلق باتیں کرتے آئے۔ ناہید گم سم سی اپنے خیالات ہی میں کھوئی رہی۔ اس کا چہرہ اس کے دوپٹے ہی کی طرح زرد تھا۔

.....○.....

منصور لندن سے واپس آ گئے۔ دل پریشان کو ہسلانے گئے تھے۔ لیکن اس کا رہا سا سکون بھی لٹا کر لوٹے تھے۔ ان کے آنے سے قصر عتاک کی سوئی ہوئی رونقیں جاگ اٹھیں۔ دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کا تانتا سا لگ گیا۔ لیکن منصور کے دل ویران میں ہمار نہ آ سکی۔ انہوں نے اپنی بیکل طبیعت کا نفسیاتی علاج شروع کیا۔ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے لگے۔ بڑی بڑی دعوتیں دیں۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد کیں۔ مشاعرے کروائے۔ لیکن طبیعت سنبھلنے کی بجائے الجھتی گئی۔ انہوں نے باقاعدگی سے کلب جانا شروع کر دیا۔ لیکن جلد ہی کلب کی مصنوعی اور کھوکھلی زندگی سے جی بھر گیا انہوں نے ایک دم کلب جانا موقوف کر دیا۔ شمس نے ایک بار پھر سارا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس کے ساتھ ناہید سے ناچاقی کی خوشی یاد وابستہ تھی۔ منصور کے لہجے کی خشکی اور ان کے برتاؤ کی ٹھنڈک نے شمس کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ آج کل ویسے بھی نواب غزالی کی منظور نظر تھی۔ اور مستقبل قریب میں شادی بھی کرنے والی تھی۔ اس لئے وہ اپنا وقت ضائع نہ کر سکی۔ ازراہ ہمدردی اس نے منصور کو ہسلانا چاہا تھا۔ لیکن انہیں اس کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

کلب جانا موقوف کرنے کے بعد انہوں نے دوستوں سے بھی زیادہ ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ زیادہ تر تھمبی رہتے۔ اور یہ تھمائی ان کی صحت کے لئے مضر ثابت ہو رہی تھی اپنے گھر میں وہ اجنبیت محسوس کرنے لگے۔ یاسمین اور ان کے بچوں کا خیال آتے ہی وہ ناظم آباد پہنچ گئے۔

یاسمین کا کلبچہ انہیں دیکھ کر دھک رہ گیا۔ ان کی گرتی ہوئی صحت۔ ان کی سیاہی مائل زرد رنگت دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔ منصور جب بھی سفر یورپ سے واپس آتے تھے ان کی صحت قابل رشک ہوا کرتی تھی۔ رنگت میں اک خاص چمک آ جابا کرتی تھی۔ لیکن اب کے تو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ چار ماہ یورپ کی سیاحت میں گزار کر نہیں آئے بلکہ کہیں دھوئیں کی زد میں بیٹھے رہے ہیں۔

ہونا پڑا ضروری ہے۔“

”وہ کیوں“..... منصور حیران سے یاسمین کو دیکھنے لگے۔ لیکن یاسمین کی ضد تھی کہ وہ منصور کو ڈاکٹر کو دکھائیں گی۔ ان کی ضد کے سامنے منصور کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور روانگی صبح پر ملتوی کر دی گئی۔

ڈاکٹر آ یا۔ بیضیں ٹٹولیں۔ سینے کا زیروم دیکھا۔ سانس گھٹیں۔ آلات کی مدد سے خون کا دباؤ دیکھا۔ کوئی خاص بیماری نہ تشخیص کر سکا۔ محض کمزوری بتائی۔ ٹانگ لکھے انجکشن بتائے۔ غذا کی فرست مرتب کی۔ فیس لی اور چل دیا۔ یہی وہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر دل کی دھڑکنیں گمن سکتا تھا۔ ان دھڑکنوں میں تہہ دیا لاتی ہوئی دنیا اسے کہاں نظر آ سکتی تھی۔ وہ سینے کا تار چڑھاؤ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس چمائی میں سلگتے ہوئے آتش فشاں کی پیش تو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

یاسمین کو ڈاکٹر کی تسلی بخش رپورٹ کا یقین نہ آیا۔ ان کا دل مطمئن نہ ہو سکا۔ کوئی ان کا دل اندر ہی اندر مسل رہا تھا۔ منصور ان کے سینے کا سہارا تھے۔ اور جانے کیوں انہیں یہ سہارا تو نظر آرہا تھا۔ دل آنے والے خدشات سے لرز رہا تھا۔ منصور کے چلے جانے کے بعد ان کا دل بھر آیا۔ اور وہ بڑی دیر تک بے قرار سے روٹی رہیں شوہر اور مندر کی تسلیاں مبروضہ کے ٹوٹے ہوئے بند جوڑ نہ سکیں۔

منصور واپس سلطان پور آ گئے۔ سارا سارا دن موٹر لئے سلطان پور کی سڑکوں پر بے معنی گھومتے پھرتے جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہو۔ انہوں نے دل کو سمجھانا چاہا۔ لیکن وہ کہاں مانتا تھا۔ وہ تو کمزور اور ضعیف بچے کی طرح اسی کھوئے کیلئے چلا ہوا تھا جسے وہ پسند کر چکا تھا۔ اس کے بدلے میں قیمتی سے قیمتی اور اعلیٰ سے اعلیٰ کھوئے اس کی نظروں میں بیچتے تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ منصور حسب سابق موٹر لئے بے مقصد سڑکوں کی لمبائیاں ماپ رہے تھے۔ جانے کیا خیال آیا۔ موٹر کارخ آبادی کی طرف پھیر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سلطان پور کے گنجان آباد بازار سے گزر رہے تھے آرائش گھر کے باہر تانگے میں بیٹھی ہوئی ناہید نظر آ گئی۔ ان کا دل زور سے اچھلا۔ روح ہلک کر اس کی طرف جھکی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے بارود کو کسی نے آگ دکھادی۔

ناہید ہلکے زور رنگ کے لباس میں بیوس تھی۔ اور اس کے چہرے پر عجم رقص تھا۔ اس کے قدموں کے قریب ایک نوجوان جھکا ہوا تھا۔ اس قدر قریب کہ منصور سے برداشت نہ ہو سکا۔ غیر اختیارانہ طور پر ان کا ہاتھ ہارن پر گیا۔ ہارن کی تیز آواز ناہید کی نظرس ان کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے گھرائیں۔ اور پھر وہ تیزی سے آگے نکل گئے۔

وہ نوجوان کون تھا..... یہ سوچنے کی نہ تو انہیں ضرورت تھی۔ نہ فرصت انہیں تو ناہید کے انکار کی وجہ جسم نظر آ گئی تھی۔ ان کی رہی سہی صحت بھی ٹوٹ گئی۔

”تمہیں کیا ہو گیا منصور؟ بیمار رہے ہو کیا؟ کتنے کمزور ہو رہے ہو۔ رنگ کیسا خراب ہو رہا ہے۔“ یاسمین ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ گئیں۔ اور منصور خفے شاہین کو گود میں لئے بیٹھے رہے۔ جواب تو قلی زبان میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہوا بڑا ہی پیارا لگتا تھا۔

”کمزور تو بہت ہو رہے منصور۔ بیمار تو نہیں رہے۔“ نواب صدیق نے بھی انہیں دیکھ کر یہی کہا۔ یاسمین کی بڑی بیوہ مندر بھی منصور کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ منصور انہیں اپنے بچوں ہی کی طرح عزیز تھے۔

”میں تو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ پچھانے ہی نہیں جاتے۔“ وہ بولیں منصور کو اس رٹے پٹے موضوع سے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔

”اچھا بھلا تو ہوں۔“ وہ گول مثل شاہین کے سرخ سرخ گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے مسکرائے۔

”حاک اچھے بھلے ہو۔ میرا تو دل بیٹھ رہا ہے تمہیں دیکھ کر۔“ یاسمین جل کر بولیں۔

”آپ تو یونہی پریشان ہو رہی ہیں باہی وہم کی بھی حد ہوتی ہے کوئی۔“ منصور بولے۔

”وہم تو نہیں منصور“ نواب صدیق بولے ”صحت تو تمہاری گر گئی ہے۔ یاسمین ذرا کمزور دل واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے زیادہ اثر لیا ہے۔“

یاسمین بڑی ہی پریشان ہو رہی تھیں۔ منصور ان کے عزیز ترین بھائی تھے۔ ہمدرد و مونس و غمگسار بھائی۔ جن کے لئے ان کے دل میں دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی محبت تھی۔

دو تین دن منصور یاسمین کے بچوں سے کھیل کر ہنس کر خوش ہو کر وقت گزارتے رہے۔ لیکن یہ حیلہ بھی کارگر نظر نہ آیا۔ وہ آگے گئے۔ اور واپسی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ یاسمین تو ان کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ منصور خاموشی سے ان کی میٹھی میٹھی ڈانٹ سنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہوئیں۔ تو پھر بولے۔

”کسی دن پھر آ جاؤں گا باہی۔ آپ کو معلوم تو ہے ہی اتنا عرصہ غیر حاضر رہا ہوں بے شمار کام پڑے ہیں۔“

”جنم میں گئے تمہارے کام صحت کی طرف تو دھیان نہیں کاموں کی پڑی ہے۔“ لیکن منصور اپنی بات پراڑے رہے۔ ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ اور وہ جلد از جلد قعر عتاب پہنچ جانے کیلئے بے تاب ہو رہے تھے۔ طبیعت کے یوں اچاٹ ہو جانے پر وہ خود بھی حیران تھے۔ لیکن کر کیا کتے تھے۔ مجبور تھے۔ اک دل نادان کے ہاتھوں۔

”میں آج ہی جانا چاہتا ہوں باہی۔“ انہوں نے بڑے اصرار سے کہا۔

اور جب نواب صدیق یاسمین اور ان کی مندر کے کہنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے کا ارادہ ہی ظاہر کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

”صبح چلے جانا۔ آج شام میں نے جرمن ڈاکٹر مری کو بلا لیا ہے۔“ یاسمین نے بالآخر کہا ”تمہارا طبی معائنہ

”پنگے کب تک جاگتے رہو گے جاؤ۔“

لیکن وہ نہیں گیا۔ منع کرنے کے باوجود مسری کے قریب ویز قایلین پر ایک کبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند نہ آنا تھی۔ نہ آئی وہ بار بار سر اٹھا کر منصور کو دیکھ رہا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں مالک کمرے سے چلے جانے کا حکم نہ دے دیں۔ انھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

رات گزر گئی۔ دن نکلا۔ ڈاکٹر آیا..... بخار کم ہونے کی بجائے۔ اور تیز ہو گیا منصور کا پیکر آگ کی لپیٹ میں آکر جل رہا تھا۔ شمر کے چوٹی کے ڈاکٹر ہر جن کر ہارے لیکن یہ آگ بجھ نہ سکی۔ بھڑکتی گئی۔ تیسرے دن تو سب گھبرا گئے۔ حالت تشویشناک ہو گئی۔ محل کے سارے افراد اور خاص کر حسہ کی والدہ توان پر تصدیق ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے دکھ درد کے شریک تھے۔ ان کی بیوی کے دن انہیں کے سر پر کٹ رہے تھے۔ وہ بار بار قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر ان پر پھونک رہی تھیں۔ محل کے سارے خدام ان کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ملنے جلنے والوں کا ناتانگہ ہوا تھا دوست احباب بھی گھبرا گئے تھے۔ یاسمین کو بھی ان کی بیماری کی اطلاع کر دی گئی۔

اور جب نواب صدیق یہ خبر بدلے کر اندر آئے۔ توان کی بہن ان کا تڑا ہوا چہرہ دیکھ کر سہم گئیں۔ بیماری کی اطلاع پاتے ہی سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

”میں تو اسی دن سمجھ گئی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ کہ کچھ ہونے والا ہے۔ خدا ہر آفت سے بچائے۔ جوانی نصیب ہو۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

بغلی کمرے کا پردہ اٹھا کر یاسمین آگئیں۔ کیا ہوا۔ وہ گھبرا کر بولیں۔

”منصور بیمار ہیں۔“ نواب صدیق نے کہا۔ کچھ چھپانا فضل تھا۔

”منصور“ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ سر گھومنے لگا۔ دل پہلے ہی غوطے کھا رہا تھا۔ ایک دم جیسے ڈوب ہی گیا۔

نواب صدیق نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ اور بہن کے قریب سند پر گاؤ نکھینے کے سہارے بٹھا دیا۔

”معمولی بخار ہے یاسمین..... تم بڑی جلدی گھبرا جاتی ہو۔“ نواب صدیق نے ان کی تسلی کے لئے کہا لیکن ان کا دل کانپ کانپ کر کہہ رہا تھا کہ بات معمولی نہیں۔

”دل تمہوڑا نہ کرو یاسمین۔“ ان کی نند آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ ”خدا رحم کرنے والا ہے۔ تم نے حوصلہ ہار دیا تو منصور پر اثر پڑے گا۔ جلدی سے تیاری کر لو..... شام تک پہنچ جاؤ تو چھاپے۔“

”شاید ہوائی جهاز سے بندوبست ہو جائے“ نواب صدیق بولے۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہے گا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

یاسمین کی آنکھیں دریا بہا رہی تھیں۔

دوپہر کے دو بجے نواب صدیق اور یاسمین سلطان پور کے ہوائی اڈے سے قصر عثمانے آئی ہوئی موٹر پر سوار ہو رہے تھے۔ سفید وردی اور سنہری صافے والا ڈرائیور کچھ ضرورت سے زیادہ بی خاموش تھا۔ راستے میں نواب صدیق اور یاسمین نے اس سے لاتعداد سوال پوچھے۔ اس نے ہر سوال کا تقریباً ایک ہی جواب دیا۔ منصور کی حالت خفوش تھی۔ یاسمین کا دل تڑپ اٹھا۔

”منصور“ کہتے ہوئے یاسمین تقریباً مسہری پر گر گئیں منصور کی چٹکی ہوئی بیٹشانی پر بوسہ دیتے وقت ان کی آنکھوں کے ٹپکے ہوئے آنسو بے اختیار نکل پڑے۔ منصور نے آنکھیں اٹھا کر بہن کو دیکھا۔ ان کے چہرے سے ان کی ذہنی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل تھا یاسمین نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور ان کی خالہ سہارا دے کر انہیں دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

گرفتہ سے انہیں دیکھتے رہے۔ اور پھر کروٹ بدل لی نواب صدیق بھی کمرے سے باہر آگئے۔ اور دیر تک ڈاکٹر کے پاس بیٹھے بیماری کی نوعیت پر اس سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔

شام کو منصور کو پھر چکر آگیا۔ وہ دورہ پہلے دورے سے زیادہ عرصہ رہا۔ کمزوری بہت بڑھ گئی۔ چہریوں مرجھا گیا جیسے پھول پانی کے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔ گھر کے سب افراد اور خدام کی تو جیسے جانیں ہوا ہو گئیں۔ اور یاسمین کا تو حال رہا تھا۔ وہ خود بیمار معلوم ہوتی تھی۔ رنگت سرسوں کے پھول کی طرح زرد پڑ گئی۔ آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں تھک گئیں۔

رات کو ملک کے نامور ڈاکٹر ڈن کر نواب صدیق علی خان نے خود فون کیا سارے کیس کے متعلق ضروری بات چیت کی۔ اور بذریعہ طیارہ سلطان پور بلا دیا۔ صبح نوبہ کے قریب ڈاکٹر ڈن مع اپنے اسٹنٹ ڈاکٹر جعفر اور مس آنجلین کے قصر عثمان پہنچ گئے دو زینیں پہلے ہی بلالی گئیں تھیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہی منصور کی خواب گاہ سے ہماری فرنیچر نکال دیا گیا تھا۔ اور کھڑکیوں دروازوں اور مسہری کے رنگین پردے ہٹا کر مہین ریشمی سفید پردے ڈال دیئے گئے تھے۔ گہرا سبز موٹا قایلین اٹھوا دیا گیا تھا۔ اور اس کی جگہ بڑے بڑے خوشنما پھولوں والا سفید قایلین ڈال دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر ڈن اپنا ڈاکٹر سامان کھولے میز پر جمکا ہوا بخار کا چارٹ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر حنیف اور ڈاکٹر سلیمان سارے کیس کے متعلق پچھلے دنوں کی رپورٹ دے رہے تھے۔

”یہ چکر کبھی پہلے بھی آئے تھے نواب صاحب کو“ ڈن نے نپربہر چارٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بخار آنے کے بعد تیسرا دورہ آج رات ہوا تھا“ ڈاکٹر حنیف بولا۔

”میرا مطلب ہے بخار آنے سے پہلے بھی کبھی ایسی تکلیف ہوئی تھی انہیں۔“

اس نے بات کی وضاحت کی۔

”یہ بات میرے علم میں تو نہیں آئی۔ کیوں ڈاکٹر سلیمان آپ کو معلوم ہے۔“ حفیظ بولا۔

ڈاکٹر سلیمان بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ دراصل دونوں نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ڈاکٹر بڈن جعفر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ دونوں ڈاکٹر کھسیانے سے ہو گئے۔ ڈاکٹر بڈن اور ڈاکٹر جعفر منصور کی خواب گاہ میں آگئے۔ بڑی دیر تک ڈاکٹر بڈن ان پر جھکا ہوا طبی آلات کی مدد سے ان کا معائنہ کرتا رہا۔ بخار اس وقت بھی خطرناک حد تک تیز تھا۔ لیکن منصور ہوش میں تھے۔ ڈاکٹر نے ان سے متعدد سوال پوچھے۔ اور وہ بڑی بے دلی سے جواب دیتے رہے۔ جب سے وہ بیمار تھے خاموش لیٹے رہتے تھے۔ وہ چپ تھے۔ دانستہ چپ تھے یا بیماری ہی کچھ اس نوعیت کی تھی۔ یہ تو وہی جانتے تھے۔ دیکھنے والوں کو تو یہی محسوس ہوتا۔ جیسے وہ تھکے ہوئے تھے۔ اور سستانے کیلئے مسری پر لیٹے تھے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر بڈن نے ملنے والوں پر بندش لگائی۔ کسی کو خواب گاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر زس یا نواب صدیق اندر آتے جاتے تھے۔

یاسمین کو تو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ وہ تو خواب گاہ کے گرد پروانے کی طرح منزل لاتی پھرتی اندر جانے کا حوصلہ ہی نہ ہوتا۔ بڑی ہمت کر کے ان کے پاس ایک آدھ بار جاتیں بھی تو جلدی سے اٹھ کر آ جاتیں۔ وہ جب بھی ان کے پاس جاتیں۔ ان کا ایک ہی سوال ہوتا یا کبھی ہی بات پوچھتے۔

”باجی میری بیماری کی اطلاع سب کو مل چکی ہے۔“

اور یاسمین کا کچھ جیسے کوئی چھری سے کاٹ کر رکھ دیتا۔ وہ انہیں تسلی دینا چاہتیں لیکن الفاظ حلق ہی میں انک جاٹے زلفی چچا کو ان کی بیماری کی اطلاع نہ دی گئی تھی۔ کیوں کہ وہ خود بیمار تھے۔ ان کا خط ہسپتال سے آیا تھا۔ پردیس میں بیمار تھے وہ اس لئے منصور کی بیماری کی انہیں جان بوجھ کر اطلاع نہ دی گئی تھی۔ منصور کے بار بار پوچھنے پر یاسمین کا دھیان ادھر ہی جاتا۔ وہ سمجھ رہی تھیں۔ کہ انہیں زلفی چچا کا انتظار ہے لیکن منصور کی روح جس کیلئے انتظار بن کر آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ زلفی نہ تھے ناہید تھی۔ ایک دنیا ان کی بیماری پر سی کیلئے آئی تھی۔ امیر غریب جھوٹے بڑے سبھی انہیں دیکھنے آچکے تھے۔ لیکن وہ نہیں آئی تھی۔

منصور اپنی گرتی ہوئی حالت دیکھ رہے تھے۔ انہیں کھوکھلی تسلیاں دی جا رہی تھیں۔ اور آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جانے سے پہلے ایک دفعہ اس عارت گردین و ایمان کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ ناہید ان سے دور ہو چکی تھی۔ اور اس دن بازار میں اسے دیکھنے کے بعد تو ان کا دل اس کی طرف سے بدگمان بھی ہوا تھا۔ لیکن وہ اب بھی ان کی ساری ہمتی پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ ان کے تخیل میں برا بھلا تھی۔ وہ ان کے شعور سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ان کے ذہن میں محفوظ تھی۔ ان کے ذہن کی یہ محفوظ تصویر کئی دفعہ تخیل کے پردوں پر اس طرح ابھری کہ وہ حقیقت ماننے پر مجبور ہو گئے۔ خیال خیال ہی تھا۔ اور اب تو اس مسلسل ذہنی جھوٹ سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی اسے

نہ آنا تھا نہ آئی۔ منصور کی خاموش نگاہیں ہر آہٹ پر دروازے کی طرف اٹھتی اور ناکام لوٹ آتیں۔

ڈاکٹر بڈن کے علاج کو چوتھا دن تھا۔ اس کی ان تھک کوششیں باآوردہ ہو سکیں۔ صبح کے دورے نے تو انہیں موت کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ کہ معمر ڈاکٹر بھی گھبرا گئے پریشانی کے عالم میں وہ اپنے علاج کی ناکامی کے بارے میں ٹھیک طرح سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بخار خطرے کی علامت بن گیا تھا۔ کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

بڑی دیر تک وہ کنسیاں میز پر ٹکائے ہاتھوں سے سر کو تھامے کچھ سوچتا رہا۔

”ڈاکٹر“ نواب صدیق کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نواب صدیق نے جب منصور کی حالت کے بارے میں اس سے پوچھا تو وہ کچھ دیر چپ رہ کر آہستگی سے بولا۔

”میں آپ کو مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتا نواب صاحب“ وہ پریشانی سے ہاتھ مل رہا تھا۔ ”کوئی علاج کارگر نہیں ہوا۔ آپ نواب صاحب سے مل کر آخری بات چیت کر سکتے ہیں۔ وصیت.....“

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ نواب صدیق کا رنگ سفید پڑ گیا۔ اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے کھڑکی کا پٹ تھام لیا۔

”ڈاکٹر“ ان کی آواز تھرا رہی تھی۔

”میں ہر نسخہ آزما چکا ہوں..... نواب صاحب کی جوانی دیکھ کر تو قدرت کے انتہائی ظالم ہونے کا گمان ہوتا ہے۔“

”ڈاکٹر امید کی کوئی صورت نہیں“ وہ اب تک کانپ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا ”میرا خیال ہے کہ اب دورہ ہوا تو وہ آخری دورہ ہو گا..... اور وہ دو چار گھنٹے تک یہ دورہ متوقع ہے۔“ ڈاکٹر بڑی مایوس آواز میں کہہ رہا تھا۔

نواب صدیق کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے قیامت ٹوٹنے والی ہو۔ محل کے گوشے گوشے سے جنازے اٹھ رہے ہوں۔ ماتم ہو رہا ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چپ چاپ ڈاکٹر کے کمرے سے باہر آگئے۔ منصور کی خواب گاہ کے قریب سے گزرے اندر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مرمرس ستون سے پشت ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سینے میں اک مل جل جلی ہوئی تھی۔ منصور کے ساتھ والے کمرے میں یاسمین سجدے میں گری ہوئی گڑ گڑا گڑا کر خدا سے بھائی کی صحت کی دعائیں مانگ رہی تھیں.....

کئی دنوں سے دعائیں ہو رہی تھی۔ قصر عتنا کے چمنوں میں حافظ قرآن بیٹھے تھے مسجدوں میں سکولوں میں یتیم خانوں میں محتاج گھروں میں دعائیں ہو رہی تھیں۔ خیراتیں بائیں جا رہی تھیں۔ صدقے دیئے جا رہے

تھے۔ غریبوں اور مسکینوں کو کھانے کھلائے جارہے تھے۔ ہر امکانی حیلہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن شمع بجھتی ہی جا رہی تھی۔ نیلا نیلا شعلہ آخری بچکیاں لے رہا تھا۔

شیریں سکول سے واپس آئی تو وہ بڑی منوم تھی۔ آج سکول میں نواب منصور کی صحت کے لئے دعا کرائی گئی تھی۔ نادار بچوں کو کھانا کھلایا گیا تھا۔ کپڑے تقسیم کئے گئے تھے۔ نواب صاحب کے کردار ان کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ شیریں کو توجہ کی رات نہیں بھول رہی تھی۔ منصور کا صحت مند جسم بار بار آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ سکول سے واپسی پر وہ سیدھی ناہید کے پاس آئی۔ وہ بستر پر پڑی تھی۔ فاختی دوپٹہ ہانگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ ہانگ پر ہانگ رکھے وہ بڑی محبت سے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ شیریں کی آواز پر چوکی اور ایک دم اٹھ بیٹھ گئی۔

”بڑی دیر لگا دی تم نے آج۔ میں دو دفعہ تمہاری طرف گئی تھی۔“ ناہید نے کہا۔ ”کہاں سے آ رہی ہو۔“

”سکول سے۔“ شیریں نے سوگوار آواز میں جواب دیا۔

”اس وقت۔“ اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہاں آج دعا کرائی گئی تھی۔ دیر ہو گئی۔“

ناہید کا دل دھک سے رہ گیا۔ منصور کی بیماری کی پل پل کا خبر اسے مل رہی تھی سلطان پور کی ساری آبادی دم بخود سی کسی منحوس خبر کا جیسے انتظار کر رہی تھی۔ ناہید انہیں دیکھنے نہیں گئی تھی۔ لیکن اس کے دن اور رات خدا سے دعائیں مانگتے اور آنسو بہاتے گزر رہے تھے۔ کئی راتوں سے اس کی نیند حرام ہو رہی تھی۔ اور وہ بستر پر کروٹیں بدلتے یا چن میں پھرتے راتیں گزار رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کا خیال اسی طرف تھا۔ حالات کچھ اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ کہ پاؤں میں زنجیر بن کر حائل ہو گئے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود بھی ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔

”تم انہیں اس موقع بھی دیکھنے نہ گئیں۔“ شیریں کہہ رہی تھی۔ ”کچھ ان کے احسانوں کا ہی خیال کیا

ہوتا۔ اس دن میں نے کتنا کہا۔ لیکن تم اپنی ضد پر قائم رہیں۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔“

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”آج تو ان کی حالت بڑی خراب ہے۔ خدا جانے ہمیں کسے بھی یا.....“

ناہید تڑپ کر اٹھی۔ اور شیریں کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ناہید کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اس کی آنکھوں میں مہیب سکوت تھا۔ اس کے چہرے پر اک منہ خاموشی تھی۔ اک دیر ان چپ تھی۔ کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔

اور اس سناٹے میں کوش مکش کے تمام مراحل طے کر گئی۔ شش و پنج کی ساری منزلیں پیچھے چھوڑ گئی۔ تذبذب کے سب مدارج عبور کر گئی۔ ایک ہی جست میں وہ عشق کی ان بلندیوں پر پہنچ چکی تھی جہاں نہ اسے اپنے ماضی کا خوف تھا۔ نہ منصور کے عالی وقار خاندان کا خیال۔ نہ ماں کی طوائفیت کا دھڑکا۔ نہ شمر کے وجود کا احساس۔ حالات کی زنجیریں تھیں نہ تھاب کی دیواریں۔ ہر چیز ایک دبیز پردے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اور اس دبیز پردے پر ایک ہی تصویر متحرک تھی۔ منصور کی تصویر..... منصور جو موت و حیات کی کش مکش میں جلا تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

”کہاں چلیں۔“ شیریں نے پوچھا۔ وہ بڑی خاموشی سے اس کی حرکات کا مطالعہ کر رہی تھی۔

”ان کے پاس۔“ ناہید نے کچھ اس بیگانگی سے کہا۔ کہ شیریں کی آنکھوں سے کئی پردے اٹھ گئے۔

وہ تیزی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ شیریں کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور جانے کیوں اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بننے لگے۔

ناہید کے قدم بڑی تیزی سے قصرِ عنای کی طرف اٹھ رہے تھے۔ فاختی کپڑوں میں وہ اس وقت اک دل گرفتہ فاختہ نظر آ رہی تھی۔ فاختی دودھ پینے کے شانوں پر پڑا ہوا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر وہ گزر گئی۔ برآمدہ طے کر کے وہ زینے پر پہنچ گئی۔

باوردی ملازم ہرے دار کی طرح زینے کے قریب کھڑا تھا۔

”اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے مس صاحبہ۔“ وہ بولا۔ لیکن اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے وہ زینے کے آخری پلکر پر پہنچ چکی تھی۔ ملازم اس کے سرخ سینیل اور بالوں میں پڑے ہوئے سرخ ربڑوں کو ہی دیکھ کر گیا۔ کوئی متناطیس کشش تھی۔ جو اسے کشاں کشاں اپنے محبوب کے پاس لئے جارہی تھی۔ کوئی غیر مرئی طاقت تھی۔ جو اسے کھینچ کر اپنے منصور کے قریب لارہی تھی۔ بالکنی میں شو منوم صورت بنائے سما ہوا کھڑا تھا۔ اسے خواب گاہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے اشارے سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ بڑی سرعت سے پردہ اٹھا کر

اندر داخل ہو گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں مسری کے مہین پر دوں پر قمر کر رہی تھیں۔ کمرے کی فضا پر سکوت مرگ طاری تھا۔ وہ مسری کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔ باریک ریشی پردوں کے پیچھے منصور کا مناسا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ جس میں موت بہت چابک دستی سے اپنا رنگ بھرنے میں مصروف تھی۔ پردہ کھینچ کر وہ مسری کے اندر آ گئی۔ دہشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے کچھ ہوش ہوتا تو شاید ان کی حالت دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی۔

منصور نے آنکھیں کھول دیں۔ روشن اور کشادہ آنکھیں جن میں انتظار کی شمعیں جل رہی تھیں۔ منصور نے پہلے تو اسے تخیل کا قریب سمجھا۔ بارہا وہ اسے اپنے قریب محسوس کر چکے تھے۔ مسری کے پردوں پر اس کا بیکر تھم رہا ہوا دیکھ چکے تھے..... وہ خیال ہوتا تھا۔ اور آج حقیقت تھی۔ منصور نے اسے جھوکر اطمینان کرنا چاہا۔ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ناہید نے وہ لرزنا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ منصور حقیقت سے باخبر ہو گئے۔ اور وہ مسری کی بٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کے حواس پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ منصور کا جلتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”ناہید۔“ منصور کی نحیف آواز آئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی موجودگی اور قربت کو برداشت کرنے کی ان میں ہمت ہی کہاں رہی تھی۔

منصور چند لمحے اسی طرح پڑے رہے۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

”آپ نے ناحق تکلیف فرمائی۔“

اس جملے میں کتنا لگہ تھا۔ کتنی تڑپ تھی۔ کچھ ناہید ہی محسوس کر سکی۔

”منصور“ اس نے پہلی دفعہ ان کا نام پکارا۔ وہ ان کے اوپر اس قدر جھکی ہوئی تھی۔ کہ منصور کو اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس اپنے تپتے ہوئے چہرے پر جلتی ہواؤں کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

آپ نے مجھے مار ڈالا ناہید۔“ منصور نے شدت کر بے ہوش کاٹے۔

”ایسا نہ کیجئے میں مر جاؤں گی منصور۔“ اور فطرت قانون اور تہذیب کے سارے بندھن توڑ کر بیکسر آزاد ہو گئی۔ ناہید کا جھکا ہوا سر منصور کی جلتی ہوئی چھاتی سے چھو گیا۔

منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے چمن میں ہماریں اس وقت آئیں۔ جس وقت انہیں رخصت فرمایا نہ منے کا حکم مل چکا تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی انہیں کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے ہوش کا دامن چڑھنا چاہا۔ لیکن بے سود۔ ناہید کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور دور دورہ پڑ چکا تھا۔ آخری ملک دورہ۔

”منصور۔“ ناہید ان کا گریبان پکڑے اس زور سے جیجی کہ فضا تھرا اٹھی۔

یاسین نواب صدیقی بھاگے ہوئے آئے۔ مس ڈبیلہ کھٹ سے دروازہ کھول کر پہنچی۔ چند سیکنڈ میں سفید کوٹ میں بلبوس ڈاکٹر ہڈن فرشتے کی طرح ان پر جھکا ہوا تھا۔ نواب صدیق بچوں کی طرح ان کا چہرہ تھا۔ منصور منصور بکا رہے تھے۔ یاسین کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

اور آٹھانا کمرو لوگوں سے بھر گیا۔ سب خواب گاہ کی طرف بدحواسی کے عالم میں بھاگے چلے آ رہے تھے۔ برآمدہ۔ میزھیاں۔ بالکنی سب جگہ سری سر نظر آ رہے تھے۔ غریب امیر کی تیز نہ رہی تھی۔ نوکر رشتہ دار بھی شانہ سے شانہ کھڑے مسری تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ پردہ دار رشتہ کی خواتین مردوں کے دوش بدوش کھڑی تھیں۔ سب کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

”کلام پاک لاؤ۔“ مجھے میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔ اس آواز کے ساتھ ہی دبا دبا سا کھرام بچ گیا۔ سسکیاں ہی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ ڈاکٹر ہڈن ڈاکٹر جعفر کی مدد سے ابھی تک ان کے جسم کو ٹھل رہا تھا۔ اور ناہید ساکت و صامت اسی طرح بیٹھی تھی۔ منصور کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے چہرے سے سرفی عطا تھی۔ سفید مرمریں بت کی طرح وہ پلک جھپکائے بغیر اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو دیکھ رہی تھی۔

”کمرہ خالی کر دیا جائے۔“ ڈاکٹر ہڈن نے کہا۔ لیکن جیسے کسی نے ڈاکٹر کی بات سنی ہی نہ تھی۔ ”آپ کون ہیں۔“ ڈاکٹر ہڈن نے تعجب سے ناہید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ نواب صدیق نے نظر اٹھا کر اسے دکھا لیکن وہ اسے نہ جانتے تھے۔ یاسین منصور پر جھکیں۔ ناہید سے نظر تلے ہی چیخ مار کر اس سے پلٹ گئیں۔

”ڈاکٹر۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔ ”یہ منصور کی ہونے والی مکتبہ ہیں۔ ہمارے لئے نہیں توان کے لئے ہی بچو منصور کو۔“ اس کے ساتھ ہی وہ فٹل کر گئیں۔ کئی آڑھی ترمیمی نظریں ناہید پر پڑیں۔ کچھ تو اس کے سوگوار حسن کی محض ہو کر لوٹیں۔ اور کچھ ہنگاریاں برساتی ہوئیں۔ بیگم وقار نے بڑی مشکل سے جگہ بنا کر اسے جما لگا۔ عجیب عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ موقع کی نزاکت کو بھی بھول گئی۔

”بھڑا کمرہ خالی کر دیجئے۔“ ڈاکٹر ہڈن نے نواب خزانے سے کہا۔ اور خزانہ جن کا دل اپنے دوست کے لئے خون کے آنسوؤں سے دھوا ہوا تھا۔ لوگوں کو شائستگی سے باہر نکالنے لگے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ بے ہوش یاسین کو ساتھ والے کمرے میں لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ آزار سے چھوٹ گئیں۔

ناہید اور نواب صدیق کمرے میں ہی تھے۔ ناہید کو تو جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ اب بھی پٹی پٹی نظروں سے منصور کو دیکھنے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی کچھ سوچ کر اسے اٹھانے چاہا۔ ناہید کے دل پر جو گزر رہی تھی۔ شاید اسے اس کا پورا احساس تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ منصور کو ابھی تک ہوش نہ آیا تھا۔ نضیم امیر ست رفتاری کے ساتھ چل رہی تھیں۔ سانس اس طرح رک رک کر آ رہی تھی۔ لیکن ان کے چہرے پر اک اطمینان بخش مسکراہٹ تھی۔ اور ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے وہ بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔ بڑے دنوں کی تھکن اٹا رہے ہیں۔ مس انجیلینہ مسری سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ناہید کے سفید چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو شام سے اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بار بار آ کر منصور کو بغیر ٹھل رہا تھا۔

”منصور۔“ ناہید کے لرزے ہوئوں سے آواز نکلی۔ اس نے آہستگی سے ان کا چہرہ چھوا لیکن وہ بے سدھ پڑے رہے۔ پھر جانے اسے کیا ہوا۔ صبر و حکیم کی ساری قوتیں خواب دے گئیں۔ بحر ٹوٹ گیا۔ اور وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ اس دنیا میں جہاں منصور آخری سانس لے رہے تھے۔ اس کا ساتھ بیٹھ چھوٹ جانے والا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ اس کے آنسوؤں سے ان کی چھاتی بھیک گئی۔ اور شاید دھپک لگنے کے بلے کو طہار گانے کی ضرورت تھی۔ منصور نے آنکھیں جھپکائیں۔ ان کے لب ہلے۔ انہوں نے اس قدر تحیف آواز میں کچھ کہا۔ کہ ناہید سن نہ سکی۔ اور پھر ان پر غصہ کی چھائی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چپکنے لگے۔ ناہید گھبرا گئی۔ آخری وقت اس کی ماں کو بھی ایسے ہی پسینہ آیا تھا وہ اپنے آنسو اور منصور کا پسینہ ایک ہی دوپٹے سے پونچھ رہی تھی فاختی دوپٹہ تقریباً بھیک چکا تھا۔ مس انجیلینہ نے اس کی پیشانی کو چھوا۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف لپکی۔ نواب صدیق برآمدہ میں بے قراری سے ٹھل رہے تھے۔ اور یاسین کو ابھی تک ہوش نہ آیا تھا۔

دوسرے لمحے ڈاکٹر ہڈن اور ڈاکٹر جعفر بھاگے ہوئے خواب گاہ میں داخل ہوئے نواب صدیق نے انہیں دیکھا۔ کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ان کا اس تیزی سے اندر جانا کسی خبر مخوس کا ہی پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔

”وہ نفل۔“ ڈاکٹر ہڈن اونچی آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے ڈاکٹر۔“ جعفر اس کے قریب آ گیا۔

”انہیں پسینہ آ رہا ہے۔ ڈاکٹر ہڈن کی آنکھیں امید سے چپکنے لگیں۔

”ج۔“ جعفر کو جیسے یقین نہ آیا۔ اور جلدی سے اس کی پیشانی چہرے اور بڑھوٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا۔ ”واقعی یہ تو بھیکہ ہے ہیں ڈاکٹر۔“ جعفر کی آواز میں مسرت انگیز گھبراہٹ تھی۔

دونوں ڈاکٹر بڑی دیر تک قہقی آلات سے منصور کا معائنہ کرتے رہے۔ بخار ایک درجہ کم تھا۔ یہ بات امید افزا تھی۔ وہ دونوں صبح تک اپنی کوششوں سے منصور کو ہوش میں لانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اور ناہید مستحسن نظروں سے انہیں دیکھتی رہی حرم سرا رشتہ داروں سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی تورات کو نہ سوسکا۔ مہمان اوتگتے ہوئے قیاس آرائیوں میں مصروف تھے نوکر چاکر سرائیکی کے عالم میں ادھر ادھر خواہ مخواہ آ جا رہے تھے۔

تھیں۔ بیگم وقار کو تو جیسے اس سے چڑھی گئی تھی۔

حرم سرا کی آراستہ نشست گاہ میں قوے کا دورہ چل رہا تھا۔ نرم نرم ریشمی گاؤنکیوں کے سارے بیٹھی ہوئی بیگمات بیگمات قوہ پیتے ہوئے گفت گو میں مصروف تھیں۔ کنیریں چاندی کی کشتیوں میں روسی چائے دانوں میں قوہ لاکر سامنے رکھ رہی تھیں۔ دودو چار چار عورتیں سرجوڑے منصور کی تشویشناک حالت کاٹنے سرے سے تذکرہ کر رہی تھیں۔ ناہید کے متعلق ذلوں میں بھرا ہوا زہرا گل رہی تھیں۔

”آخر یہ کون۔“ بیگم وقار اپنے سینے پر بچے موتیوں کی دوہری مالا پھیلاتے ہوئے طنز انداز میں بولی۔

”میں خود نہیں جانتی۔“ سلطانہ بولی۔ ”کوئی یا سیمین کی سہیلی ہے۔“

”یا سیمین ادھر آئیں نہیں مج سے۔“ زیب النساء نے پوچھا۔ کانوں میں پڑے ہوئے یا قوتی آویزوں کو

ہاتھ سے چھوتے ہوئے بولی۔ ”منصور کے پاس ہی میں شاید۔“

”ان کے پاس وہ ایک ہی کیا ہے۔“ بیگم وقار نے دل کے پھولے پھوڑے۔

”کون۔“ زیب النساء نے پوچھا۔

”منصور کی منگیت۔“ بیگم وقار نے اپنے طلائی کنگنوں کو ہلاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ آنکھوں سے طہر کے

شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اسے تو ناہید سے ایک ہیر سا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ اب تک منصور پر اپنی صبیحہ کے لئے

آس لگائے بیٹھی تھی۔ صبیحہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بیگم وقار منصور کی رشتہ کی چچی تھی۔ جب سے منصور بیمار

ہوئے تھے۔ عیادت کے لئے آئی ہوئی تھی۔ دل کھول کر خیرات دے رہی تھی۔ بے دریغ صدقہ نکال رہی

تھی۔ ان سب باتوں کے نیچے اپنی بیٹی صبیحہ کا رشتہ منصور سے کرنے کی خواہش کا فرما تھی۔ اس دن جب اس

نے سنا تھا کہ ناہید منصور کی ہونے والی منگیت ہے تو اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ بلاوجہ اس کے

بارے میں زہریلی باتیں پھیلا رہی تھی۔ اور یہ اگلا ہوا زہر بجائے ناہید کے خود اسے ہی گزند پہنچا رہا تھا۔

”میں تو اس لڑکی کی جرات پر حیران ہوں۔ کس بے باکی سے رہ رہی ہے یہاں اور یا سیمین کو دیکھو دن رات اس

کا کلمہ پڑھتی ہے۔“ وہ غرارہی تھی۔

”یا سیمین تو کہہ رہی تھیں۔ کہ ناہید کا قدم اتنا مبارک پڑا۔ منصور اچھے ہو گئے۔“ سلطانہ بیگم نے لقمہ

دیا۔ تھوڑی دیر میں سات آٹھ بیگمات سرجوڑے ناہید کے بارے میں چیمکولیاں کر رہی تھیں۔

”کسی ایسے ویسے گھر کی ہوگی۔“ بیگم وقار نے حیر چھوڑا۔

”معلوم تو کسی بڑے گھرانے کی ہوتی ہیں۔“ ممتاز بانو نے اس کی طرف داری میں کہا۔

”بڑے گھرانے کی لڑکیاں یوں مادر پدر آزاد نہیں ہوتیں۔“ سلطانہ بیگم نے جواب دیا۔

”سنا ہے اس کے والدین مر چکے ہیں۔“ ممتاز بانو نے پھر کہا۔ جانے کیوں انہیں ناہید سے گہری ہمدردی

رات گزر گئی۔ اور.....

صبح اپنے دامن میں امید کی کلیاں لئے ہوئے طلوع ہوئی۔ منصور نے آنکھیں کھولیں۔ خالی خالی نظروں سے کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے جلدی سے دودھ میں دوائی کے چند قطرے ٹپکائے۔ ناہید نے دودھ لے لیا۔ اور قطرہ قطرہ ان کے حلق میں ٹپکاتی رہی۔ دودھ تھا۔ یا آب حیات۔ یا پھر ناہید کی مسیحائی منصور ہوش میں آگئے۔ ڈاکٹر نرس خوشی سے پھولانہ سما یا اس دورے سے منصور کا بخت بہت گزر جانا اک معجزے سے کم نہ تھا۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔

”نواب صاحب۔“ وہ چلایا۔ اور نوب صدیق کا دل جیسے ڈوب گیا کرے سے حسرت کی والدہ دوڑی ہوئی باہر آگئیں۔

”مبارک ہو نواب صاحب۔“ ڈاکٹر نے نوید سنائی۔

”کیا کیا۔“ وہ حیران ہو کر ڈاکٹر کا منہ دیکھنے لگے۔

”مبارک..... نواب صاحب بڑی امید بندھ گئی ہے۔ آج پہلی بار انہیں پسینہ آیا ہے۔ دورے سے

بخیریت گزر گئے ہیں نواب منصور.....“

تیسرے دن منصور خطرے کی حد سے باہر ہو گئے۔ کمزوری حد سے زیادہ تھی ڈاکٹر بڑی احتیاط برت رہا تھا۔ خواب گاہ کے ارد گرد کسی کو پھنکنے کی مجال نہ تھی۔ ملنے جلنے والوں کا سلسلہ قطعی بند تھا۔ بخار ابھی اترا نہیں تھا۔ البتہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

ناہید نے ان کی بیمار داری میں دن رات ایک کر دیئے۔ اسے اپنے آپ کا ہوش ہی نہ تھا جیسے۔ رات

رات بھر وہ ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ کسی وقت اونگھ آگئی تو سر وہیں رکھ دیا۔ دن رات کا تو جیسے امتیازی نہ رہا

تھا۔ نرسیں ڈیوٹی بدل بدل کر اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ ایک وہ تھی۔ جسے وقت کا احساس ہی نہ تھا یا سیمین تو اس

پر دیوانہ وار تصدق ہو رہی تھیں۔ اس کے آنے سے ان کو بڑی ڈھارس ملی تھی۔ ان کے سارے غم ناہید نے

بانٹ لئے تھے۔ اور پھر اس کا قدم اتنا مبارک پڑا تھا کہ منصور خطرے کی حد سے باہر ہو چکے تھے۔ نواب صدیق

کو بھی اس کی مجلس اور بے لوث خدمت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ انہیں بھی اس سے ایک طرح کی عقیدت ہو گئی تھی۔

وہ دل ہی دل میں ناہید کے والدانہ جذبات کے قدر دان ہو گئے تھے۔ اور ان کی بہن تو جیسے ناہید کی متوالی تھیں۔

گھڑی بھر کے لئے جب یا سیمین زبردستی اسے آرام کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں لے آئیں۔ تو ان کی

نند بڑے پیار سے اس کا سراپا گو دھیں رکھ کر اس کے پیارے پیارے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتیں۔ ناہید کا

تھکا ہوا دماغ اتنی فرحت محسوس کرتا۔ کہ وہ بے خبری سے سو جاتی۔

لیکن کنبہ کے دیگر افراد کو تو جیسے ناہید سے لہجی بغض تھا۔ دہلی دہلی زبان میں اس پر نکتہ چینیاں ہو رہی

ہو گئی تھی۔

”جیسی اس طرح اس دن سے آئی بیٹھی ہے.....“ بیگم وقار نے بڑی حقارت سے کہا۔

”نئی روشنی ہے بس۔“ سلطانہ بیگم نے پھر لقمہ دیا۔ ”زمانے کی ہوائی کچھ ایسی ہو گئی ہے۔“

”فوج نئی روشنی۔“ بیگم وقار پھنکاری۔ لیکن یاسمین کی آمد پر اسے چپ ہو جانا پڑا۔ عورتیں یاسمین سے منصور کا حال پوچھنے لگیں۔ کوئی بچی تھی۔ کوئی خالہ تھی کوئی ممانی تھی ہر کوئی جتنی رشتہ داری تھی اسی حساب سے احوال پرسی کر رہی تھی۔

”ابھی بخار ٹوٹا نہیں۔“ یاسمین نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ ”لیکن کم ہو رہا ہے انشاء اللہ جلد ہی اتر جائے گا۔ خطرے سے باہر ہیں اب تو اللہ کے فضل سے۔“

”ہمیں بھی دیکھنے کی اجازت ملے گی یا نہیں۔“ بیگم وقار نے جیسے یاسمین پر کوئی احسان کیا۔

”جچی جان فی الحال تو ڈاکٹر نے بڑی سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ کسی کو خواب گاہ کے قریب جانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ بڑی پابندی لگا رکھی ہے انہوں نے.....“ یاسمین نے سادگی سے ساری بات کہہ دی۔ بیگم وقار تو جیسے دل کی آگ بجھانا چاہتی تھی۔ بڑی سختی سے بولی۔

”یہ پابندی صرف ہمارے ہی لئے ہے۔“

”جچی جان آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ یاسمین نے ان کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔ وہ بار بار اپنی طلائی چوڑیوں کو ٹھیک طرح سٹ کر رہی تھیں۔ کوئی بھی تو نہیں جاسکتا ان کے پاس میں جاتی ہوں یا تاہید ہیں وہاں۔“

”ہاں بھئی، ہم کوئی تاہید کے ساتھ تھوڑی ہی مل سکتے ہیں۔“

بیگم وقار کے طنزیہ جملے پر یاسمین کا خون کھول گیا۔ تاہید پہلے ہی انہیں اتنی عزیز تھی۔ منصور کی بیماری میں اس نے اپنی بے لوث خدمت سے تو انہیں جیسے خرید لیا تھا۔ انہیں یہی محسوس ہوتا تھا جیسے تاہید کوئی غیر نہیں انہی کے گوشت پوست کا ہی حصہ ہے۔

”آپ یہاں بیٹھ کر بھی ان کے لئے دعا کر سکتی ہیں۔“ یاسمین بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

”وہ تو گھر بیٹھ کے بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ یاسمین نے ہاں کوئی تلخ مسرا جواب دے کر اس کا منہ بند کر دیں۔ لیکن گھر آئے ممان سے جھگڑنا آئین ممان نوازی کے خلاف تھا۔ غصہ پی کر بولیں۔

”آج ڈاکٹر سے پوچھوں گی۔ انہوں نے اجازت دی۔ تو آپ بھی دیکھ آئیے گا انہیں۔“

بیگم وقار بڑبڑاتی رہی۔ اور یاسمین دوسری خواتین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شام کو انہوں نے ڈاکٹر ڈن سے پوچھا۔ وہ بڑی حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ ”آپ کیا کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ۔“

”کیا کیا جانے ڈاکٹر۔“ وہ کھیانی ہو کر بولیں۔ ”ان رشتہ داروں کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔“

لیکن مجھے افسوس ہے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“ وہ بولا۔ ”ایک دفعہ ملنے ملائے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بس بیماری جمل سے چلی تھی وہیں پہنچ جائے گی۔“

یاسمین کانپ گئیں۔

”یہ دیکھئے۔“ یہ ٹمپر بچہ چارٹ دکھاتے ہوئے بولا۔ ”کن خطرناک مراحل سے گزرے ہیں نواب صاحب۔ بخار اب کم ہو رہا ہے لیکن ذرا سی چوک بڑے مملکت نتائج کی حامل ہوگی۔ بخار اتر جانے کے بعد بھی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ رشتہ داروں کی ناراضگی کو فی الحال کوئی وقعت نہ دیجئے.....“

یاسمین چپ ہو گئیں۔ ان کی نظریں چارٹ پر تھیں۔ اور پچھلے دنوں کے قصور سے ان کا دل کانپ رہا تھا۔

ساتویں دن بخار ٹوٹ گیا۔ منصور کو خدا نے دوبارہ زندگی بخشی۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس بخشش پر یاسمین نے دل کھول کر غرا کو بخشش دی۔ ہزاروں روپے خیرات کر ڈالے قیہوں کو کھانے کھلائے گئے۔ کپڑے تقسیم کئے گئے۔ مسجدوں میں شکرانے بھجوائے گئے۔ نادار طلباء کو مستقل وظائف دیئے گئے۔

ڈاکٹر ڈن کی اب کچھ خاص ضرورت نہ تھی۔ اسے فیس کے علاوہ قدر دانی کے طور پر بہت سہانعام دیا گیا۔ ڈاکٹر جعفر کو بھی اس کی خدمات کا معاوضہ فراخ دلی سے دیا گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر ڈن نے ساری باتیں ڈاکٹر حفیظ کو جو منصور کا خاندانی ڈاکٹر تھا بھجوا دیں۔ احتیاط برتنے کی بار بار تاکید کی۔

”ان کی روزمرہ کی کیفیت سے مجھے مطلع کرتے رہئے گا۔ ضرورت ہوئی تو میں پھر آکر انہیں دیکھ جاؤں گا۔ ہر رات آٹھ بجے کے بعد مجھے فون پر سب حال کہہ دیا کیجئے گا.....“ ڈاکٹر ڈن نے ڈاکٹر حفیظ کو تاکید دی۔ اس نے نہت بہتر کہہ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

اور جب ڈاکٹر ڈن نواب صدیق کے ہمراہ منصور کو الوداع کہنے گئے۔ تو تاہید مس انجیلید سے دوائی لے کر انہیں بلارہی تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر منصور کے قریب آگیا۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد اس نے منصور سے ہاتھ ملایا۔

”میں آپ کا مشکور ہوں ڈاکٹر“ منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نقابت ابھی زیادہ تھی۔ اس لئے اٹھ نہ سکے۔ ”آپ نے بڑی محنت کی۔“

”مشکور تو آپ کو ان کا ہونا چاہئے نواب صاحب“ ڈاکٹر ڈن نے ہنسنے ہوئے تاہید کی طرف دیکھ کر کہا۔

ناہید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نواب صدیق بھی مسکرا دیے۔

”ان کی آمد سے ہی کوئی معجزہ رونما ہوا“ ڈاکٹر بولا ”ورنہ میں تو قطعاً مایوس ہو چکا تھا۔ میں آپ کو آپکی صحت یابی کے ساتھ ساتھ ایسی بہترین دوشیزہ کے انتخاب پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ وہ ایک جانثار بیوی ثابت ہوں گی“ ڈاکٹر ہنسن اپنی مغربی تہذیب کے مطابق بڑی سادگی سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

”ان کی خوش قسمتی میں کسے شک ہے ڈاکٹر“ نواب صدیق مسکراتے ہوئے بولے ”ایسی خدمت گزار لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ میں تو انہیں فرشتہ رحمت سمجھتا ہوں رات دن ایک کر دیئے انہوں نے تمار داری میں۔“

منصور خاموشی سے ڈاکٹر اور نواب صدیق علی خان کی باتیں سن رہے تھے جب سے انہیں ہوش آیا تھا۔ ناہید ان کے پاس تھی۔ آخری دورے سے پہلے اس کا آنا بھی انہیں کچھ یاد تھا۔ وہ کیوں کر آئی۔ کیسے آئی بارہا انہوں نے سوچنا چاہا لیکن ذرا سی سوچ دماغ کو تھکا دیتی۔ وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ اور آج ان دونوں کی باتوں سے تو وہ حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ ڈاکٹر نے جن واضح الفاظ میں ناہید کے انتخاب پر انہیں مبارک دی تھی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ڈاکٹر نے ایسا کیسے کہہ دیا ہے۔ اس نے قیاس آرائی سے کام لیا ہے یا کسی نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ جب یا سمیسن نے اس کا تعارف کرایا تھا۔ منصور بے ہوش تھے۔ اسی لئے وہ آج ان کی باتوں سے کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔



ناہید از خود رفتگی کے عالم میں منصور کے پاس آئی تھی۔ منصور کی حالت جتنے دن مخدوش رہی۔ اسے گر دو پیش کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ لیکن اب منصور کی حالت سنبھل رہی تھی۔ اور ناہید کی بے ہوشیوں کو ہوش آ رہا تھا۔ اسے اپنے جرات مندانہ اقدام پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنی دیوانہ حرکات پر تعجب ہو رہا تھا۔ کنبہ والوں کی نظریں چبھ رہی تھیں۔ بیگم وقار کے زہر میں بجھے ہوئے جملے ناگن کی طرح ڈس رہے تھے۔ اسے خود بھی اپنی بے باکی پر ندامت سی ہو رہی تھی ایک دوشیزہ کا اس طرح پہلے آنا اور یوں ایک نوجوان کے پاس ٹھہرنا خود اس کی نظروں میں بھی اب کھٹک رہا تھا۔ اس کی از خود رفتگی کا رد عمل شروع ہو گیا تھا۔ اسے منصور کی زندہ زندہ نظروں سے حجاب آنے لگا تھا۔ ٹمر بچر لینے وقت یا دوائی دینے وقت اس کا ہاتھ کبھی منصور کے ہاتھ سے چھو جانا تو اس کا چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو جاتا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ نواب صدیق کے تو سامنے آتے ہوئے وہ کتراتے تھی۔ دل ہی دل میں شرم سے کٹ جاتی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود منصور کی تمار داری اسی تندہی اور جانفشانی سے کئے جا رہی تھی۔ کھل علاج۔ پوری احتیاط اور سب سے بڑھ کر ناہید کی قربت کا احساس منصور کی کھوئی ہوئی طاقت کی بحالی میں مدد اور معاون ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے طاقت پکڑ رہے تھے۔ کمزوری رفع ہو رہی تھی۔ اور چہرے کی رنگت بدل رہی تھی۔ اب تنکے کے سارے بیٹھ کر وہ اخبار دیکھ لیا کرتے تھے۔ ہلکی غذائیں بھی ہضم ہونے لگی تھیں ناہید جو اتنے دنوں سے اک جذباتی دور سے گزر رہی تھی نے سوچا کہ اب اسے چلا جانا چاہئے۔ لوگوں کی چھٹی ہوئی نظریں سہارنے کی ہمت نہ رہی تھی اس میں بیگم وقار نے تو جیسے اسے نشانہ ہی بنا لیا تھا۔ سلطانہ بیگم بھی کچھ پیچھے نہ رہی تھی۔ ان دونوں سے تو ناہید کو اب خوف سا آنے لگا تھا۔ جب بھی وہ منصور کو دیکھنے آتیں۔ ناہید حتی المقدور ان کے سامنے نہ آتی۔ لیکن وہ تو منصور کو دیکھنے سے زیادہ ناہید پر اپنا زہر افگن کرنے کے لئے آتی تھیں۔ دو چار طعنے باتیں کر کے ضرور اس کا خون خشک کر دیتی تھیں۔

غرق تھی۔ کچھ لمے ناگوار سے گزرے۔

”آخر آپ کب تک یہی کھڑی رہیں گی“ منصور نے سرگھا کر اسے بھرپور نظروں سے دیکھا ناہید سیاہ گدے دار سٹول کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”لیجئے اس نے دوائی بڑھائی۔ اس وقت وہ ایک تربیت یافتہ نرس کی طرح اصرار کر رہی تھی۔

”وہاں رکھ دیجئے“ منصور نے قریب بڑی ہوئی شیشے کی میز کی طرف اشارہ کیا ”یوں لیگا“۔

”کب پیئیں گے“ وہ قدرے مسکرائی منصور کے رونقے کی وجہ سے جانتی تھی اس لئے پریشان ہونے کی بجائے فطری طور پر محفوظ ہو رہی تھی۔

”جب میری مرضی ہوگی“ منصور نے کہنی کے بل کروٹ بدلی۔ ناہید ان کے بالقابل بیٹھی تھی۔

دوائی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ اپنی زنگالی قبض کی سیاہ دھاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ روشنی دوپٹہ بڑی خوبصورتی سے اس کے شانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ بال شانوں پر دو چوٹیوں کی شکل میں پڑے ہوئے تھے۔ جن میں کالے کالے چوڑے روشنی ربن بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے کانوں میں کالے موتیوں کی بالیاں تھیں جو اس کے دل کی طرح کانپ رہی تھیں۔ اس وقت اس کے حسین چہرے پر منصور کی تاب سے کہیں زیادہ نکھار تھا۔

”ناہید“ منصور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

”جی“ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی بولی۔

”ایک بات پوچھوں“ منصور کہنی نرم نکھینے پر ٹکائے اپنا سر ہٹھیلی پر رکھے اسے اب بھی مگری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ناہید جانتی تھی۔ کہ وہ کس بارے میں پوچھیں گے اس کا دل زور سے دھڑکا گھبراہٹ دور کرنے کے لئے اس نے پھر کہا۔

”دوائی پیجیئے وقت ہو گیا ہے۔“

”آپ نے میری بات کا جواب ہی نہیں دیا“ منصور کچھ مضمل سے دکھائی دے رہے تھے۔

”پہلے دوائی پیجیئے“ اس نے دوائی بڑھادی۔ منصور نے ایک دم دوائی پی لی۔

”شاید نہ مجھے کوئی سوال کرنے کا حق ہے اور نہ آپ کوئی جواب دینے کے لئے تیار ہیں“ منصور نے

ناہید کے ایک بار کے ہونے الفاظ دہرائے۔ ناہید نے مضطربانہ انہیں دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولی۔

”آپ کیا کنا چاہتے ہیں“۔

”آپ یہاں باقی کے بلانے پر آئی تھیں“ منصور نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں“ وہ اپنے دوپٹے کے کناروں سے کھیلنے ہوئے بولی۔

”میری شدید بیماری سے متاثر ہو کر ازراہ رحم تشریف لائی تھیں“۔ انہوں نے دوسرے رخ سے سوال

کیا..... ناہید نے نفی میں سر ہلادیا۔

منصور حیرانگی سے اسے دیکھنے لگے۔ ناہید نے نگاہیں اٹھائیں۔ مجروح نظرس لڑکھڑا کر جھک گئیں۔ تمنائے دید نے نظروں کو پھر سے ابھارا۔ پلکیں جاب کے بوجھ سے جھک گئیں۔ نظروں کے شوق اور پلکوں کے

جواب کی کش مکش میں وہ بار بار آنکھیں جھپک رہی تھی۔

”تو پھر آپ کیسے آئی تھیں“۔ منصور نے کچھ عجیب سا سوال کیا۔

”میں خود نہیں جانتی“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھا یا پلکوں کو اک قیامت خیز جنبش ہوئی۔ ہونٹوں پر اک بے چین تبسم تھا۔ اس نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”کوئی غیر مرئی طاقت مجھے یہاں لے آئی۔“

ناہید نے بڑی معصومیت سے ایک بہت بڑی حقیقت کا اعتراف کیا منصور کی روح فرط مسرت سے جھوم اٹھی۔

”آپ اب واپس کیوں جانا چاہتی ہیں“۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”آپ اچھے جو ہو گئے ہیں“۔ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا منصور کو اس جواب سے بڑی کوفت ہوئی۔ وہ ہٹ کر بستر پر لیٹ گئے۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ چھت کے خوبصورت نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولے۔

”بڑی مشکلوں سے طوفانی پیچیدوں سے بچا یا ہوا سفینہ کنارے سے ٹکرا کر پھر ڈوب سکتا ہے“۔ ناہید بے قرار ہو گئی۔ اس نے بے چین نگاہوں سے منصور کو دیکھا انہوں نے سرگھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آکر چلے جانا تھا۔ تو پھر آپ آئی ہی کیوں تھیں۔ ڈوبنے والوں کو ڈوب جانے دیا ہوتا۔“

”آپ کتنی تلخ باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ شیشے کی میز کی طرف گھوم گئی۔ اس کی آنکھیں غم آلود ہو گئیں۔ آنسوؤں کو چھپانے کیلئے اس نے منصور کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ منصور کے لئے وہ اک پہلی تھی۔

جسے بوجھنے کی وہ اپنے کمزور دماغ میں ہمت نہ پا رہے تھے۔

ناہید اناکار اور اقرار کے جان لیوا پتھر میں پھنسی ہوئی تھی اس کا جی چاہا کہ منصور کے سامنے اپنی ماں کی ہستی کو بے نقاب کر دے اپنے رسوائے عالم خاندان کا پول کھول دے انہیں بتا دے کہ وہ سماج کے گندے اور کرم خوردہ عنصر کی اولاد ہے وہ نسا نیت کے بلند درجے سے بچی ہوئی ماں کی بیٹی ہے۔ اس کے لب پھڑپھڑائے۔

”جانے آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ اس نے انتہائی یارسی سے کہا۔ منصور تڑپ اٹھے وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے۔

کہ ناہید اور ان کے درمیان دولت کی حد بندیاں حائل ہیں۔ ناہید ان حد بندیوں کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی۔

اس کے ان مایوس الفاظ نے منصور کو تڑپا دیا۔ وہ ان کی طرف کمر کئے بیٹھی تھی۔ منصور اس کے لہراتے ہوئے بالوں کو محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ناہید..... میں آپ کو انسان سمجھتا ہوں۔ انسان جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔“

ناہید کانپ گئی۔ اس کا دل چاہتا ہیج کر کے۔ کہ ذرا سی بھول پر اسی انسان کو جنت سے بھی نکالا گیا تھا۔

لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر لاتے لاتے رہ گئی۔

”مجھے ان بلندیوں پر نہ لے جائیے جہاں سے گرنے کے بعد میرا کچھ بھی باقی نہ بچے۔“

اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا منصور نے بے قراری سے کروٹ بدلی۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ان کی آواز شدت جذبات سے کچھ لرز رہی تھی۔

”ناہید میں نہ کسی مغالطے میں رہنا چاہتا ہوں۔ نہ آپ کو رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو کسی بلندی پر

نہیں پہنچایا۔ آپ کا مقام وہی ہے جو پہلے تھا۔ آپ اب تک اس بلندی پر ہیں۔ جہاں میری نظروں نے روز اول آپ کو دیکھا تھا۔ بڑے بڑے کہن لئے آئے لیکن یہ بلندی لازوال تھی لازوال ہی رہی۔“ وہ سانس لینے کو

رکے..... قدرے توقف کے بعد پھر بولے ”مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی باک نہیں کہ پہلی ہی دن سے میں نے اپنی ہستی کو آپ کی ذات میں کچھ اس طرح تحلیل پایا کہ الگ کرنے کی گنجائش ہی نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ آپ بلند یوں سے گرانے کے بعد اگر آپ کا کچھ نہ بچے گا۔ تو میرا بھی کچھ باقی نہ رہے گا۔“

وہ کچھ دیر کو کڑے ناہید اسی طرح اپنے ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ان کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی۔ وہ رو رہی تھی یا چپ تھی منصور کو کچھ بہتر نہ چل سکا۔

”ناہید میں آپ سے رحم کی بھیک نہیں مانگتا۔ نہ ہی اپنی موجودہ حالت پر آپ کا ترس کھا کر ہمدردی جتلاتا مجھے تسکین دے سکتا ہے میں اپنے غموس عشق اور اپنی دیوانہ وار محبت کے بدلے میں کچھ ایسے ہی جذبات کا متنبی ہوں۔“ وہ کچھ دیر ناہید کی پشت پر نظرس جمائے اپنے سانس کی آمد و رفت کو بحال کرتے رہے۔

”اگر آپ کا دل ایسے جذبات سے عاری ہے۔ تو پھر آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔“ وہ نڈھال ہو کر گر گئے

”میں آپ کی کرم فرمایوں کا شکور ہوں۔“

ناہید کی نرم اور گلابی ہتھیلیوں پر آنسوؤں کے قطرے گلاب پر شبنم کی طرح لیز رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ منصور کے سامنے اعتراف کر لینے کی اس نے کوشش کی تھی۔ لیکن انہوں نے جس انداز میں اپنی محبت کا ذکر کیا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ان نظروں سے گرانے چاہتی تھی جن میں وہ حوروں کا تقدس پا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

اور اس کی خاموشی سے منصور کا دل ڈوبنے لگا۔ ان کی نظروں کے سامنے اس دن بازار میں تانگے میں مسکراتی ہوئی ناہید کی تصویر ابھری جس کے قدموں پر ایک نوجوان بھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ اس قدر مضطرب ہوئے۔ کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ نڈھال لینے ہوئے ست آواز میں بولے۔ ”آپ کا دل کسی اور کے لئے ایسے ہی“

..... لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ناہید زخمی ناگن کی طرح تھلا کر چلی۔

”آپ میری توجہن کر رہے ہیں“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”آنسو پارے کی طرح اس کے پیاز پیازی گالوں سے پھسل رہے تھے۔ اس کی گھنی پلکوں کی تیز نوکوں پر سچے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ بے اختیار روئے جاری تھی۔

”بخدا رویے نہیں ناہید“ منصور بے چارگی سے بولے ”آپ کے آنسوؤں سے مجھے قلبی دکھ پہنچ رہا ہے۔“

ناہید کے آنسو سیلاب کی طرح امنڈے ہوئے تھے۔ دل کا سارا غبار دھل رہا تھا۔

”آپ مجھے مار مار کر جلا رہی ہیں۔ اور جلا جلا کر مار رہی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے اپنے ہاتھوں سے ابھی میرا گلا گھونٹ دیجیے۔ میں لمبے لمبے کی موت نہیں مر سکتا ناہید“ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تمام لیا ”میں کچھ نہیں سمجھ سکتا سمجھا دیجیے کچھ تو سمجھا دیجیے۔“

ناہید ڈر گئی۔ کس پھر نہ چکر آجائے۔ منصور کی سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ ان کا زور دھڑکا مگر سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے تھے اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ منصور سر پکڑے آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ وہ کچھ لمبے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ بے حد گہرا رہی تھی۔

جلدی سے اٹھ کر وہ ان پر جھک گئی۔ آہستگی سے ان کے ماتھے پر رکھے ہوئے ہاتھ ہٹائے ان کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ناہید نے کبیل کھینچ کر ان کی گردن تک کر دیا۔ منصور نے آنکھ کھوکھ کر کے دیکھا۔ وہ اب تک ان کے دینچا اک مہم تھا کھینچے کا نہ سمجھائے گا۔

”ناہید میں کچھ نہیں سمجھ سکا“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بڑی کمزور آواز میں بولے ”بخدا مجھے صاف صاف کہہ دیجیے۔“

”کیا کہہ دوں“ ناہید مسکرا دی۔ منصور کی حالت سے وہ سمجھتی تھی طبیعت پر جبر کر کے مسکرائے لگی۔

”میں کیا سمجھوں“ وہ بولے۔

”جو سمجھ کر آپ کا دل مطمئن ہو جائے۔“ اس نے اک حیا آلود جہم سے انہیں دیکھ کر کہا۔

”ناہید“ منصور وہ فرہمست سے چیخے۔

”آرام سے لیٹے رہیں“ یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ناہید گھر نہ گئی۔ یا کین کے ساتھ والا کمرہ اس کے لئے ٹھیک کر دیا گیا۔

منصور کے دل و دماغ میں رینگتے ہوئے اندیشوں نے دم توڑ دیا تھا۔ وہ بڑی سرعت سے صحت پکڑ رہے تھے۔

رات کو گہری نیند سوتے تھے۔ اور بے لگاری کی گہری نیند ان کی صحت کی بحالی کیلئے مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ ان کی رنگت کی کھوئی ہوئی سرخی عود آتی تھی۔ وزن بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اپنی اصلی حالت پر آتے جا رہے تھے۔ مس انجینئر ابھی یہیں تھی۔ لیکن ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ناہید پر ہی تھی یہ ایسا فرض تھا جس کی ادائیگی اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

منصور کی صحت کے پیش نظر ناہید نے اپنے ماضی کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ کر وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ لیکن رات کی تنہائیوں میں جب یہ احساس چھنجھوڑا تو آنکھوں اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیک جاتا اسے کچھ سمجھ نہ آتی کہ کیا کرے منصور کی محبت کا جواب دے کر اس نے غلطی کی تھی یا صحیح قدم اٹھایا تھا۔ وہ اب تک یہ مسئلہ حل نہ کر سکتی تھی۔

سردیوں کی ایک روشن صبح تھی۔ کھڑکیوں کے بھاری پردے اٹھا دیئے گئے تھے۔ ہلکی ہلکی زرد دھوپ اندر آ رہی تھی۔ کمرے کی ہر چیز چمک اٹھی تھی۔ اونچی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔ دھوپ کی زد میں منصور کے لئے آرام کر سی چھٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی چھوٹی سی میز پر اخبار پڑا تھا۔ دوسری بلوریں میز پر منقش راکھ دان اور سگریٹ کیس پڑا تھا منصور اب اپنی خواب گاہ میں اٹھ کر تھوڑی دیر کیلئے چل پھر لیتے تھے۔ وہ اس وقت الماری کے قریب کھڑے کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ مطلوبہ چیز نکال کر الماری بند کر کے وہ آرام کر سی پر آکر بیٹھ گئے۔ سفید گرم ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ کوئی یونانی دیوتا دکھائی دے رہے تھے۔

مالی پھول لے کر آیا تھا۔ ناہید پھول گلدانوں میں بڑے قرینے سے سجا رہی تھی۔ مگرے کا سنی ریشمی کپڑوں پر سرخ سویر بڑا پارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بالوں کو سرخ۔ ریشمی سکارف سے باندھ رکھا تھا۔ اور کاتوں میں مونے مونے سرخ موتی لٹک رہے تھے ان کے چہرے پر ان پھولوں سے زیادہ شگفتگی اور تروتازگی تھی مس انجینئر کو نے والی میز پر جھکی ہوئی ٹیبلٹ چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

”بڑی سردی ہے آج تو“ منصور کی آواز پر دونوں نے ان کی طرف دیکھا انجینئر کے ہاتھ سے پہلی ناہید نے ہلکا سفید گرم کبیل ان کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔

ایک بار اس نے پھر اعتراف حقیقت کرنا چاہا۔ منصور کی دیوانگی کی حدوں تک پہنچی ہوئی محبت سے اسے ڈھارس تھی۔ اس کی ماں طوائف تھی۔ آخر اس کا تصور بھی کیا ہے۔ ماں کے کئے کی سزا وہ کیوں بھگتے اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے پیش اس کے کہ وہ کچھ کہتی منصور انگریزی ماں کی انگلی میں پھنسا رکھے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کو آہستگی سے سلایا۔ ان کی روح کیف و انبساط سے جھوم رہی تھی۔ ان کی آنکھیں محبت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ناہید نے انہیں دیکھا لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ منصور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا جانے شرم و حیا کی پھیلتی ہوئی سرخی چھپانے کیلئے یا کرب و اذیت کی ابھرتی ہوئی لہروں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے۔

منصور بڑی چاہت سے اس کی بخرو طلی انگلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ انگوٹھی بڑی مشکلوں کے بعد اپنے صحیح مقام پر پہنچی ہی گئی تھی آخر۔

ناہید اس دن منصور کے پاس جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ شام کو شیریں اسے ملنے آگئی۔ ناہید کی انگلی پر لپٹے ہوئے۔ رومال کو اس نے تعجب سے دیکھا۔ ناہید نے ہاتھ چھپایا۔

”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے“ شیریں ہنستے ہوئے بولی ”میں بھی دیکھ کر رہوں گی۔“
بڑی جدوجہد کے بعد اس نے ہاتھ کھینچا۔ رومال ہٹایا۔ چمکتی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر وہ شوخی سے مسکرائی۔
”چوری چوری سب کچھ طے کر لیا۔ آج سے ہماری تمہاری دوستی ختم“ اس نے جان بوجھ کر ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ ناہید نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ اور شیریں ہنس دی۔

شیریں دوسرے تیسرے دن اسے ملنے آیا کرتی تھی۔ دونوں کی دوستی میں ابھی تک وہی خلوص تھا۔ اس کے آنے سے ناہید کو بڑا سکون ملتا تھا۔ گواس کی چھیر چھاڑ سے وہ گھبراہٹ جاتی تھی۔ پھر بھی وہ اسے پسند تھی۔ اس کی باتیں اور اس کی حرکتیں دل خوش کن تھیں۔

”ارے بھئی“ شیریں بولی ”ہمیں تو بڑی مدت کا الہام ہو چکا تھا۔ تم ہی چھپا رہی تھیں۔ سب باتیں“ ناہید شرما گئی۔ اور پھر شیریں کے بار بار پوچھنے پر اس نے انگوٹھی کا قصہ سرگمیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سنا دیا۔
”اب اسے چھپائے کیوں پھر رہی ہو“ شیریں نے کہا کیوں کہ ناہید پھر انگلی پر رومال لپیٹ رہی تھی۔
”باجی سے شرم آتی ہے“ ناہید محبوب سی ہو رہی تھی۔

چاہے پر یاسمین نے بھی ان کی صحبت میں شرکت کی۔ بڑی پر لطف باتیں ہوتی رہیں اور جب شیریں جانے لگی۔ تو اس نے ہنس کر یاسمین کو کہہ ہی دیا۔
”ناہید کی انگلی کٹ گئی“

”کیسے“ یاسمین ہڑبڑا کر بولیں۔ ناہید شیریں کی اس غیر متوقع شرارت پر بوکھلا گئی اور جب یاسمین نے زبردستی انگلی دیکھی تو بلا میم کی انگوٹھی خندہ زن تھی۔ ناہید شرم سے کٹ رہی تھی۔ اور شیریں کو لطف آ رہا تھا۔
”اس بے چاری کو تو پتہ ہی نہیں چلا۔ نواب صاحب نے پنادی“ شیریں ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔
یاسمین کے چہرے پر بشاشت سے گلابی رنگ آ گیا۔ انہوں نے بڑھ کر بڑی محبت سے ناہید کی روشن پیشانی چوم لی۔ ناہید نے بے اختیار ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

اور منصور کے جشن رحمت پر ان دونوں کی باقاعدہ مفتی کا اعلان کر دیا گیا۔ یاسمین نے ناہید کو مہر صغ طلائی

”شکریہ“ منصور بڑی گرجو شئی سے مسکرائے ان کے ہاتھ میں آج پھر وہی سفید ڈبی تھی۔ جس میں پلاٹینم کی خوب صورت اور بیش قیمت انگوٹھی چمک رہی تھی۔
مس انجینئر چارٹلے کر چلی گئیں۔ مالی باقی ماندہ پھول اکٹھے کر کے کمرے سے نکل گیا۔ ناہید گلدانوں کو ان کی موزوں جگہ پر رکھنے میں منہمک تھی۔ منصور نے سرگھا کر اسے دیکھا۔ ان کی طرف پشت کئے وہ کوئی نہ انگوٹھی میز پر گلدان رکھ رہی تھی۔

”اف“ منصور کے منہ سے نکلا۔ ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمک رہی تھیں۔
ناہید گھبرا کر پلٹی۔ منصور اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو سلا رہے تھے ہونٹوں کو یوں کاٹ رہے تھے۔
جیسے سخت تکلیف ہو رہی ہو۔ ناہید جلدی سے ان کے پاس آگئی۔
”جانے کیا ہو گیا ہے ہاتھ کو“ وہ ہاتھ کو جھٹک کر بولے ”سوئیاں سی چھ رہی ہیں..... اف“

ناہید پہلے تو جھپکی لیکن ان کی تکلیف کب برداشت کر سکتی تھی۔ گھبرا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے سملانے لگی۔ دوسرے ہی لمحے منصور نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا ناہید ان کی شرارت پر مجبور ہو گئی۔ گھبرا کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔
”چھوڑ دینا“ وہ روہائی ہو کر بولی۔

”اوں ہوں“ منصور ہنستے اور ہاتھ کو زور سے دبایا ”اتنی مشکلوں سے ہاتھ میں آیا ہوا یہ ہاتھ ایسے ہی تھوڑا چھوٹے گا۔“
ناہید نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”کوئی نہیں ہے“ منصور اس کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے بولے۔ ناہید کو ٹھنڈکے باوجود پسینہ آ گیا۔

”بیٹھ بیٹھ“ منصور نے اسے اخبار ہٹا کر میز پر بٹھا دیا۔ ناہید ہاتھ چھڑانے کی جتنی کوشش کر رہی تھی۔ منصور اتنی ہی مضبوطی سے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ ہار کر اس نے کوشش چھوڑ دی۔

”بس، ہتھیار ڈال دیے“ منصور مسکرائے ناہید نے سر جھکا لیا اس کا چہرہ سوہنری کی طرح سرخ تھا۔
دوسرے ہاتھ سے منصور نے سفید ڈبی کھول کر چمکتی ہوئی انگوٹھی نکال۔ لمحہ بھر بڑے پیار سے اسے دیکھتے رہے پھر بڑی سنجیدگی سے بولے۔

”خدا نے بزرگ و دروگر کو حاضر ناظر جان کر میں اپنی محبت کی نشانی کے طور پر یہ انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔“
ناہید کیلئے یہ لمحہ موت سے کم نہ تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی عودی چٹان پر کھڑی ہے۔ توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اسے ہر حال میں گرنا ہے جدھر بھی گرے خوف ناک کھڈیں منہ کھولے اسے نکل جانے کو ہیں۔ تو پھر کیوں نہ اس طرف کود جائے۔ جس طرف عمیق کھڈ کے سرے پر منصور بازو پھیلائے اسے تھام لینے کو کھڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے کود جانے کے زور سے منصور بھی اس کے ساتھ ہی تہا ہی کے اس عمیق اور گہرے غار میں گر جائیں۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے سمیٹ کر ان ڈراؤنے غاروں سے دور لے جائیں۔

نکتن نشانی کے طور پر ہوتا دینے..... اور سنگنی کا یہ اعلان اگر بیگم وقار کے وقار پر تازیانے کی طرح لگا تو بیگم رحمان پر بھی ہم پر بیٹا ناہید کو تو کچھ کہہ نہ سکی تھیں البتہ شیریں کو جی بھر کر کوسا۔

۱۷

زلفی کافی عرصہ بیمار رہے گو بیماری کوئی سنجیدہ قسم کی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی صحت کافی گر گئی تھی۔ منصور کی بیماری کی انہیں اطلاع ملی تھی۔ لیکن مجبوری کی بنا پر آنے سکے تھے ہسپتال سے ڈسچارج لینا مشکل تھا۔ اور پھر انہیں منصور کی بیماری کی معمولی طور پر ہی اطلاع دی گئی تھی۔ اس کی سنجیدگی کا قصداً ذکر نہ کیا گیا تھا۔ جب زلفی کو ان کی صحت یابی کا آثار ملتا تو ان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے تھے۔ جشن صحت یابی میں شرکت کی انہوں نے بڑی کوشش کی۔ ڈاکٹر کو رخصت دینے پر مجبور کیا۔ لیکن اس نے سفر کی اجازت نہ دی۔

ڈسچارج ہو کر ابھی گھر آئے چند ہی دن گزرے تھے کہ انہیں منصور کی شادی کا آثار ملا۔ اب تو نہ دیر کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ ان میں ہمت رخت سفر باندھا اور عازم وطن ہو گئے۔ قہر رونا پہنچ کر جب منصور اور زلفی بغل گیر ہوئے۔ تو دونوں کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

”تم کس قدر کمزور ہو گئے منصور“ وہ انہیں چھاتی سے لگائے ہوئے بولے ”میں کس قدر تڑپا آنے کیلئے کم بخت ڈاکٹر نے اجازت ہی نہ دی۔“

”شکر کیجیئے آپ یہاں تھے نہیں“ صدیق بولے ”مجھے تو جب وہ وقت یاد آتا ہے تو کانپ جاتا ہوں۔ کوئی خدائی کی مہربانی ہوئی۔ ورنہ امید تو کوئی نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہڈن تو قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔“

اور آپ بھی تو پہچانے نہیں جا رہے۔“ منصور ابھی تک زلفی کے بازو قد میں بازو ڈالے ہوئے تھے۔ ”یہ تو تمہاری زیادتی ہے۔ اتنا کمزور تو نہیں ہوا۔“ زلفی ہنسے۔

”شکر ہے گردش کے دن خدا نے پھیر دیئے۔ ایک طرف آپ کی بیماری کا خیال تھا۔ دوسری طرف ان کی یاسین بولیں ”اللہ کالاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے یہ دن دکھایا۔“

دوسری رات سب قہر رونا کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کھانا کھا کر سب ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ بڑی دیر تک منصور کی بیماری کی باتیں ہوتی رہیں۔ زلفی سن سن کر لرز اٹھے۔ ہر کوئی اپنا اپنا بیان بڑی وضاحت سے دے رہا تھا۔ منصور کھڑکی کے قریب کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کی باتیں سن

سن کر انہیں بھی تعجب ہو رہا تھا۔ انہیں یقین نہ آرہا تھا۔ کہ وہ اتنے مہینے دور سے گزرے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں ناہید کا ذکر آ گیا۔

طرح محسوس کر رہی تھیں۔ غش پر غش آرہے تھے۔ رخصتی کے وقت۔
 یاسمین کو وہ وقت یاد آگیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے محفل کچھ سوگوار سی ہوتی جا رہی تھی۔ زلفی نے ہنس کر ہانسہ پلٹ دیا۔
 ”بھئی یاسمین کے غش کھانے کی اور وجوہ بھی تو ہو سکتی تھیں“ زلفی ہنس کر بولے..... شوخ نظروں سے یاسمین کو دیکھا اور پھر شرارت سے بولے ”ہو سکتا ہے یاسمین کو زبردستی صدیق کے پلو سے باندھا جا رہا ہو۔ اور اس بات پر.....“

”اوکی اللہ“ یاسمین چیخیں ”زلفی بچا آپ تو خواہ خواہ کی باتیں بنادیتے ہیں۔“
 یاسمین کے سٹ پٹانے پر سب ہنس دیے۔ محفل کارنگ بدل گیا۔ صدیق تودل کھول کر ہنسے۔
 ”کیوں یاسمین یہ بات تم نے آج تک مجھے نہ بتائی“ وہ بولے۔
 ”بڑے دل گردے کی عورت ہیں پہاڑ بھی سر پر آکرے پرواہ کرنے والی نہیں۔ آخر کو تو ہماری بیٹیا ہیں۔“ زلفی بھی ہنس کر بولے یاسمین کھیانی ہو گئیں۔
 ”ذکر تو نابید کا ہو رہا تھا آپ سب میرے پیچھے ہی بڑگئے“ وہ اب تک جھینپ رہی تھی۔
 ”ناہید کیا ہوا۔ درنایاب کمو۔“ زلفی نے ستانے کو کہا۔
 ”درنایاب سی سی“ وہ جل کر بولیں۔
 ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہاں رہنے سے انہیں ذہنی کو فٹ ہو رہی ہوگی“ نواب صدیق بولے ”وہ بڑی غیور اور حساس لڑکی ہیں۔“
 ”وہ یہاں ہیں“ زلفی تعجب سے بولے۔
 ”اور کہاں جائیں“ یاسمین نے کہا اپنے بلکے زرد رنگ کے ریشمی سوٹ کا کادانی کام دیکھتے ہوئے وہ کسی سوچ میں کھو گئیں۔
 ”میں نے تو انہیں دیکھا ہی نہیں“ زلفی بولے۔

”آپ شادی کے بعد ہی دیکھ سکیں گے“ صابرہ بیگم اپنا سفید دوپٹہ شانوں پر ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔
 ”رو نمائی تیار رکھیے۔“
 ”اگر میں ابھی دیکھنا چاہوں تو۔“ زلفی نے بڑے شوق سے کہا۔
 ”یہ تو میرے خیال میں ممکن نہ ہوگا۔“ یاسمین مسکرائیں ”میں نے ان کا سب سے پردہ کرا دیا ہے۔“
 ”منصور سے بھی۔“ زلفی حیرانگی سے بولے۔ منصور جانے کب کمرے سے جا چکے تھے۔
 ”اور کیا۔“ یاسمین ہنسی ”ان سے پہلے اوروں سے بعد میں۔“
 ”بڑی عجیب بات ہے“ زلفی بولے۔ آزاد خیال بچا کو جانے کیوں یہ بات بڑی ہی عجیب لگ رہی تھی۔

”وہ ہمارے لئے باعث صدر رحمت ہوئیں۔“ یاسمین بڑے پیار سے ناہید کے متعلق اظہار خیال کر رہی تھیں۔
 ”وہ تمہارا درنایاب“ زلفی بچانے یاسمین کو چھیڑا۔
 ”یہ تو میں بھی کون گا زلفی ماموں“ نواب صدیق بولے ”وہ واقعی درنایاب ہیں۔“
 شوہر کی طرف داہری سے یاسمین نے اک فخر سا محسوس کیا۔
 ”جس خلوص اور جانفشانی سے انہوں نے منصور کی تیار داری کی ہے مجھے تو ان سے کچھ دلی عقیدت ہو گئی ہے۔“ نواب صدیق کی بہن صابرہ بیگم بولیں ”اور شکل صورت بھی تو قدرت نے ایسی بنائی ہے۔ کہ دیکھنے سے طبیعت سیرتی نہیں ہوتی۔“
 ”آپ سب پر تو جیسے انہوں نے جادو کر دیا ہے۔“ زلفی ہنستے ہوئے بولے ”میں بھی انہیں کی تعریف میں مصروف نظر آرہے ہیں۔“
 ”آپ دیکھیں گے تو جان جائیں گے“ یاسمین بولیں ”کہ ہمارے بیان میں کتنی صداقت ہے۔“
 منصور بظاہر ان باتوں پر کوئی دھیان دینے بغیر سگریٹ پینے میں مصروف تھے لیکن ان کا رواں رواں سرشار تھا۔ ناہید نے ان کے خاندان والوں کی نظر میں بھی اک بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہ بات ان کے لئے صدا خوشیوں کا باعث تھی۔ بلکہ نیلے رنگ کے گرم سوٹ میں ان کا چہرہ بڑا ہی دلقریب نظر آرہا تھا۔
 نواب صدیق ان کی بہن اور یاسمین بھی ناہید کے والد و شیدا نظر آتے تھے۔ بڑی دیر تک اسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔
 ”ان کے والدین نہیں ہیں۔“ یاسمین کو جیسے روحانی صدمہ ہو رہا تھا۔ دنیا میں کوئی نہیں جسے اپنا کہہ سکیں ”وہ اپنا ریشمی زرد دوپٹہ بے چینی سے مسل رہی تھیں۔ جس پر کالی گوٹ لگی ہوئی تھی۔
 ”ہم تھوڑے ہیں“ زلفی ہنستے ہوئے بولے ”کیوں صدیق۔“
 ”میرا مطلب ان کے رشتہ داروں سے تھا“ یاسمین بڑی افسردگی سے کہہ رہی تھیں ”آج کل بڑی پرمردہ سی رہتی ہیں“ منصور نے پلٹ کر یاسمین کو دیکھا۔ ٹائی کی گرہ جیسے گلے میں پھنس رہی تھی۔
 ”مجھے خود بدترس آتا ہے ان پر“ صابرہ بیگم بولیں۔
 ”یہ مشرقی لڑکیاں شادی سے پہلے پونہی بسور کرتی ہیں۔“ زلفی بولے ”وہ بھی اس پرانی روایت کو زندہ رکھنے کے لئے مغموں رہنے کی کوشش میں ہوگی۔ ورنہ ان کے افسردہ ہونے کی وجہ تو بظاہر کوئی نہیں۔“
 ”اور سنو“ صابرہ بیگم بولیں ”یہ کیا کم وجہ ہے زلفی ماموں۔ نہ گھر بار نہ ماں نہ باپ۔“
 یاسمین ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔
 ”ماں باپ نہ تھے۔ کوئی قریبی عزیز ہی ہوتا۔ جب بھی اتنی آزر وہ نہ ہوتیں کم از کم اپنے گھر سے رخصت کرنے والا تو ہوتا۔“
 زلفی کو ناہید کے حالات کچھ بھی معلوم نہ تھے۔ جس انداز سے دونوں خواتین گفتگو کر رہی تھیں۔ زلفی بڑے متاثر ہوئے۔
 ”یاسمین کی شادی یاد نہیں“ صابرہ بیگم بولیں ”اللہ کے فضل سے سب کچھ تھا باپ کی کی یاسمین کس

دیا جائے گا۔

وہ سب باتوں میں مشغول تھے اور منصور لمبے لمبے برآمدوں کو طے کرتے ہوئے چوڑی بالکنیوں سے ہوتے ہوئے تیزی سے ناہید کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ ناہید کے متعلق انہوں نے یا سمین سے دو ایک بار پہلے بھی سنا تھا کہ وہ بڑی مضمحل رہتی ہیں۔ اب بھی وہ زلفی بچا کو یہی کہہ رہی تھیں۔ ناہید کو دیکھتے ہوئے دن ہو چکے تھے۔ جب سے یا سمین نے پابندی لگائی تھی وہ اس پابندی کی پابندی بڑی پابندی سے کر رہے تھے۔ لیکن آج ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ناہید کا مضمحل حال ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔

ناہید کے کمرے میں روشنی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کمرے کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا تھا اور پردہ ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ روشنی ایک لکیر کی صورت میں برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ روشنی کی یہ لکیر پردے کے ہٹنے سے کبھی پھیل رہی تھی۔ کبھی سکڑ رہی تھی۔ جانے کیوں منصور بے دھڑک اندر جانے کی جرات نہ کر سکے۔ وہ برآمدے میں ٹپٹپٹے ہوئے اندر جانے کے متعلق سوچنے لگے۔

کھڑکی کا پردہ ہوا سے اٹھا منصور نے دیکھا ناہید اپنے پٹنگ پر الٹی لیٹی تھی۔ سرخ شنیل کی چمکتی ہوئی رضائی اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کے ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نرم نرم پچیلے نکیلوں پر بازوؤں کا حلقہ ساکنے وہ اپنے ہاتھ میں بڑی ہوئی منصور کی پرستانی ہوئی انگوٹھی کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ پردہ گر گیا منصور کو ہوا کی یہ چھین بڑی ناگوار گزری۔ ہوا کا جھوٹا پھر آیا۔ پردہ پھر اٹھا۔ ناہید کروت بدلے لیٹی تھی۔ اس کا منہ کھڑکی کی طرف تھا۔ اس کا چہرہ واقعی اترا ہوا تھا لیکن حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔ وہ اب بھی انگوٹھی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پردہ پھر گر گیا۔ کچھ دیر آہستہ آہستہ لرزنا رہا۔ منصور کو سوائے سرخ رضائی کے کچھ نظر نہ آ سکا۔ ایک تیز جھوٹکا آیا۔ لڑوٹا ہوا پردہ اڑا۔ ناہید کا ہاتھ اس کے لبوں کے قریب تھا۔ بڑی محبت سے اس نے انگوٹھی کو چوم لیا۔ منصور کو جیسے اپنی محبت کا جواب مل گیا۔ ان کے دل کا بیانا خوشیوں کی شراب سے لبریز تھا۔ پردہ گر گیا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ جو وہ ناہید کی آنکھوں کے پردے سے ہوتے آنسو نہ دیکھ سکے۔ ناہید کی مسرور تہنائیں میں غل ہونا مناسب نہ سمجھ کر منصور شاداں و خرمال لوٹے ہوا سر دھتی۔ رات سانی منصور مگن گنا تے ہوئے تیز قدموں سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ قمر عثمان کے خاموش درو دیوار ایک مسرور ہنگامے کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ ناہید کے لئے جتنی اچھوتے اور دیدہ زیب لمبوسات تیار ہو رہے تھے۔ جدید و قدیم وضع کے زیورات تیار ہو رہے تھے۔ ہیرے موتی افزائش حسن کے لئے نئی نئی قسم کے زیورات میں لگائے گئے تھے۔ جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہمانوں کو بلاوے کی جیسے جارہے تھے۔ اور نواب منصور کا تقریباً سارا کتبہ قمر عثمان میں جمع تھا ہر منتفع کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف

منصور نے جس دن سے ناہید کو انگوٹھی پرستانی تھی۔ ناہید کی جھجک بہت بڑھ گئی تھی۔ اور مگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد تو شرم دھیا کے یہ فطری جذبہ کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ یا سمین نے جنہیں المرحومانی کی نفسیات سے آگئی تھی۔ یہی مناسب سمجھا کہ اس کا منصور سے باقاعدہ طور پر پردہ کر دیا جائے۔ اس انوکھی و ضد اداری پر منصور یا سمین سے بچوں کی طرح الجھے تھے۔ بڑی بڑی دلیلوں سے قائل کرنا چاہتا تھا..... وہ بتیاری کے دور ان میں دن رات ان کے پاس رہی تھی۔ آخر اب پردے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ناہید کے حجاب اور جھجک کے پیش نظر یا سمین نے ایسا کیا تھا۔ منصور کو ایسی میٹھی ڈانٹ دی کہ دوبارہ انہیں اصرار کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

منصور سے ناہید کا پردہ جب کہ پہلے سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ زلفی کی نظروں میں کوئی مستحق فضل نہ تھا۔ ”منصور سے پردہ کروانا فضول تھا یا سمین“۔ زلفی بولے۔

”زلفی چچا اس میں بھی کچھ مصلحت ہے۔ ناہید کی طبیعت میں قدرتی جھجک ہے۔ دوسرا بڑی حساس بھی ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ بڑی افسردہ رہتی ہیں آج کل۔ اس طرح الگ تھلگ کرنے سے انہیں بڑی حد تک ذہنی سکون مل رہا ہے۔“ یا سمین نے اپنی منطق پیش کی۔

”میں نے تو رائے دی تھی۔ کہ انہیں فیض آباد والی کوٹھی میں منتقل کر دیا جائے۔ صدیق نے کہا۔“ وہیں سے رخصت ہوں۔ برات وہیں جائے۔“

”میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“ یا سمین بولیں۔ ”وہ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہی ہیں کہ ان کا گھربار نہیں۔“ یا سمین کو ویسے بھی برات دیکھنے کا ارمان تھا۔ اور قمر عثمان میں ہی شادی انجام پاتی تو انہیں یہ خواہش چکنا پڑتی تھی۔

”فیض آباد جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ زلفی شاید یا سمین کی خواہش کو پاگئے تھے مابذولت کی ذات باہر کات کس کام آئے گی آخر۔ قمر فردوس میں بھیج دیجئے انہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم ہی باپ بن جائیں گے۔ منصور کی دلہن کو افسردہ تو ہم دیکھنے سے رہے۔“

زلفی کی بات پر سب ہنس دئے۔ لیکن جب انہوں نے سنجیدگی سے کہا..... ”اتنی سی بات سے اگر کسی کے جذبات مجروح ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ تو پھر تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔“

زلفی نے ناہید کو قمر فردوس نے جا کر ایک باپ کی طرح پورے اہتمام سے رخصت کرنے کی تجویز پیش کی۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ یا سمین کی تو خوشی کی حد نہ تھی۔ ان کا ارمان پورا ہو جائے گا۔ منصور کی بارات پوری شان و شوکت سے جائے گی۔ یہی وہ چاہتی تھیں۔

”ناہید سے پوچھوں گی“ یا سمین کچھ سوچتے ہوئے بولیں ”اگر وہ مان گئیں تو انہیں قمر فردوس میں منتقل کر

پہلے اس نے اسی ماضی سے خوف زدہ ہو کر اپنی محبت کا گلا دو چا تھا۔ لیکن زندہ و جاوید محبت مرنہ سکی۔ منصور کی بیماری نے اس محبت کو غیر فانی بنا دیا۔ لیکن اپنے ذلیل خاندان کا احساس ناہید کے دماغ نے مٹ نہ سکا۔ اس نے کوشش کی کہ منصور کو سب کچھ بتا دے لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ اس خیال سے کہ وہ منصور کی محبت کو کھونانہ چاہتی تھی۔ کچھ منصور کی کمزوری سے خائف تھی۔ یہ بات ہم بن کر بھی تو ان پر گر سکتی تھی۔ ناہید نے خاموشی ہی کا مجبوراً سہارا لیا اور منصور کی انگوٹھی پہنا دینے کے بعد کچھ بتانا تو ان کی محبت کو کند چھری سے ذبح کرنے کے مترادف تھا۔ ناہید یہی سوچ کر چپ رہ گئی تھی لیکن احساس دن بدن شدید ہو رہا تھا۔ اس کا معمولی سا قصور خود اس کی نظر میں ایک ناقابل معافی جرم بن چکا تھا۔

اور یاسمین اس کے اضمحلال اس کی پرمردگی اور افسردگی کی وجہ اس کا دنیا میں تنہا ہونا سمجھ رہی تھیں۔ سارے دن میں وہ بڑی مشکل سے دس پندرہ منٹ کے لئے اس کے پاس آئیں۔ اسے سمجھاتیں۔ تسلیاں دیتیں۔ ناہید ان کی موجودگی سے اور بے چین ہو جاتی اس وقت کا خیال کر کے کانپ جاتی جب یاسمین کو پتہ چلے گا محبت پاش نظریں قبر پر سائیں گی اس ذلالت کے خیال ہی سے ناہید کا جیسے دم نکل جاتا اور کئی بار اس نے ہجوم افکار سے خود کشی کا ارادہ کیا۔ لیکن اس سے منصور کی ذات وابستہ تھی۔ اس کی خود کشی منصور کے لئے اک جلتا ہوا طعن بن جائے گی۔ ان کی رسوائی ہوگی۔ جگ ہنسائی ہوگی۔ اور ناہید کو منصور کی تصفیک مرکز بھی گوارہ نہ تھی۔ اک نورانی صبح سلطان پور کے بلند دست پر پھیلی ہوئی تھی یاسمین اسے دیکھ کر بے چین ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ناہید کو چائے پلائی۔ بڑی محبت سے اسے چکارتے ہوئے بولیں۔ ”تم تو پگلی ہو ناہید۔“ یاسمین کا اپنا دل بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اور ناہید کو ان کی موجودگی اور ان کی مخلص باتیں نوکیلے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ اس کا دل شدت سے ملامت کرنے لگا۔

”آخر ماں باپ ساری عمر تھوڑا ہی ساتھ بیٹھے رہتے ہیں ہماری طرف دیکھو امی حضور کو منصور کے سرے کے پھول دیکھنے کا کتنا ارمان تھا۔“ یاسمین کا دل بھرا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے وہ والدین کی کمی کی خلش محسوس کر رہی تھیں۔ ماں کا نام لیتے ہی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اور دوسرے لمحہ وہ بے اختیار رو رہی تھیں۔ ناہید کو تسلی دیتے دیتے اپنا ہی بیانا ممبر چمک گیا۔ اور ناہید کو تو جیسے اک بہانہ مل گیا۔ وہ کچھ اس بے قراری سے روئی کہ اسے چپ کرانا محال ہو گیا۔ یاسمین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنے آنسو جلدی سے پونچھ ڈالے وہ ناہید کو چپ کرادی تھیں۔

”بس اب چپ بھی ہو جاؤ میری اچھی بہن۔“ انہوں نے ناہید کی پیشانی چوم لی۔ آنسو اب بھی ان کی پلکیوں پر ٹھہرے ہوئے تھے ان کا گلابی چہرہ تھما ہوا تھا ناہید کا سینہ غم سے پھنسا جا رہا تھا۔ اس کی سانس غیر متوازن ہو رہی تھی۔ اور اس کے دماغ کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

یاسمین کو تو سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ بڑی مدت کی تنہا آئی تھی۔ ایک ہی ایک بھائی تھے۔ وہ یہ شادی بڑے ترک و احتشام سے کرنا چاہتی تھیں۔ دولت کی ذرا سی سیڑھی ان کی خواہش نہ پوری ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔ جو دن قریب آ رہے تھے یاسمین کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انہیں یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کوئی کام بھی مکمل نہیں ہوا۔ سب کام ادھورے پڑے ہیں۔ محل کے سینکڑوں خدام اور کنیزیں ان کے اشارے پر ناچ رہے تھے۔ اور محل کے خاندان کو تو سر کھانے کی فرصت نہ تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔

اور ناہید کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی شادی نہیں موت کا دن قریب آ رہا ہے وہ ہر وقت اپنے خیالات میں غلطیاں و پچھان رہتی۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔ ”تو نے منصور کو دھوکہ دیا ہے۔ تو نے ان کے خلوص سے بیہانہ کھیل کھیلایا ہے۔ تو نے ان کے عشق سے غاصبانہ چال چلی ہے۔ تجھے سب کچھ بتانا چاہئے تھا کچھ بھی چھپانا نہیں چاہئے تھا۔ یہ آئین وفاداری کے خلاف ہے۔ یہ وضعداری عشق کے منافی ہے۔ اس کا انجام بڑا بھیاںک ہو گا بڑا دردور ہو گا۔“

ضمیر کی یہ آواز سننے سننے ناہید کا دماغ کچے پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا اسے اپنی غلطی کا اعتراف تھا اپنے جرم کا احساس تھا۔ بار بار اس نے ارادہ کیا تھا لیکن ایک دفعہ بھی کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ شاید یہ اس کی اخلاقی کمزوری تھی۔ یا قصداً اس نے منصور کے سامنے اپنے ماضی کو عیاں نہ کیا تھا۔ وقت گزر چکا تھا وہ کتنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی یہ وہ جہاں تھا وہیں رہا اور اس بھاری بوجھ کے نیچے اس کی پاکیزہ روح چیخ رہی تھی اس کا ضمیر تلملارہا تھا۔ وہ اپنی آگ میں آپ ہی جل رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا معلوم ہونے لگتا وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ ”اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں تو کیا ہو گا۔۔۔۔۔۔“ اس کی روح تک لرز اٹھتی۔ اس کا دل بیٹھے لگتا اسے محسوس ہوتا کہ اس نے آگ سے بچنے کے لئے جیسے انگڑاں پر پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ ایک کھائی سے بچنے کے لئے اس سے عیش اور گمری کھائی میں کود گئی ہو۔ معمولی خطا کو چھپانے کے لئے بہت بڑے جرم کی مرتکب ہو گئی ہو۔

اس کے حواس پر اک نامعلوم سا خوف چھا تا جا رہا تھا۔ یہ خوف ماضی کا نہ تھا مستقبل کا تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ماضی اس کا تعاقب کرتے کرتے ہار گیا تھا اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا تھا۔ اور اب ماضی مستقبل کے روپ میں سامنے کی طرف سے اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اور ہر گزرنے والا لمحہ اسے مستقبل کے زہر آلود پتوں میں دینے میں کے لئے آگ کی طرف دھکیل رہا تھا۔

ناہید کے دن رات کش مکش میں گزر رہے تھے کبھی تو اس کی آنکھوں میں جگر ویرانیاں گھر کر گئیں۔ اور کبھی آنسوؤں کے سوتے ابل پڑتے کچھ اس طرح الجھی تھی کہ سمجھنے کا امکان ہی نہ رہا تھا۔

تیار یاں دھوم دھام سے ہونے لگیں۔
 قصر عمارتوں سے کچھ کچھ بھری تھی۔ کئی دنوں سے ضیافتیں اڑائی جا رہی تھیں۔ ناچ گانے کی محفلیں
 ہو رہی تھیں۔ کھوے سے کھوا پھلدار ہاتھا۔ لیکن آج تو مسمان کچھ اس کثرت سے آئے تھے کہ قصر عمارتیں وسیع
 عمارت بھی جنگ معلوم ہونے لگی تھی۔
 آج منصور کی شادی کا دن تھا۔

حرم سرا کے ایک طویل و عریض کمرے میں روپہلی مسند پر کم خواب کی شہزادی پسنہ دو لہجے بیٹھے تھے
 ناہید آج روحانی طور کے علاوہ دینی اور دنیاوی طور پر بھی ان کی ہونے والی تھی خوشیوں کا بحرنا پیدائنا پھیلائی جا رہا
 تھا۔ ان کے دل میں سریتیں اس کی وسعتوں سے بڑھ چڑھ کر سانس کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور ان کا مرانوں
 کا پر تو ان کے بے مثال مردانہ حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ ان کا چہرہ چمک رہا تھا اور ان کی آنکھوں میں خمار انگڑائیاں
 لے رہا تھا۔

سنہری کم خواب کے بھاری غرارے آڑے فراک اور چلیے مہین دوپٹے میں یاسین ادھر ادھر چمکتی پھر رہی
 تھیں۔ بھاری بھاری مہر صبح زیورات پہنے وہ عروس نو معلوم ہو رہی تھیں۔ آج ان کی زندگی کا مسرور اور
 مصروف ترین دن تھا وہ بڑے چاؤ سے خاندانی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے رسوم ادا کر رہی تھیں یہ شادی ان
 کے خاندانی رسم و رواج کے مطابق انجام پاری تھی۔

خاندان کی عورتیں اور مرد منصور کو گھیرے ہوئے تھے۔ کمرے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کان پڑی
 آواز سنائی نہ دیتی تھی کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ کوئی قہقہوں کا طوفان اٹھا رہا تھا۔ پچھلی شادیوں کے دل
 چسپ واقعے دہرائے جا رہے تھے۔ شاب نکرارہے تھے۔ جوانیاں مچل رہی تھیں۔ اک شور تھا بنگامہ تھا۔ اور
 باہر قصر عمارت کے مسمانوں سے بھرے ہوئے چمنوں میں بینڈول نواز نغمے بجا رہا تھا۔

ملازمہ چاندی کے تھال میں چمکتے ہوئے پونڈ لے یاسین کی طرف بمشکل جگہ نکال کر بڑھی تھال ان کے ہاتھ
 میں تھماری۔ انہوں نے منصور کا صدقہ اتارا۔ اور پھر جو صدقہ اتارنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہوتا نظر نہ آیا۔ ہر
 رشتہ دار اپنی حیثیت کے مطابق پونڈ تھال میں رکھ رہا تھا۔ چاندی کا بڑا تھال دیکھتے ہی دیکھتے چمکتے ہوئے سکوں سے
 بھر گیا۔

”یہ چونچلے اب ختم بھی ہوں۔“ نواب انظر جو منصور کے رشتہ کے کاموں تھے آگے بڑھے۔ ”صدیق آپ
 تو بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ یہ رسمیں ختم ہوتے ہوتے تو شام ہو جائے گی لوگ باہر انتظار کر رہے ہیں۔“
 ”ابھی تو برات کا خیر مقدم کرنے والے ہیں۔“ صدیق مسکراتے ہوئے زلفی کی طرف دیکھ کر بولے۔
 ”تم سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔“ زلفی بولے۔ ”بڑی مدت کے بعد یہ رسوم دیکھنے میں آئی ہیں۔“ وہ ان

شام کو یاسین نے شیوس کو بلا بھیجا۔ اسی کے ذریعے ناہید کو قصر فردوس جانے کی تجویز سے مطلع کیا۔
 جگہ کی تبدیلی شاید اس کے بھائی افکار کے لئے وجہ تسکین بن جائے۔ اس خیال سے ناہید نے رضامندی
 دے دی اور دوسرے دن تین موٹریں قصر فردوس کی طرف جا رہی تھیں۔ صابرو بیگم پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھیں۔
 ناہیدنا سارا ابو جہ شیریں کے کندھے پر ڈالے بے خودی بیٹھی تھی۔ دوسری موٹروں میں خاندان کی معمر اور سنجیدہ
 عورتیں تھیں۔

قصر فردوس کے شان دار پورچ میں زلفی نواب صدیق کے ہمراہ کھڑے مسمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔
 ”اب اترو بھی۔“ شیریں نے موٹر کے پائیدان پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”باہر کون کون ہے۔“ ناہید نے پوچھا۔ وہ زلفی اور صدیق کے سامنے اترتے ہوئے ہچکچاہتی تھی۔
 ”ایک تو غالباً تمہارے نندوئی ہیں۔“ شیریں ہنس کر بولی۔ ”اور دوسرے تمہارے والد بزرگوار۔“
 ناہید نے سر جھکا لیا اسے شیریں نے بتایا تھا کہ زلفی ایک باپ کی طرح اس کی رخصتی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں
 باپ..... اس کے لئے یہ ایک بے معنی سلفظ تھا۔ لیکن اس کی روح نے اس تشنگی کو بیشی شدت سے محسوس کیا
 تھا۔

”تشریف لائیے۔“ صدیق موٹر کے قریب آتے ہوئے بولے۔
 ”کیا بات ہے۔“ زلفی بھی صدیق کے قریب آگئے۔ ”اتریوں نہیں رہیں۔“
 ”وہ کتنی ہیں مجھے اباحضور کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ ناہید کو دیکھ کر شیریں نے شرارت
 سے کہا۔ ناہید دانت پھیر کر رہ گئی اور زلفی اور صدیق شیریں کی بات پر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیے۔
 ”لو بھئی ہم چلے جاتے ہیں۔“ کہتے ہوئے زلفی صدیق کے ساتھ برآمدے کے بغلی کمرے میں چلے
 گئے۔

قصر فردوس میں ناہید کے آجانے سے بڑی ہلچل مچ گئی۔ زندگی کی اک لہر دوڑ گئی۔ اور زلفی ناہید کے وداع
 کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے پوری سنجیدگی کے ساتھ پورے اہتمام کے ساتھ۔

مدوا انجم کی تابندگی سے رات کی تیرگی تو نہیں مٹی۔ البتہ چاندنی سے اندھیرا دور دھیا سا ضرور ہو جاتا ہے۔ یہی
 حال ناہید کا ہوا شیریں کی صحبت اور ماحول اور جگہ کی تبدیلی نے ناہید پر خاطر خواہ اثر کیا۔ اسے کچھ وقتی طور پر سکون
 مل گیا۔ سارا دن شیریں اسے جاوے جاذاق کر کے ہنساتی رہتی۔ ہاں رات کے تاریک لمحے ابھی تک ایک ہی
 تھے۔ لیکن دن بھر کا تھکا ہوا دماغ اکثر نیند کی لپیٹ میں آ جاتا۔ اور وہ تلخ حالات سے غافل ہو جاتی۔ واقعات کو اس
 نے حالات پر چھوڑ دیا اپنی کشتی حیات کو تقدیر کے دھارے پر بسنے دیا۔ اور اس بات سے وہ قدرے مطمئن بھی
 ہو گئی۔

تیسرے دن ناہید کو دلن بٹایا جا رہا تھا۔ اسے گلاب کے عرق سے غسل کروایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر خوشبوئیں ملی گئی تھیں ہانگ میں افشاں بھری گئی تھی؟ سرخ قیمتی کواب کے بھاری غرارے اور آڑے فراک پر زرد تار دوپٹہ اوڑھے وہ جگلی بیٹھی تھی تنگ چولی سے اس کا شباب چمک رہا تھا قیمتی طلائی زیورات اور ہیروں کے کئی سیٹ اسے پہنائے گئے تھے اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔ نگاہوں کو خیرہ کرنے والے زیورات، بھڑکیلے لباس عروسی اور انوکھے سنگار سے ناہید کا ملائیک فریب حسن اور اجاگر ہو گیا تھا دیکھنے والوں کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں قدرت کی مناعی کے اس بہترین شاہکار کو دیکھ کر سبھی عیش عیش کر رہے تھے ایک بیگم وقار تھی جس کے سینے پر اسے دیکھ کر سانپ لوٹ رہے تھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اس کی جگہ آج صبیحہ دلن بنی تو کتنا اچھا ہوتا۔

وہ جان بوجھ کر ناہید کے کمرے میں گئی۔

”آئیے۔“ صابیرہ بیگم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ”بیٹھے۔“

”نہیں مجھے بیٹھنا نہیں۔“ وہ بڑے غرور سے بولی۔ ”میں تو گھوم پھر کر اپنے منصور کا سسرال دیکھ رہی ہوں۔“ وہ طنزیہ بڑے زور سے ہنسی۔ اور اس کے طنز کو سب نے بری طرح محسوس کیا۔ یاسمین نے کہا جانے والی نظروں سے اسے گھورائیں نے بھی اک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر دل ہی دل میں کوسا۔ خاندان کی دوسری نوعمر لڑکیاں بھی اسے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ بیگم وقار کچھ نادم سی کھیانی ہو کر جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ ناہید کا گھائل دل طنز کا یہ چر کا بھی چپ چاپ سار گیا۔ وہ تو بے جان مورتی کی طرح بیٹھی تھی۔ جسے آراستہ کیا گیا تھا..... اسے نہ تو اپنی دویشیگی کے ناقابل فراموش دنوں کے دوار کا غم تھا نہ ازدواجی کے پر ہمار لحوں کی آمد کی خوشی۔ اسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی زندہ نعش کی بڑے ارمانوں سے تجویز و تکلیف کی جاری ہو۔ بیگم وقار کے طنز کو محسوس کرنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

رخصتی کے وقت منصور اندر آئے ایک وسیع ہال کے درمیان ایک تخت نمائند چمکی ہوئی تھی منصور کے پہلو میں ناہید لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا دم گھٹ رہا تھا خاندانی ہجوم ایک بار پھر ان پر ٹوٹ پڑا تھا یاسمین کو مبارکبادیں دی جا رہی تھیں اور وہ ہنس ہنس کر مبارکبادی کا جواب دے رہی تھیں۔

”کاش آج ماہ تقازندہ ہوتیں۔“ مجمعے سے کسی معمر خاتون نے کہا۔ ”کتنا ارمان تھا یہ دن دیکھنے کا۔“

ماں کا نام سن کر یاسمین کے دل کو ٹھیس لگی۔ اور منصور کی آنکھوں میں بھی نمی سی آگئی۔

”نہ ماں نہ باپ۔“ کوئی اور بولا۔

”اور بے چاری دلن کا تو کوئی بھی نہیں۔“ تیسری آواز آئی۔

رسموں کو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔ جب سے انگلینڈ گئے تھے کسی شادی میں شرکت نہ کی تھی صرف یاسمین کی شادی پر آئے تھے۔ وہ بھی چند دن کے لئے۔

نواب اظہر نے بڑھ کر منصور کا ہاتھ تمام لیا۔ ”اٹھئے۔“

منصور اٹھے۔ مبارک سلامت کا کاک شور بلند ہوا۔ پھولوں کی بارش کی گئی دعائیں بھی پھولوں ہی کی طرح برس رہی تھیں۔ یاسمین کی آنکھوں میں خوشی ہے آنسو آگئے۔ ہجوم منصور کو گھیرے ہوئے تھا۔ نواب اظہر اور صدیق بمشکل ان کے لئے قدم رکھنے کی جگہ بنا کر دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے یاسمین جلدی سے دروازہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔

”راستہ چھوڑو یاسمین۔“ اظہر بولے۔

”یوں نہیں۔“ وہ ہستے ہوئے بولیں۔

”اور“ اظہر تعجب سے بولے۔

”بہن کوئی یونہی راستہ چھوڑے گی۔“ فاضلہ بیگم بولیں۔

”کچھ رشوت دو منصور۔“ چچی بانو بولیں ”رستہ یونہی نہیں ملے گا۔“

کچھ دیر ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔

صالح بیگم نے سچے موتیوں کی دوہری مالا منصور کے ہاتھ میں تھما دی جو اسی مقصد کے لئے کھڑی تھیں منصور نے مالا یاسمین کے گلے میں ڈال دی۔ یاسمین نے راستہ چھوڑ دیا۔

”بس اتنی ہی مالا کے لئے راستہ روکے کھڑی تھیں باقی۔“ منصور ہستے ہوئے بولے۔

”یہ تو ابتداء ہے منصور۔“ چچی بانو مسکرائیں۔ ”بہن کا حق بہت ہے ابھی۔ واپسی پر دینا۔“

منصور مسکراتے ہوئے قدرے جھکے۔ یاسمین نے ان کے بالوں پر بڑی شفقت سے ہوسہ دیا منصور باہر آگئے۔

بینڈ نے اک لطیف سانفہ چھیڑا۔ مختلف زاویوں سے کیرے کی آنکھ ان مسرت افزا لحوں کو سلولا لٹ پر منتقل کر رہی تھی۔ بینڈ نے دھن بدلی اور رنگ برنگی موٹریں قطار در قطار قصر عتاسے نکل کر دولت آباد جانے والی سڑک پر جاری تھیں موٹروں کا یہ سلسلہ لامتناہی دکھائی دے رہا تھا۔

ایک مدت کے بعد قصر فردوس میں اتنی چمک پھل دیکھنے میں آئی تھی جنوں برآمدوں اور کمروں میں مسمان ہی مسمان بھرے تھے قیمتی ملبوسات کی نمائش تھی۔ عورتوں کے جگمگاتے زیورات اور رنگین آنکھوں سے فضا بڑی روانوی ہو گئی تھی نیچے پوڑھے جوان بھی مسرور تھے۔ دودن تک یہی ہنگامہ رہا۔ شان دار ضیافتیں دی گئیں۔ تفریح کے سامان بہم پہنچائے گئے۔ رقص و سرود کی جان دار محفلیں گرم ہوئیں۔

گئی۔ منصور کچھ دیر کھڑے رہے پھر اس کے قریب بیٹھ گئے۔
عشق کی جبین شوق حسن کے مقدس دامنوں پر مجھ رہے ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ تھوڑی سی کش
مکش کے بعد منصور نے ناہید کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ ناہید کی حیا آلود نظریں منصور کی غماز آلود نگاہوں
سے لمحہ بھر کے لئے ملیں۔ بجلیاں کوندیں اور منصور کی نگاہوں کو خیرہ کر گئیں وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا زاہد
فریب چہرہ تھامے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مقدس کتاب ہو۔ وہ ششدر سے اسے دیکھتے رہے پھر آگے کو
جھک گئے..... اور ان کے تشنہ لب ناہید کے ریلے ہونٹوں سے مل گئے۔

حوروں کے پاکیزہ آنچل لہرائے۔ فرشتوں کے مقدس دامن پھیلے اور ان لہراتے ہوئے آنچلوں اور پھیلے
ہوئے دامنوں کے سائے تلے دو دل مل رہے تھے ایک دوسرے کی دھڑکنیں گن رہے تھے۔

یوڑھی رات مسکرا رہی تھی

اور..... رات گزر گئی۔

صبح ہی صبح اخباری نمائندوں اور کیرہ مینوں نے قصر رعنا کا رخ کیا اور دیر تک اس حسین جوڑے کی مختلف
زاویوں سے تصاویر لیتے رہے۔

○

”کیا وقت ہوتا ہے یہ بھی۔“ کوئی اور بے وقوف ہمدرد بولا۔ ”کوئی عزیز بھی نہیں لڑکی کا۔ جو اس کا ہاتھ
ہی دلہا کے ہاتھ میں دے دیتا۔“

جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں ناہید کی آنکھیں آنسوؤں کے انمول خزانے لٹانے لگیں۔ یاسمین بھی بار بار
آنسو پونچھ رہی تھیں۔ مجمعے پر اک خاموشی چھا گئی۔ کئی آنکھیں اظہار ہمدردی کے طور پر دھندلا گئیں۔ کئی
کنزور دل خواتین تو سسکیاں بھرنے لگیں۔ مردوں کے دل بھی اس رقت آمیز ماحول میں افسردہ ہو گئے۔ چروں
کے زاوےے بدلنے لگے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔“ زلفی آگے بڑھے۔ ”یاسمین یہ کیا حماقت ہے آخر مابودلت کس لئے ہیں لاؤ بیٹا
ہاتھ نکالو۔“ وہ ناہید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بنے۔ ناہید اور جھک گئی۔

”کنوارا باپ۔“ کسی نے بلند آواز سے کہا۔ لوگ کھدکھلا کر ہنس پڑے۔

”یونہی سی۔“ زلفی بولے۔ ”لاؤ بھی ہاتھ۔ بڑی ضدی بیٹی ہیں ہماری۔“

یاسمین بھی بننے لگیں آگے بڑھ کر ناہید کا ہاتھ زلفی کے ہاتھ میں دے دیا (کتنا خوب صورت ہاتھ تھا زلفی
ششدر سے دیکھنے لگے۔ آہستگی سے انہوں نے یہ ہاتھ منصور کے ہاتھ میں دے دیا۔

”بیٹا منصور۔“ زلفی جان بوجھ کر روٹی آواز نکال کر بولے۔ ”یہ ہماری ایک سی ایک بیٹی ہیں ان کا دل
نہ دکھانا بھی۔“

ان کے اس مذاق پر قہقہے لگ رہے تھے دم بھر میں محفل کا رنگ بدل گیا اور ناہید قہقہوں اور ہنسیوں کے
شور میں قصر رعنا پہنچ گئی۔

تجلّے عروسی کی زیبائش کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی تھی کرہ بڑی نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا دروازوں اور
کھڑکیوں پر جھللاتے ہوئے ریشمی پردے لٹک رہے تھے دینر چمکیلے قالین پڑے تھے اور سنہری سمین پردوں والی چھپر
کھٹ امیدوں کی طرح چمک رہی تھی فضا معطر تھی۔ خوش نما پہل بڑے بڑے گلہانوں میں عجب بہار دکھا رہے
تھے۔ ایک طرف تھمیلیں صوف تھا جس پر نرم نرم کٹن پڑے تھے۔ کمرے میں خواب ناک سی رہ شنی پھیلی ہوئی تھی۔
منصور اندر داخل ہوئے ان کی چال میں مستی تھی ان کی نگاہوں میں سرور تھا۔ وہ شوق کا اک جہاں لئے
چھپر کھٹ کے قریب آئے قدموں کی آہٹ پر ناہید اور سٹ گئی۔ اپنے گھٹنوں پر دونوں بازوؤں کے حلقے میں سر
رکھے وہ شرابی لچائی کچھ خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔

”ناہید۔“ منصور نے اسے پکارا۔ شدت جذبات سے ان کی آواز کانپ گئی۔

وہ خاموش رہی۔ اس کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ناہید گھبرا گئی۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔“ وہ مسری کے سمین پردوں کو ہٹا کر اندر آگئے ناہید کسمپاسی کچھ اور سکر

والے کی طرف سے آئے ہیں۔ باپ بڑا بڑا مشکل ہے۔ توبہ ہی بھلی۔
سب ہنس دیئے۔

”تو آئے زلفی بچا۔“ یاسمین نے ہمارے زلفی بچا کو دیکھا۔ کتنی محبت تھی انہیں اپنے اس بچے سے ہی کچھ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ زلفی یاسمین کے قریب آگے منصور بھی انہیں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ذرا بھی جگہ تو دو۔۔۔۔۔“

یاسمین نے نو عمر لڑکیوں سے کہا۔ وہ ادب سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ زلفی ناہید کے عین مقابل ایک گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے اور یاسمین ناہید کے پہلو میں۔

”زلفی بچا منصور کو دلہن نہیں دیکھے گا۔“ یاسمین ہنستے ہوئے بولیں۔

”ضرور دیکھیں گے۔“ وہ بولے ”اتنی مدت بڑا کو پالا پوسا۔ لیکن شکل دیکھی نہیں یہ بات بھی کسی نے سنی کبھی“ وہ ہنس رہے تھے عورتیں مردان کے گرد جمع ہو گئے۔ سبھی مسکرا رہے تھے۔

”چلو دکھاؤ بھی یاسمین۔“ زلفی نے بڑے شوق سے کہا۔

”ایسے ہی؟“ یاسمین ان کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر ہوا میں ہلاتے ہوئے بولیں۔

”اور کیسے۔“ زلفی نے ان کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

سب بے ساختہ ہنس دیئے۔

”کل تک تو باپ تھے۔ آج سرہیں زلفی بھائی رونمائی نکالے۔“ مسز صادقہ حسین نے زلفی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ غلط بات ہے۔“ زلفی نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ ”ہم تو مفت میں دیکھیں گے۔“

وہ کرسی کی پشت سے کمر لگا کر پیچھے کو ہٹ گئے فان کلر گرم سوٹ میں وہ اس وقت ایک حسین نوجوان دکھائی دے رہے تھے۔

”پھر بیٹھے رہنے۔“ یاسمین نے ہنس کر کہا۔

”آج نہ سہی کل دیکھ لیں گے۔“ وہ بولے۔

”بڑے کجس ہیں آپ زلفی۔“ کسی نے کہا۔

”جو کام مفت میں ہو سکتا ہو وہاں کچھ دینا دلانا فضول ہی ہے مبادولت فضول خرچ نہیں ہیں۔“

”کیا کہنے۔“ کوئی اور بولا۔

بڑی دیر تک چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی منصور بھی اس حسین چھیڑ چھاڑ سے محفوظ ہو رہے تھے۔

”تو بھی منصور دلہن بھی کیا یاد کریں گی۔“ کہتے ہوئے زلفی نے جب سے ایک گراں مایہ لاکھ

۱۸

محل کے دل فریب ڈائیننگ روم میں سب قریبی عزیز جمع تھے ہنس مذاق ہو رہا تھا تیز برقی روشنی میں چہرے چمک رہے تھے۔ چیزیں جگہ گاہی تھیں منصور کشادہ کھڑکی کے قریبی کھڑے تھے آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا خاندان کی دو شیرازیں ناہید کو گھیرے بیٹھی تھیں وہ ٹھنکی صوفے پر نرم نرم کشتوں کے سارے بیٹھی تھی۔ نیلے ستاروں والا جھللاتا لباس اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے آبشار پر چاندنی کا عکس تھر تھرا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں کدنی گو شوارے لرز رہے تھے گلے میں چوڑا کدنی گلو بند تھا اور کلایاں خوب صورت کنگنوں اور مرصع کلائی بندوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں بلا ٹیم کی انگوٹھی ایک ہاتھ میں تھی اور ماں کی یاد گار ہیرے کی انگشتری دوسرے ہاتھ کی انگلی میں دونوں ہاتھوں میں دو یاد گار انگوٹھیاں پہنے تھی ایک اپنی محبت کی یاد گار اور دوسری ماں کی مرحوم محبت کی یاد گار۔ ماں کی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے وہ جانے کن خیالوں میں بھٹک رہی تھی رات منصور کے پہلو میں گزارنے کے بعد ضمیر کی جہنم وحشت ناک حد تک بڑھ گئی تھی جذبات کی کش مکش نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اور منصور اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی دنیائے حسن و عشق کا زندہ چاند آسمان کے اس بے جان اور پتھر سے ہوئے چاند سے کہیں زیادہ نور اور تابناک ہے۔ ان کی آنکھیں دفور مسرت سے چمک رہی تھیں ان کا دل خوشیوں سے بھر پور تھا۔

”زلفی آگئے۔“ کسی نے بلند آواز سے کہا۔

یاسمین تقریباً بھاگتی ہوئی ناہید کے پاس آئیں اور تاروں بھری اوڑھنی کھینچ کر اس کا گھونگھٹ نکال دیا زلفی کمرے میں داخل ہوئے۔

”یاسمین سدمی آئے ہیں۔ استقبال تو کرو۔“ فہمیدہ بانو نے یاسمین کا کندھا ہلایا۔

”نہیں بھئی۔“ زلفی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے بولے۔ ”وہ سب کل تک تھا آج ہم لڑکے

نکالا۔ پہلی سی سفید زنجیر میں بیٹھ گئی۔ ہیرا چمک رہا تھا لاکٹ انتہائی نفیس تھا اور ہیرا چمک چمک کر اپنی قدر و قیمت آپ بیدار تھا۔ زلفی لاکٹ ہاتھ میں لئے زنجیر کھول رہے تھے وہ آگے جھک گئے۔

”لو دکھاؤ اب تو۔“ وہ بولے۔

یاسمین نے گھونگھٹ الٹ دیا۔

زلفی کی نظریں ناہید کے چہرے پر پڑیں۔

”زیرینہ“ بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بار چھوٹ کر ناہید کے ہاتھوں پر گر گیا۔ ہاتھ جس میں ماں کی یاد گارا انگوٹھی چمک رہی تھی زلفی کی نگاہیں کبھی انگوٹھی پر اور کبھی ناہید کے چہرے پر پڑتی تھیں۔

”زیرینہ نہیں زلفی بچپا۔“ یاسمین بولیں۔ ”ان کا نام ناہید ہے۔“

ناہید کے کانوں میں زیرینہ کا لفظ کھولتی ہوئی آگ کی طرح بچکا۔ اس نے نظر اٹھا کر زلفی کو دیکھا جن کے چہرے پر دیرانی سی دکھائی دے رہی تھی وہ اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے بچپانے کی کوشش کر رہے ہوں یاسمین نے کچھ محسوس کیا لیکن فانی نہیں جسے کوئی اہمیت دی جاسکتی۔ زلفی نے جلدی اپنی حالت پر قابو پالیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹھے نا زلفی بچپا۔“ یاسمین نے ان کا ہاتھ پکڑا۔ ”لاکٹ تو پہنا دیا ہوتا۔“

”تم پہناؤ۔“ وہ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں ہلکی سی تڑپ تھی۔

”دلہن سلام تو کرو۔“ کوئی خاتون بولی۔

”ذرا دکھانا تو لاکٹ۔“ کوئی اور بولا۔ ”یاسمین نے لاکٹ ان کے ہاتھ میں دے دیا ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا لاکٹ سارے کمرے میں گھوم رہا تھا تعریفیں ہو رہی تھیں۔ قیمت سے اندازے لگائے جارہے تھے اور زلفی کمرے سے نکل گئے۔

ناہید کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ”تمہاری ماں کا کوئی پرستار۔“ ضمیر کی آواز اٹھ رہی تھی۔ جس پر اس کا دماغ بھی ایمان لارہا تھا بڑے بڑے رئیس بڑے بڑے نواب اس کی ماں کے گاہک تھے زلفی کے منہ سے زیرینہ کا لفظ سننے کے بعد اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ رہی تھی کہ زلفی بھی ان گاہکوں میں سے ایک تھے ناہید کی شکل و صورت اپنی ماں ہی کی طرح تھی اس لئے زلفی کے منہ سے بے ساختہ زیرینہ نکل گیا تھا۔

اپنی جنت کے اجڑنے کا ناہید کو یقین تھا ضمیر کی پکار اس تباہی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ لیکن اتنی جلدی یہ ہولناک تباہی آئے گی اس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا ناہید کو زلفی نے پہچان لیا تھا۔ اور اب اس کا راز طشت از بام ہو جائے گا۔ ناہید کا دل قدرت کے اس بے رحم مذاق پر آج رونے کو نہیں بے اختیار تھمتے لگانے کو

جاہا۔ دیوانہ وار اس ستم ظریفی کی داد دینے کو جاہا۔

اس وقت اسے آنے والی رسوائیوں کا خیال تھا نہ منصور کے ٹھکرانے کا احساس اسے صرف یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے جنت سے اٹھا کر دوزخ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی آتشیں زد میں ڈال دیا ہو۔

”لو پہن لو ناہید۔“ یاسمین لاکٹ پہنانے لگیں۔ ناہید کے چہرے کا رنگ متغیر تھا آنکھوں میں ہولناک دیرانی تھی۔ اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کا سر یاسمین کے کندھے سے لگ گیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناہید۔“ یاسمین نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوا۔

”میرا دل گھبرا رہا ہے باجی۔“ وہ بمشکل کہہ سکی۔

”شور سے گھبرا گئی ہیں شاید۔“ کئی عورتیں اس پر جھک گئیں۔

”تھکان ہے صبح سے آرام تو کرنے نہیں دیا کسی نے۔“ ایک خاتون بولیں۔

”یہاں سے لے چلو انیس۔“ شور سے تو ہمارا دل گھبرا رہا ہے۔“ دوسری عورت بولی۔

دوسرے لمحے وہ منصور کی مضبوط ہاتھوں کے سہارے اپنے کمرے کی طرف جاری تھی۔

کینڑوں نے جلدی جلدی اس کا لباس تبدیل کر دیا۔ بھاری زیورات اتارے اور شب خوابی کا نائیلان کا خوب صورت مہین لباس پہنا دیا صوفے پر بٹھا کر کینڑیں باہر نکل گئیں۔ اسے دیکھ کر منصور کو ننھے فریدوں کی بات یاد آگئی۔

”پریوں کی شزدادی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے ناہید نے جانے کیوں آنکھیں بند کر لیں۔ ذلت و رسوائی کا خوف اور نمایاں ہو گیا۔ اور اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ منصور اس پر جھکے ہوئے اس کا حال پوچھ رہے تھے۔

”ٹھیک ہوں اب۔“ وہ جبراً مسکرائی۔

”اتنی جلدی ٹھیک بھی ہو گئیں۔“ منصور نے ہنستے ہوئے اس کی حسین ٹھوڑی کو چھو اچھا بہانہ تھا یہاں آنے کا۔“ ناہید ہنس دی لیکن اس ساختہ ہنسی کے جلو میں قیامتیں چل رہی تھیں۔

گھڑی بھر کے لئے ناہید کا دل تمام کلفتوں سے آزاد ہونے کے لئے تڑپا۔ اس نے شدت سے تمنا محسوس کی کہ وہ ماضی کو بھول جائے حال سے بے خبر ہو جائے۔ اور مستقبل سے بے نیاز ہو جائے۔ منصور کے عشق کے دامن وسیع سے وسیع تر ہو جائیں اور ان دامنوں کی ٹھنڈی اور سانی چھاؤں تلے اس کی جوان محبت دم لیتی رہے۔

ان ہونی بات ہو جائے تمنا سی کا نام ہے۔

ناہید موت و حیات کی کش مکش سے گزر رہی تھی زلفی کا دھڑکا جان لیوا تھا اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے

عقرب سی کوئی ہم پھنسنے والا ہے کوئی تباہ کن زلزلہ آنے والا ہے اس ہم کا دھماکہ وہ ابھی سے محسوس کر رہی تھی اس زلزلے سے پھیلی ہوئی تباہی سے وہ پیشگی ہول کھا رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے سینے سے اٹھنے والے دھوئیں کو منصور سے چھپائے ہوئے تھی اس کی مسکراہٹوں سے منصور کی خلوتیں آباد تھیں۔

منصور سے اس نے اپنا راز چھپایا تھا پہلے اس کی خود دار طبیعت نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کے اخفاء کی وجہ بدل گئی۔ منصور کی بیماری کے بعد وہ یہ راز کوشش کے باوجود افشاء نہ کر سکی۔ اس وقت خود داری کا سوال نہ تھا۔ بلکہ منصور کی بھاکا سوال تھا اور پھر یہ راز گہرے سے گہرا ہوتا گیا معمولی خطا بہت بڑا جرم بن گئی چھوٹا سا زخم گھٹاؤ نا سوراخ بن گیا۔

وہ شاید اس جرم کو بھی اپنی سرکش محبت کی یاد گار سمجھ کر سینے سے لگائے رکھتی اس ناسور کو بھی ضمیر کے جلے ہوئے دل کا آئینہ سمجھ کر پوری احتیاط سے سنبھالے رہتی۔ لیکن رونمائی کے وقت زلفی کے منہ سے زینہ کا لفظ نکل جانا کانپتے ہاتھوں سے بے اختیار لاکٹ کا گر جانا اس امر کا یقین ثبوت تھا کہ وہ اسے نہیں تو اس کی ماں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں اس کی ماں..... جو انسانیت کے نام پر کلنگ کا ٹیکہ تھی۔ جو شرافت کے منہ پر کالک کا داغ تھی۔

اس نے سوچا کہ زلفی کے کچھ بتانے سے پہلے ہی خود کشی کر لے لیکن منصور کی زندگی کی جھومتی ہوئی ہماروں کے مسکراتے ہوئے چہروں سے تبسم نوج لینا ظلم ہی نہیں بہت بڑا گناہ بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر حالات کو ان کی رفتار پر چھوڑ دیا اور منصور کی آغوش عشق میں اس کے تبسم کی بجلیاں کو بندھنے لگیں۔ یہ بجلیاں اسے اندر ہی اندر بھسم کرتے لگیں۔

دو دن گزر گئے کوئی ہم نہ پہچانے کوئی زلزلہ آیا۔ ناہید منصور کے سامنے ہستی تھی مسکراتی بھی تھی۔ لیکن اس کا دل ابھی تک خائف تھا۔ زلفی کی طرف سے دھڑکا بھی تک جان لیا تھا۔

ان دو دنوں میں زلفی ہر شکل و دو دفعہ اس کے سامنے آئے ان کے چہرے پر اچھے اچھے تاثرات تھے اور ان کی حرکات کسی اندرونی خلفشار کی مظہر تھیں۔ وہ ناہید کو عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے کے سوا منہ سے ایک لفظ نہ بولے۔ ناہید کا دل کانپتا رہا اور وہ ان کی طرف نظریں اٹھانے کی ایک دفعہ بھی جرأت نہ کر سکی۔ کاش کوئی اونچے اونچے پہاڑوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے اور اس کے ماضی کے منہ پر دے مارے کتنی عیش خواہش تھی۔ کیسی ناممکن آرزو تھی۔

لیکن ناہید کا معصوم دل اس کی تنہا بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

فیروز کرسی سے اس طرح اچھلا جیسے بجلی کے نیچے تاروں سے چھو گیا ہو..... ہوا کے جھونکے سے کانڈ پھڑپھڑاتے ہوئے بکھر گئے۔ فیروز کچھ لمبے ساکت وصامت ان اڑتے ہوئے کانڈوں کو دیکھتا رہا۔ پھر جلدی سے اٹھا اور تیزی سے اخبار کے کانڈوں کو سیٹ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کی نظریں پھر اسی تصویر کو گھور رہی تھیں۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔

آزاد نواب منصور علی خان والئی سلطان پور اور ان کی بیگم ناہید بانو

”وہی ہے۔“ فیروز تصویر کو آڑھے ترچھے زاویوں سے دیکھ رہا تھا ”نام بھی وہی ہے لیکن“۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اتنے بڑے خاندانی نواب سے ناہید کی شادی کیسے ہو گئی۔ اخبار

بغل میں دبائے وہ برآمدے سے اٹھ کر سیدھا باورچی خانے کی طرف گیا.....

ملازمہ ناشتے کے برتن مانجھ رہی تھی۔

”ذرا باہر تو آنا“ فیروز اخبار پھیلانے ہوئے بولا۔

نوکرانی ڈرتی ڈرتی باہر آئی۔ وہ جب سے فیروز کے پاس ملازم ہوئی تھی اس کی شکل سے اسے خوف آتا تھا۔

ایک مجبوری دوسرا معقول تنخواہ وہ اس کے پاس کام کئے جا رہی تھی۔ لیکن اس کا زردن بدن بڑھتی گیا۔ خاص کر جب سے ناہید اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ وہ تو چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح کچھ اور ہی خطرناک ہو گیا تھا۔

”کیا ہے“ وہ باورچی خانے کے دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

”ہاتھ دھو کر جلدی سے آؤ“۔

ملازمہ اندر گئی۔ ہاتھ دھوئے۔ اور اپنے دوپٹے کے آئینل سے پرچھپی ہوئی باہر نکلی۔

”وہی ہے“ فیروز کسی خوش کن تصور سے مسکرایا فخر و ابھی تک آنکھیں جھپک جھپک کر ناہید کی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

فیروز نے ناہید کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیئے تھے۔ جہاں جہاں اس کے ہونے کا امکان تھا گیا..... شہر شہر کی خاک جھانی لیکن اسے تو جیسے زمین گل گئی تھی۔ فیروز کی ساری کوششیں ناکام رہ گئی تھیں۔ اپنی ناکامی پر دانت چرس کر رہ گیا تھا۔ اب وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے فرار ہوئے ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس گہر گہراں مایہ کو کھونے کا صدمہ وہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس خوفناک ہیرے کو وہ صوفروش بنانے کا عرصے سے خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔

ناہید کے چلے جانے سے اسے مالی طور پر بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا سیٹھ ہاشم جیسی مالدار آسامی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس نے شینہ کو ناہید کے نعم البدل کے طور پر پیش کرنا چاہا تھا۔ لیکن شینہ لاکھ حسین سی۔ ناہید کے ہوش را حسن کے طلسم سے مسحور سیٹھ اسے کب خاطر میں لاتا تھا۔

”جہاں سے ہو سکتا ہے اسے ڈھونڈ کر لاؤ“ سیٹھ ہاشم غرایا تھا ”میں پانچ ہزار کی جگہ دس ہزار دوں گا۔“

اس کی آتش شوق ناکامی کی پھونک سے اور بھڑک اٹھی تھی۔

اور یہ دس ہزار کا لالچ کچھ کم نہ تھا۔ فیروز اور فخر نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ جگہ جگہ مارے مارے پھرے تھے۔ لیکن وہ نہ ملی تھی۔ قدرت نے جیسے اسے اپنی امان میں لے لیا تھا۔ جہاں شیطانی قوتوں کی پہنچ نہ تھی۔ اس بات پر اس کا سیٹھ ہاشم سے تازہ ہو گیا تھا۔

اور آج اخبار میں اس کی تصویر دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔

فخر و ابھی تک میلی میلی لال آنکھوں سے اس حسین جوڑے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت بڑا آدمی ہے یہ“۔ فیروز بولا۔

”بڑا اکمال بالکل جوان ہے“ فخر نے جواب دیا۔

”ارے بے وقوف بہت بڑا نواب ہے۔ سلطان پور کا مالک ہے۔ ناہید کے ساتھ شادی ہوئی ہے اس کی۔“

فخر واقعی بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ تک رہا تھا۔

”شادی“ وہ جیسے خواب میں بول رہا تھا۔

”اور اتنی دیر سے کیا دیکھ رہے ہو“۔ فیروز نے اسے جھڑکا۔

”بٹیا کی نواب سے شادی ہوئی ہے“۔ اس نے کہا ”بڑی خوش قسمت ہیں بٹیا تھیں بھی تو اسی قابل زرینہ

بی بی جانے کیسے یہاں آچھنسی تھیں۔“

”ادھر آؤ“ فیروز نے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے میز پر اخبار پھیلادیا۔

وہ قریب آگئی۔

”یہ دیکھو“ فیروز تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”کس کی تصویر ہے یہ۔“

مازہ تصویر پر جھک گئی۔ چند حیرانی ہوئی آنکھوں سے تصویر کو دیکھا کچھ چونکی جلدی سے دوپٹے سے آنکھوں کو پونچھا۔ اور پھر جھک گئی۔

”اب دیکھئے ہی جاؤ گی“ فیروز بولا ”پہ چلا کچھ۔“

”یہ تو بٹیا کی تصویر معلوم ہوئی ہے۔“

مازہ نے پھر فخر سے دیکھا ”لو بھلا میں پہنچاتی نہیں جیسے۔ ان کی شکل و صورت جھپکتی ہے بھلا۔“

فیروز اخبار لپیٹ کر نیچے اترا آیا۔

ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں فخر اپنی جھولا نما چار پائی پر پڑا اونگھ رہا تھا۔

”او فخر“ فیروز نے اسے آواز دی۔

وہ چپکا پڑا رہا۔

”ابھی تیری آنکھ نہیں کھلی دس بج رہے ہیں۔“ فیروز نے چار پائی کے پائے کو ٹھوکر ماری فخر بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”ادھر آؤ“ فیروز صحن کی طرف جاتے ہوئے بولا..... فخر اپنی لال لال آنکھیں پونچھتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔

”یہ دیکھو“ فیروز نے اخبار اس کے سامنے کر دیا۔

”کیا دیکھوں“ وہ ابھی تک نیند کے نشے میں تھا۔

”یہ تصویر دیکھو۔“

”جی تو میں کہہ رہا ہوں مالک۔“ وہ ابھی تک شاید اونگھ رہا تھا ”کیا دیکھوں۔“

فیروز نے اس کا کان پکڑ کر سر اخبار کی طرف جھکا دیا۔ فخر اپنے میلے میلے دانت نکال کر ہنس دیا۔

”کس کی تصو ہے یہ۔“ فیروز نے پوچھا فخر نے تصویر کو دیکھا اور بولا۔

”ایک مرد کی ہے دوسری عورت کی دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔“

فیروز نے اس کے گتے سر پر ہلکی سی چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔ ”آنکھیں کھول کر دیکھ ذرا.....“

فخر نے واقعی آنکھیں کھول کر دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”یہ تو“ وہ بھکاتے ہوئے بولا ”یہ تو بٹیا نہیں ہیں مالک؟“

فخرو کے سادہ اور بے لاگ تہرے پر فیروز جل کر رہ گیا۔ بیڑا تار ہوا اخبار سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ جتنے اخبار جمع کر سکتا تھا۔ دن بھر پھر کر جمع کئے۔ سلطان پور کا ایک اخبار ہاتھ لگ گیا۔ جس کے سرورق پر منصور و ناہید کی ایک بڑی اور رنگین تصویر تھی۔ اب کسی شے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ناہید وہی تھی جسے آیا میں دے کر بھاگے گئی تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ فیروز اس شادی کے متعلق ابھی تک سوچ رہا تھا۔ ناہید کیسے نواب تک پہنچی۔ کیسے یہ شادی طے پائی۔ کیا نواب نے اس کی اصلیت جانتے ہوئے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یا ناہید نے اسے کچھ بتایا ہی نہیں۔

”عشق لڑ گیا ہو گا۔“ اس کے دماغ نے سوچا ”ناہید نے اپنے حسب نسب سے ہو سکتا ہے اسے آگاہ ہی نہ کیا ہو۔ بہر حال میں تمہ تک پہنچوں گا۔“

فیروز کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ جلدی جلدی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کالا بٹہ نکال کر وہ جلدی جلدی نوٹ گنتے لگا۔ ضرورت کیلئے کافی روپیہ تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے بٹہ جیب میں ڈالا۔ سگریٹ سلگایا اور اپنی کیس ہاتھ میں لئے باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

”بائی“ اس نے پکارا۔

دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باورچی خانے کی کھڑکی سے ملازمہ نے جھانکا۔ ”کیا بات ہے۔“

”میں چند دنوں کیلئے جا رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کہاں“ ملازمہ نے دل ہی دل میں خوش ہو کر پوچھا۔

”کیس بھی تمہیں پوچھنے سے کیا۔“ وہ تیزی سے بولا ”شاید میرے لوٹنے میں کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔“

گھر کا خیال رکھنا۔ فخر کو بھی کتنا جاؤں گا۔ پردہ زار ہوش میں کہی رہتا ہے۔

”بہت اچھا“ ملازمہ نے جواب دیا۔ چولہے پر چاول ابل رہے تھے۔ وہ جلدی سے پٹی اور دیکھی میں جج ہلانے لگی۔

فیروز بیڑیاں اتر کر فخر کو کے پاس چند منٹ ٹھہرا۔ اور گلی میں نکل گیا۔ بازار میں تانگہ پکڑا اور سٹیشن کی طرف چل دیا۔

صبح اس کی آنکھ سلطان پور کے ایک ہوٹل میں کھلی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ سلطان پور کی زندگی بیدار ہو گئی تھی۔ فیروز صبح جلدی اٹھنے کا عادی نہیں تھا۔ اور آج تو رات بھر کے سفر کی تھکان بھی تھی۔ دیر تک سویا رہا جب

آنکھ کھلی تو جلدی سے اٹھا غسل سے فارغ ہو کر ناشتہ منگوایا۔ اطمینان سے ناشتہ کیا۔ کچھ دیر رات کے خریدے

ہوئے اخبار دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر باہر آیا۔

ہوٹل کے باہر چننے لگے نواب منصور اور ناہید کی عظیم الشان شادی پر تہرے کر رہے تھے۔

”اتنی شاندار شادی بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی۔ میں تو کول چوک کے قریب کھڑا موٹریں ہی گنتا رہا۔ کوئی شمار ہی نہیں تھا“ ایک بولا۔

”تم خالی موٹریں ہی گنتے رہے اور ہم نے تو میاں فٹ بھی اڑائی۔ کوئی حساب تو ہوا ہی تھا وہاں۔ ارے کیا بتاؤں عمر میں پہلی اور شاید آخری دفعہ اتنی پر تکلف دعوت کھائی۔“

دوسرے نے فخر سے سینہ پھلایا۔

”تم کیسے پہنچ گئے وہاں یونہی جا گئے ہو گے“ پہلا بولا۔

”تو اور کیا بلاوا آیا ہو گا“ تیسرے نے طنز کی۔

”ارے نہیں بھئی۔ وہ اپنے محلے کے حسین خان ہیں نا؟ ان کے ہمراہ ہی جاتا ہو گیا۔“

دوسرے ساتھی ہنس دیئے۔

”جب تو دولت آباد بھی گئے ہو گے۔“

”نہیں وہاں تو نہیں گیا تھا۔ حسین خان صاحب نے کہا تو چلنے کو۔“

”سنا ہے وہاں بھی پر تکلف دعوتیں ہوئیں۔ مرغن کھانے سالم بنے ہوئے مرغے تیز اور بٹروں کے کباب‘

ہرن کا گوشت ارے بھائی ہمیں تو نام بھی نہیں آتے ان کھانوں کے وہاں تو مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے کھانے

دیئے گئے تھے۔“

”لڑکی والے زیادہ عرصہ ولایت ہی رہے ہیں نا؟“

”کون“ پہلا حیرت سے بولا۔ فیروز بظاہر اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ لیکن اس کے کان کچھ ضرورت

سے زیادہ تیز تھے۔ وہ پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”کیا حسین جوڑا ہے۔“ تیسرے نے ایک کارڈ ساز فوٹو نکالی۔ فیروز نے نظر چرا کر دیکھا اب تو قطعی شبہ نہ

رہا تھا۔ وہ ناہید ہی تھی ”کوئی نواب صاحب کی دور کی رشتہ دار ہیں ان کے والدین نہیں تھے اس لئے شادی ان

کے چچا نے کی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ پہلا حیرت سے بولا ”کیسی رشتہ داری۔“

”کیا نواب صاحب اور ان کی بیگم آپس میں رشتہ دار نہیں ہیں۔“

”بالکل بھی نہیں“ پہلا بولا۔

”ہم نے تو یہی سنا تھا۔ کہ دور کی رشتہ داری ہے۔“ دوسرے ساتھی نے تیسرے کے کہنے کی تائید کی۔

”میں سب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری ہمشیرہ ہائی سکول میں پڑھتی ہیں۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتی ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکیوں کے ہوشل ہی میں تو رہتی تھیں۔“

دونوں ساتھی شوق سے سننے لگے اور فیروز کے کان کھڑے ہو گئے۔

”پچھلے سال ٹرین کا جو حادثہ ہوا تھا بھول گئے کیا؟“ پہلا بولا۔

”لو بھلا ایسا جاننا کاش حادثہ بھی بھلا یا جاسکتا ہے“ تیسرا بولا۔

”بڑا خوش واقعہ تھا“ دوسرے نے کہا۔

”اسی حادثے میں یہ بیگم صاحبہ بھی زخمی ہو کر سلطان پور پہنچی تھیں۔ دنیا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ نواب صاحب کے دفتر میں نوکری کر لی اور پھر سمجھ لو..... یہ شادی ہو گئی۔“

تینوں ساتھی ہنسنے لگے۔ فیروز کو یاد آ گیا جس رات ناہید فرار ہوئی تھی اسی رات سلطان پور کے قریب ٹرین کا حادثہ ہوا تھا۔ اس رات وہ اسے دوسری لائن پر ہی تلاش کرنا پھر رہا تھا۔ اس طرف اس کے ذہن نے رسائی ہی نہ کی تھی۔

فیروز ساری بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اہلیسانہ قوتیں جاگ اٹھیں شیطانی ارادہ مضبوط ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ کر پلا۔ اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

.....○.....

(۲۰)

آج ان کی شادی کو چوتھا دن تھا۔

محل کے عقبی باغ کے خوبصورت لان میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک طرف خوبصورت صوفوں کی دائرہ نما قطاریں تھیں۔ خوبصورتی سے ترشی ہوئی گھاس پر چھوٹے چھوٹے قالین بڑی بہار دکھا رہے تھے آہنسی میزوں پر گلدانوں میں موسم بہار کے حسین پھول مسکرا رہے تھے..... دوسری طرف بڑی بڑی میزوں پر چاندی کے جگمگاتے برتنوں میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں نفیس چینی کے ٹی سٹ پڑے تھے۔ مہمانوں کا ایک جم غفیر چائے پینے میں مصروف تھا۔ چوٹی چکے تھے۔ صوفوں پر بیٹھے گہن لگا رہے تھے۔

آج یاسمین اور منصور کے قریبی دوستوں کو شادی کی خوشی میں چائے پر مدعو کیا گیا تھا متبول اور پڑھا لکھا طبقہ تھا۔ لطیف مذاق ہو رہے تھے۔ بلند پایہ ادبی مسائل زیر بحث لائے جا رہے تھے۔ کچھ باذوق حضرات شعر و شاعری کر رہے تھے۔ منصور گمرے گمرے سوٹ میں ملبوس مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول تھے۔ یاسمین ہلکے گلابی ریشمی شوٹ میں بہار کا کوئی شگفتہ پھول دکھائی دے رہی تھیں۔ سوٹ پر بڑائی نفیس اور دیدہ زیب کام کیا ہوا تھا۔

ناہید سرخ زرد نار ساڑھی کا بھاری پلو بننے والے ایک مٹلیں صوفے پر کچھ بھی بھی بیٹھی تھی۔ یاقوتی طلائی زیورات سرخ ساڑھی کی مناسبت سے بڑی بہار دکھا رہے تھے اس کے ماتھے پر بڑی ہوئی بالوں کی لٹیں کچھ اور گھوگر یالی ہو گئیں تھیں۔ اس کا صبیح حسن نکھرا ہوا تھا۔ شہر اس کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ اور شیریں بائیں طرف۔ دونوں اس کے ساتھ لطیف جمیز چھا کر رہی تھیں۔ لیکن وہ ان کی پر لطف باتوں میں پوری دلچسپی نہ لے رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب وہ چمن میں آئی تھی۔ تو برآمدے میں زلفی کھڑے تھے۔ وہ کچھ کہتا ہی چاہتے تھے۔ کہ یاسمین آئیں۔ زلفی کے الفاظ ہونٹوں پر ہی ختم ہو گئے تھے۔ اور یاسمین اسے باہر لے آئی تھیں۔ اس نے ایک بار

پلٹ کر دکھاتا۔ زلفی پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے ناہید کا مجرم دل کوئی اہمیت نہ دیتا۔ وہ جب سے بیٹی اسی واقعے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ میب تاجی اسے اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شور و غوغا سے اس کی طبیعت پریشان ہو رہی تھی اور جب برابر کے صوفے پر زلفی آ بیٹھے۔ تو ان سے اس کا سامنا کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے زلفی کی آنکھوں میں اک خوفناک ٹھہراؤ نظر آرہا تھا۔ اور وہ برابر اسے گھور رہے تھے۔

”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے شیریں“ اس نے ذوقی ہوئی آوازیں کہا۔

”کمرے میں جائیں گی۔“ شمس نے پوچھا۔

”ہاں“ مختصر جواب دے کر وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

شمس اٹھ کر یاسمین کے پاس گئی۔ وہ اپنی کسی پرانی سہیلی سے بڑی مدت کے بعد ملی تھیں اسی کے ہمراہ باتیں کرتی ہوئی چائے پینے میں مصروف تھیں۔

”چائے پی لی ناہید نے“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں“ شمس نے جواب دیا۔

”آپ انہیں کمرے میں لے جایئے میں چائے بھجواتی ہوں۔ شور و غل سے بڑی گھبرا جاتی ہیں۔“

”اب تو انہیں مانوس ہو جانا چاہئے“ ان کی سہیلی بولیں۔

”آہستہ آہستہ ہو جائیں گی“ یاسمین نے ہنس کر کہا شمس چلی گئی۔

کچھ لمحوں بعد وہ شیریں اور شمس کے درمیان ایک مدہوش کن چال چلتی ہوئی لان عبور کر رہی تھی۔

منصور دوستوں کے ساتھ مصروفِ تکلم تھے۔ ناہید کو جاتے دیکھا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچے۔

”خیریت“ انہوں نے ناہید کے گہرائے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ان کی“ شمس نے جواب دیا ”گھبرا گئی ہیں شاید۔“

”ہمانہ بتا رہی ہیں“ منصور ناہید کی طرف ذوقی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے ناہید نے محبوب نظروں

سے انہیں دیکھا۔ مسکرا کر سر جھکا دیا۔

لیکن طبیعت کا بار بار یک لخت خراب ہو جانا منصور کی نظروں میں خار کی طرح ٹپکنے لگا۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ ان کے دماغ میں کئی خیال آ رہے تھے۔ کہیں یہ شادی کسی جبر کا نتیجہ تو نہیں؟ یہ خیال اتار دھو فرساتھا کہ منصور کا دماغ پکرا گیا۔ وہ دور جاتی ہوئی ناہید کو کھڑے دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔ وہ کچھ بے چین ہو رہے تھے۔

”بس بھی بہت ہو گیا“ ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے غزالی مکرار رہے تھے۔

منصور نے پلٹ کر انہیں دیکھا غزالی ہنسنے لگے۔ وہ منصور کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے۔

”یہ بھالی تمہیں لے بیٹھیں گی“۔ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہا تھا ”ہوش و حواس کا دامن تو ابھی سے چھوٹ گیا۔ میں تو حیران ہوں۔ اس شعلہ خورالاکي قربت میں آگے کیا ہو گا۔“

”چش سے سونا کنکن بن جاتا ہے غزالی منصور جبری مسکرائے۔

”بہت خوب“ شیر بھی قریب آتے ہوئے بولے۔

”اکیلی ہی اکیلی کیا راز کی باتیں ہو رہی ہیں“۔ نصیح قریب ہی کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

”یہ رو رہے تھے“ غزالی منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”بشکل چپ کرا یا ہے۔“

”کیوں..... کیا ہو گیا“ شیر مسکراتے ہوئے منصور کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن

ان کی آنکھیں اداس تھیں۔

”بھالی کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جھڑک دیا۔ بے چارے رونے لگے۔“

”ابھی سے یہ حال ہے“ نصیح نے لقمہ دیا۔

”بڑا افسوس ہے منصور“ شیر نے چھیڑا۔

”مجھے تو رحم آتا ہے ان پر“ غزالی بولا ”جھڑکی کھانے کے بعد بھی حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتے

رہے۔ خیال ہو گلیٹ کر بلا لیں گی۔ پر کہاں۔“

”اپنی خیر مناد غزالی“ منصور اس کے مذاق کے جواب میں بولے۔ ”دن رات روتے نظر آؤ گے۔“

”یہ تو ٹھیک کہا“ شیر نے ہنسنے ہوئے منصور کی پیٹھ ٹھوکی ”ناک میں دم کر دیں گی شمس ان کا بڑی تیز

و طرار ہیں۔“

قتیلوں کی آوازیں کر دو چار اور دوست بھی ان کے قریب آ گئے۔ دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ منصور اور

غزالی کی نوک جھونک سے بھی محفوظ ہو رہے تھے منصور غزالی کی باتوں کا جواب بڑی برجستگی سے دے رہے تھے

لیکن ان کا خیال دماغ میں آنے والے انوکھے خیال کی طرف ہی مائل تھا۔ اور اس عجیب و غریب خیال سے انہیں

بڑی اذیت ہو رہی تھی۔

”یہ میرا وہم ہے“ وہ جب ان ہنسنے کھیلنے دوستوں سے گھڑی بھر کے لئے دامن چھڑا کر صوفے پر بیٹھے تو

سوچنے لگے ”ناہید کی محبت سورج کی طرح روشن ہے وہ بڑی حساس ہیں۔ وہ بڑی غیور ہیں۔ اور یہ، طبیعت کا بار

بار خراب ہو جانا شور و غل سے گھبرانا اسی بات کی دلیل ہے۔“

ان خیالوں سے وہ بظاہر مطمئن ہو گئے۔ اور پھر انہیں اس رات والا واقعہ یاد آیا جب شبِ تہائی میں ناہید

کے ہونٹوں نے ان کی یاد گار انگشتی کو بوسہ دیا تھا کیلیہ اس کی خاموش محبت کی دلیل نہ تھی۔

تھیں۔ اس کارنگ فقی تھا۔ اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ زلفی بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی یہ حالت کسی خاص بات کی غماز تھی۔ معاملے کی نوعیت کو سمجھنا زلفی کے لئے کچھ مشکل نہ رہا تھا۔ درپردہ بھید صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ یہ تو نہ جان سکے کہ بھید کیا ہے لیکن اتنا جان گئے۔ کہ بات کچھ ہے ضرور۔
”میں لے آؤ اسے“ زلفی نے نوکر سے کہا۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

ناہید نے گہرا کر پہلے زلفی کو اور پھر دروازے کی طرف دیکھا اپنی بے بسی پر اس کا دل پھٹنے لگا۔ سینے سے اٹھتی ہوئی آہ کو روکنا ناممکن ہو گیا۔ اس کی حالت سے جانے کیوں زلفی بے چین ہو گئے۔

دروازے کا بھاری پردہ اٹھا کر فیروز اندر آ گیا۔ وہ اس وقت معمولی قسم کے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور اس قسم کا غم تھا اس کے چہرے پر کہ وہ واقعی کسی اچھے خاندان کا مستعد نوکر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جبکہ کبڑی تعظیم سے دونوں کو سلام کیا۔ ناہید بھی بیٹھی نظروں سے اسے پوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے جاگتے میں بصوت نظر آ گیا ہو۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

زلفی نے غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اک شیطانی چمک تھی۔ اس کے بشرے پر خبیثات تھی۔ زلفی کی نظرس فیروز اور ناہید کے چروں پر پڑ رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ کھڑے رہے فیروز خاص نوکروں کی طرح بیٹھا کیا کہ کر ناہید کو دعائیں دیتا رہا۔ اور ناہید نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تمام لیا۔

زلفی اپنی جگہ چھوڑ کر بڑھے۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے ناہید کو مخاطب کر کے کہا۔
”آپ ان سے باتیں کیجئے میں جانتا ہوں۔“
وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ناہید کے محل حواس کو جیسے کچھ سکون ملا۔ اور وہ اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت مجتمع کرنے لگی۔ وہ صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
”اجی میں نے کہا پچانائیں خاکسار کو۔“ فیروز بھونپیں کھینچ کر طنزیہ ہنسنے ہوئے بولا۔
ناہید خاموش رہی۔

”بندے کا نام فیروز ہے۔“ وہ دائیں آنکھ بند کرتے ہوئے بولا ”کیا ٹھانھ ہیں ناہید بانو کے یہ شان دار محل یہ عیش و عشرت کے سامان..... یہ ہیرے موتی..... یہ جھلملاتے لباس بھی میں تو قائل ہو گیا نقدیر کے چکروں کا ایک رنڈی کی بیٹی کے یہ بھاگ آج زرینہ زندہ ہوئی۔ تو دیکھتی۔ بیٹی کی شادی پر مجرا تو کرتی۔“

فیروز نے جیسے بارود کو آگ دکھادی۔ ناہید چیخ اٹھی۔
”بکواس بند کرو۔ تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کر لی۔“
ہااااا فیروز نے اک بھرا سا قہقہہ لگایا۔

ناہید نے کمرے میں آکر اطمینان کا سانس لیا۔ شیریں اور شمشہ کو واپس بھیج کر وہ کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ منصور کے ذاتی ڈرائنگ روم میں تھی۔ کمرہ جس نفاست سے آراستہ تھا اس سے منصور کے بلند ذوق کا نشان ملتا تھا۔ کچھ لمبے ناہید کھڑکی سے نیچے لان کو دیکھتی رہی۔ جہاں مہمانوں کا جوہم چائے پینے میں مصروف تھا۔ سفید وردی اور سنہری بیٹیوں والے بیرے چائے کی کشتیاں اٹھائے آ جا رہے تھے۔ اس کی نظرس منصور پر جمی ہوئی تھیں۔ جواک نمایاں شان سے چائے پیتے ہوئے دوستوں سے خوش کہیوں میں مصروف تھے۔

ملازم کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”آ جاؤ۔“

”چائے لایا ہوں سرکار“ وہ احترام سے کھڑا تھا چائے کی طشتی دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔
”رکھ دو۔“

نوکر قرینے سے چائے کے برتن میز پر لگائے لگا۔

”میری چائے بھی پییں لے آؤ“ زلفی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

ناہید انہیں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ کھڑکی کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر یوں گر گئی جیسے مٹی کا ڈھیر ہو۔

نوکر چلا گیا۔ اور زلفی کمرے میں بے تابی سے ٹپٹپٹ لگے۔ نوکر پھر چائے لے کر آ گیا میزوں پر چائے کا سامان لگا کر وہ مؤذپ کھڑا ہو گیا۔

”تم جاؤ“ زلفی بولے۔ نوکر چلا گیا ناہید کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔

چائے جوں کی توں پڑی رہی کسی نے پہل نہ کی ناہید نے کھٹکے گلوٹوں سے زلفی کی طرف دیکھا وہ مینٹل پیس پر کھنی لٹکائے کچھ کہنے کے انداز میں کھڑے تھے۔ ناہید کانپ گئی۔

ملازم اجازت لے کر اندر آیا۔ ناہید کو جیسے اس کے آنے سے تعینت مل گئی۔

”کیا بات ہے“ زلفی نے سختی سے پوچھا۔

”سرکار“ وہ ادب سے سر جھکا کر بولا ”حضور بیگم صاحبہ کے خاندانی ملازم فیروز آئے ہیں۔ وہ ملنا چاہتے ہیں۔“

ناہید کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی دزدنی پتھر سے اس کا دماغ پھل گیا ہو۔ فیروز..... وہ غیبی انسان..... وہ درندہ یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ ناہید کے دماغ کی رگیں سنسناری

”میں کیسے آیا یہ بھی تمہیں پتہ چل جائے گا۔ سال بھر پہلے تو بچ کر بھاگ نکلی تھیں۔ اب دیکھو کاکاں جاتی ہو۔ میرے کنبے سے چھٹ کر۔“

”تم..... تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے“ ناہید شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔
”یہ تو اس وقت پتہ چلے گا جب تمہارے شوہر نامدار کے سامنے تمہاری اصلیت کا پول کھولوں گا۔ تمہارا حسب نسب انہیں بتاؤں گا۔“

ناہید کے دماغ کو جیم جھٹکے لگ رہے تھے۔ لیکن بمشکل آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
”میں..... میں نے“ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا ”میں انہیں سب کچھ بتا چکی ہوں۔“

فیروز نے پھر ایک بار پھر بعد اساتقہ لگا لیا۔ جو فضا پرنا گوار سے اثرات چھوڑتا ہوا تحلیل ہو گا۔
”مجھ سے شاطرانہ چالیں چلتی ہو۔ ایک دفعہ دھوکا کھا گیا۔ تو یہ مت سمجھو کہ ہر دفعہ دھوکا کھاؤں گا۔ نواب صاحب کو سب کچھ بتا دیا ہوتا تو آج یوں میرا سامنا کرتے ہوئے گھبرانہ جاتیں۔ چہرہ قہقہہ ہوتا۔ اور جتاہ نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ہوتا۔“

ناہید نے بے بسی سے فیروز کو دیکھا۔ وہ بڑے خوفناک طریقے سے مسکرا رہا تھا ناہید کی حالت اس پرندے کی سی تھی۔ جو دام صیاد میں آکر پھنسا ہوا ہو۔ اس نے جڑھال ہو کر صوفے کی پشت پر سر نکا دیا۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ تیز تر سانس لے رہی تھی۔ اور اس کے خوبصورت کوئل تنھے پھڑک رہے تھے۔
فیروز اپنی کامیابی پر مسکرایا۔ ناہید جیسی بھولی بھالی لڑکی کو باتوں کا پکڑ دے کر پھنسا لیا تھا۔ اور وہ اصل بات بتا دینے پر مجبور ہو گئی۔

”یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہی تھی۔ ”کہ میں نے اپنا حسب نسب ان سے چھپائے رکھا۔ اپنے ماضی کو ان سے مستور رکھا۔ بتانا چاہی تو تباہ ہو سکتی۔“
فیروز کی گہنی مونچھیں کچھ پھیل گئیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر اک بے رحم تبسم آ گیا۔

”جو کام تم سے نہ ہو سکا۔ وہ یہ خاکسار کر دے گا“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھٹکتے ہوئے بولا۔
ناہید نے مرغ ٹھٹھکی کی طرح تڑپ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر کر اس کی زرتار ساڑھی کو تر کرنے لگے۔

”ان سے کچھ نہ کہتا فیروز میں مر سکتی ہوں۔ لیکن ان کی نظروں سے گرنائیں چاہتی ہیں نے تمہارا کیا بکاڑا ہے جو.....“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

”ابھی کچھ بگاڑا ہی نہیں“ فیروز دانت پیس کر بولا ”سینہ ہاشم جیسی موٹی آسامی تمہارے بھاگ نکلنے سے ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ پانچ ہزار پر تمہارا سوطا لے گیا تھا میں نے۔“

”اوہ بند کر وہ باتیں“ ناہید نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
”نازک طبع تو تمہیں ہی۔ ایک نواب کی بیگم بن کر نازک دماغ بھی ہو گئیں..... اور پھر جیسے اپنے آپ سے بول رہا ہو“ ہاں بھی تمہاری رگوں میں بھی تو آخر نوابی خون ہی دوڑ رہا ہے جائز باپ نہ سہی۔ تھا تو نواب آخر کو۔“

”مجھے کیوں ستاتے ہو فیروز۔ اس مرد کا میرے سامنے نام نہ لو۔ جس نے میری شریف ماں کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔ اور جو میری جانی کامو جب بن رہا ہے۔“ وہ انتہائی بے چارگی سے بولی ”میری زندگی شروع ہی سے آلام میں گھری رہی ہے۔ میں نے کوئی لمحہ چین کا نہیں گزارا تم سمجھ رہے ہو۔ میں عیش و عشرت کی زندگی کی ابتداء کر رہی ہوں۔ یقین مانو مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے جیسے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ منصور سے اپنی نفی پستی چھپا کر میں نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ پہلے میں نے شادی سے انکار محض اسی بنا پر کیا تھا لیکن وہ بیمار ہو گئے۔ اور حالات کچھ اس طرح بدلے کہ میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکی میرا ضمیر میرے پےلو میں نشتر بھجوا رہا ہے۔ ان کی نظروں میں میں جو مقام پا چکی ہوں۔ اس سے گرنائیں نہیں چاہتی۔ اسے میری اخلاقی کمزوری سمجھ لیا کچھ اور..... میں جانتی ہوں یہ راز افشا ہو کر رہے گا۔ میری یہ جنت اجڑ ہی جائے گی۔ اس جنت میں کچھ دیر تو طینتان کا سانس لینے دو کچھ دیر تو سکون پانے دو۔“

لیکن اس کی بے چارگی پر فیروز کا دل نہ سمجھا۔ وہ اس کے رونے پر بے اختیار ہنس دیا۔
”تم ازلی بے رحم ہو۔ میں جانتی ہوں“ آنسو ابھی اس کی حسین آنکھوں سے بہہ رہے تھے ”میرا قصور کیا ہے فیروز ذرا انسانیت کے جامے میں آکر سوچو۔ کس قصور کی پاداش میں مجھے سزاؤں نا چاہتے ہو۔ یہی ناکہ میں تمہارے مکروہ ارادے سے باخبر ہو کر تمہارے چنگل سے بھاگ نکلی۔ میرے دامن کی طہارت کو تمہارے سینہ کے وحشی ہاتھ چھون نہ سکے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ تمہاری چال میرا دامن لوٹ نہ کر سکی۔“

”اب کہاں بچ کے جاؤ گی۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا..... ناہید کانپ گئی۔ فیروز سے کسی ہمدردی یا رحم کی توقع فضل تھی۔ وہ انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ وہ عصمتوں کا قاتل تھا۔ وہ پاک جوانیوں کا دشمن تھا۔

”دیکھو ناہید میں تمہیں قلعہ مشورہ دیتا ہوں“ وہ صوفے کے قریب آکر بولا۔
”نواب کو اگر پتہ چل گیا۔ کہ تم طوائف کی بیٹی ہو۔ اور تم نے دھوکہ دے کر اس سے شادی کر لی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تمہیں ذلیل کر کے نکال دے گا اس کا بلند مرتبہ اس کا جاہ و جلال اک طوائف زادی کو کبھی قبول نہ کرے گا۔ اس سے چوتھری میرے ہمراہ بھاگ چلو۔ یہ زیورات لے کر.....“ لیکن اس کی بات ختم کرنے سے پہلے ہی ناہید تڑپ کر بولی۔

سکتی تھی۔ ایک بار پھر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ماں کی باتیں جن کی وہ بڑے عزم سے مثال دے رہی تھی۔ بے حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ ماں نے اپنی اخلاقی لغزش کو چھپانے کیلئے یہ قصہ تراشا ہو گا تاہم کادل اس امر کو کوس رہا تھا جو اسے جنم دینے کا موجب بننا تھا۔ اس کا دل اس عورت کو لعن طعن کر رہا تھا جس نے اک ناجائز بیٹی کو پالنے میں اتنی محنت کی تھی۔ کاش ناجائز بیٹی کو موت آگئی ہوتی۔ وہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”پھر کیا سوچا ہے انشاء کر دوں سارا راز نواب صاحب کے سامنے۔“ فیروز اس کی بے چینی سے لطف لے رہا تھا۔ ”ان کو بھی انگوٹھی دکھا کر ثابت کر دینا۔ کہ تمہاری ماں کی شادی ہوئی تھی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ”بھلی۔ یہ ہیرے کی انگوٹھی دے کر اس نواب زاوے نے جال پھینکا تھا۔ تمہاری ماں پھنس گئی اس جال میں۔ چھوڑو یہ باتیں ہاں تو ناہید اگر تم اس راز کا انکشاف چاہتی ہو۔ تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔“ فیروز اب معاملے کی بات کر رہا تھا۔ ناہید عالم خیال سے حقیقت کی دنیا میں آگئی۔ فیروز اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ سرخ زرتار سازھی اور یاقوتی سٹ پنے نرم نرم صوفے پر منصور کے ذاتی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اور سامنے میزوں پر چائے کا سامان پڑا تھا۔ اس کے دل سے اک ہوک اٹھی۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”منظور ہے۔ ادا کرو گی قیمت۔“ فیروز اپنی کامیابی پر پھولانہ سارہا تھا۔ ”جلدی کرو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ جواب دو..... منظور ہے۔“

”منظور ہے۔“ وہ جیسے خواب میں بول رہی تھی۔ ہولناک تباہی اتنی قریب تھی کہ ڈر کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ آبلے پڑ رہے تھے۔ اور وہ تکلیف سے کرا رہی تھی۔ ”پہلی قسط کل لینے آؤں گا زیور چیک یا نقد جیسے مناسب سمجھو۔ کم از کم پانچ ہزار ابھی لوں گا۔ جب جب ضرورت پڑے گی وصول کرتا ہوں گا۔“

فیروز جانے کیا کہہ رہا تھا۔ ناہید کا دماغ بڑی تیزی سے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ ”خود کشی۔“ یہ آخری حیلہ تھا۔ درد کا آخری مداوا تھا۔

ناہید نے فیصلہ کر لیا۔

”کل اسی وقت اسی طے میں آؤں گا۔ اگر وعدہ خلافی کی تو یاد رکھنا خطرناک انجام ہو گا۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ ناہید اٹھ کر کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹٹلنے لگی۔ نیچے لان میں چائے پی جا چکی تھی۔ ایک درخت کے نیچے بزرگ کے صوفے پر منصور اک محنت سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے دوست انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ ناہید کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

”منصور میں تمہارے بغیر مر بھی نہیں سکتی۔ میں کیا کروں منصور۔“

وہ بے دم سی کرسی پر گر گئی۔

”تم اپنی حیثیت سے بہت بڑھ رہے ہو۔“

”اپنی حیثیت بھی نہ بھولو ناہید۔ تم رعشی زادی ہو۔ رعشی کا دلال ہونا تاہم انہیں معتد رعشی کی اولاد ہونا“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

”تم مجسم شیطان ہو“ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس کا پاکیزہ خون کھول رہا تھا۔ فیروز کے ذلیل مشورے نے اس کی نیک سیرت پر کندہ جھری چلائی تھی۔ ”دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم انسان نہیں حیوان ہو شیطان ہو۔“

”تمہاری تقدیر اسی شیطان کی مٹھی میں ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارا یہ فلسفی خواب ٹوٹ جائے عشق کا سارا نشہ ہرن ہو جائے وقت ہے چاہتی ہو تو تقدیر بتا لو۔ اپنی ماں کی زندگی کی مثال لو۔ اس کی تقدیر کو بھی اسی خاکسار نے سنوارا تھا۔“

”سنوارا تھا یا ایک شریف اور مظلوم عورت کو خباثت کے ڈھیر تلے دفن کر دیا تھا۔“

”شریف عورت“ فیروز تضحی سے ہنسا ”تمہارا خیال ابھی تک نہیں بدلا۔“

”خیال ہوتا تو بدل بھی جاتا۔ یہ اک حقیقت تھی کہ میری ماں کو تم نے طوائف بنایا اس نے تم سے پناہ مانگی۔ رو رو کر تمہیں یقین دلانا چاہا کہ وہ ایک شہر کی بیابانہ بیوی ہے لیکن تم.....“

فیروز نے اک خوف ناک قہقہہ لگایا۔

”یہ کہانی زریزہ نے تمہاری ذہنی تسکین کے لئے گھڑی تھی۔ ورنہ نہ اس کی کوئی شادی ہوئی تھی۔ نہ تم کسی باپ کی جائز اولاد ہو۔ وہ مجھے اکثر رو رو کر یہ کہانی سنایا کرتی تھی..... کما کرتی تھی۔ وہ بہت بڑا نواب زادہ تھا۔ فیروز ہم نے چپکے چپکے شادی کر لی تھی۔ لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میری ماں کو پتہ چلا کہ میرے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ تو اس نے طوفان مچا دیا میں نے لاکھ یقین دلا یا کہ میں نے شادی کی ہے لیکن کون سنتا تھا۔ مجھے ایک بد معاش کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا.....“ فیروز اس کی ماں کی سرگزشت بڑے طنزیہ انداز میں کہے جا رہا تھا۔ اور ناہید سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”میری ماں نے مرتے وقت بھی یہی بات کہی تھی۔ مجھے اس کے الفاظ کی صداقت پر یقین ہے“ ناہید بڑے جوش سے بولی۔ ”میرا باپ۔“

فیروز اک کمرہ ہنسی ہنسا۔

”باپ..... نہ تمہاری ماں ثابت کر سکتی نہ تم.....“

”یہ انگوٹھی میرے باپ نے میری ماں کو دی تھی۔ ماں نے مرتے سے پہلے حم کھا کر کہا تھا“ لیکن اپنی دلیل کی کمزوری پر وہ خودی سر جھکا کر رہ گئی۔ انگوٹھی کوئی نکال نامہ تو تھا نہیں۔ یہ ماں کی عصمت کی قیمت بھی تو ہو

۲۱

خود کشی..... اس کے دماغ سے یہی لفظ کرا رہا تھا۔
فیروز پردہ اٹھا کر باہر نکلا تو زلفی دروازے پر کھڑے تھے۔ اس نے جھک کر انہیں سلام کیا۔ اور جانے کے لئے قدم اٹھائے۔
”مٹھرو۔“ زلفی نے تھمکا نہ کہا۔ فیروز پلٹ کر رک گیا۔ زلفی بڑی متانت سے قدم اٹھا کر اس کے قریب آئے۔ ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اور آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔
”میرا نام ذوالفقار علی خاں ہے۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولے۔ ”شاید یہ نام تم نے کبھی پہلے بھی سنا ہو۔“
فیروز کا کالارنگ ایک دم گہرا ہو گیا۔ اور اس نے سہم کر زلفی کو دیکھا۔
”ادھر آؤ۔“
زلفی پلٹے۔ فیروز گھبرایا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ طویل برآمدے طے کرتے ہوئے کئی گیلریوں سے گزر کر زلفی اپنی خواب گاہ میں پہنچے۔ فیروز نے ڈر کر انہیں دیکھا۔
”ہچکچا کیوں رہے ہو۔ اندر آؤ۔“ ان کے لبوں میں خوف ناک کڑک تھی۔
زلفی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔
اور جنب کوئی گھنٹہ بھر بعد فیروز نے دروازہ کھولا۔ تو زلفی پستول کی نالی اس کی چھاتی پر رکھ کر کہہ رہے تھے۔
”کبھی ادھر کارخ کیا۔ تو یہ پستول دیکھ لو۔“
فیروز گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے کمرے سے نکلا اور جدھر سے آیا تھا۔ ادھر ہی چلا گیا!

.....○.....

آسمان پر پورا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔
ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ اونچے اونچے درخت اور نازک نازک پودے خوشگوار سی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ چاندنی میں چمن کی سوئی ہوئی فضا بڑی رومان پرور تھی۔ خوبصورت پھول بوٹوں سے آراستہ چمن میں ایک مہر مرس چہوترے پر چمکیلا سفید قالین پڑا تھا۔ نرم نرم گاؤں گھٹنے رکھے تھے۔ اور ان نیکیوں کے سہارے سنہری حاشیے والا سفید ربڑی گاؤں پنے منصور بیٹھے تھے۔ ان کے زانو پر سر رکھے ناہید بیٹھی تھی۔ اس کی خبریں زلفی فضا کو معطر کر رہی تھیں۔ ملن رات تھی۔ اور دلوں کی طویل حکایتیں سنائی جا رہی تھیں۔
منصور ناہید کو کوئی پرانا قصہ سنا رہے تھے۔ اور ناہید کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔
وقت گذر رہا تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔ اور چاندنی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ منصور کو اپنے فضل سے خیال پریشانی ہو رہی تھی۔ فضل سا خیال جوان کے دماغ میں ناہید کی یک لخت طبیعت خراب ہو جانے کے بارے میں آیا تھا۔
اور ناہید بظاہر تبسم کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ لیکن اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔ رات کھانے پر زلفی بچانے کچھ عجیب طرح اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے یقین دلا یا تھا۔
”فیروز اب کبھی ادھر نہیں آئے گا۔“ اور پھر آہستگی سے بولے تھے۔ ”میں نے اسے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دے دیا ہے۔“
بات دراصل یوں ہوئی تھی۔ یاسمین کو یہ چلا کہ ناہید کا کوئی خاندانی ملازم آیا تھا۔ تو انہوں نے اس سے کہا۔ ”کچھ دے دلا دیا ہوتا ہے بے چارہ اس لے کر آیا ہو گا۔ مجھے تو یہ ہی نہ چلا۔“ ناہید کی تو روح تک لرز اٹھی تھی۔ ہاں زلفی نے کچھ عجیب طرح اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے یقین دلا یا تھا۔ ”فیروز اب کبھی ادھر نہیں آئے گا۔ میں نے اسے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دے دیا ہے۔“

ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ ستار کے تاروں سے دردیلے نئے پھوٹ رہے تھے۔ گانا کیا تھا۔ اک فریاد تھی۔ اس کی دکھی روح کی پکار تھی۔ اس کے ارمانوں کی چیخ تھی۔ وہ گاری تھی۔ گاری تھی۔ نقد و نوحہ بننا جا رہا تھا۔ ناہید حسرت و آلام کا مرقعہ بنی ستار پر جھکی ہوئی تھی۔ دلسوز نغمہ اس کے لبوں پر پھڑپھڑا رہا تھا۔

اس نے عشق کے داؤ پر جان کی بازی لگائی تھی۔ اور آج وہ جیتی ہوئی بازی ہار دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ زلفی سے رونمائی کے بعد وہ خائف تھی ضرور۔ زلفی سے پھر رحم کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن آج فیروز نے آکر تو اسے جنسی آگ کی لپیٹ میں دے دیا تھا۔ مصلحت چپ چاپ مرنے ہی میں تھی۔ اور اسی کا وہ عزم کر چکی تھی۔ مجسم فریاد بنی وہ ستار بجاتے ہوئے دلدوز گیت گاری تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بجھتی جا رہی تھی۔ زندگی کی جوت آخری لمحوں پر تھی۔ اس کے دل کا درد بڑھتا جا رہا تھا سینے میں مدوجذر کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ ذہن جل رہا تھا۔ آبلے پڑ رہے تھے۔ چھالے پھوٹ رہے تھے۔

یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی..... اور رات گزر رہی تھی۔

اس کی گھنٹی پلکوں کو اک قیامت خیز جنبش ہوئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر منصور کو دیکھا۔ وہ نکلنے پر بازوؤں کے حلقے میں سر رکھے آنکھیں بند کئے نیم دراز تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور منصور کی صحبت کی گھڑیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وقت کے قدموں میں لپٹ جائے۔ اس کی رفتار کو روک لے۔ ان حسین لمحات کو ابدی بنادے۔ اس صبح کو جوان کی ابدی جدائی کی پیامبر ہوگی کبھی طلوع نہ ہونے دے۔ لیکن وقت کو روک لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تقدیر کی گرہیں کچھ اس قدر پیچیدہ تھیں کہ اس کے کمزور ہاتھوں میں انہیں کھولنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔

ناہید کا دل اس بری طرح اچھلا کہ تاروں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی مخروطی انگلیاں رک گئیں۔ سازاک جھناکے سے خاموش ہو گیا۔ منصور نے سر اٹھایا اسے غبار آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس؟“

ناہید نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنی تڑپ کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھی آپ سو گئے۔“

”سو تو نہیں کھو ضرور گیا تھا۔“ یہ اس کے نفع کی کھلی داد تھی۔ منصور واقعی کھو گئے تھے۔ مابوس موسیقی اور مغموم ترنم نے انہیں مضحل سا کر دیا تھا۔ ناہید کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے جلو میں آنسوؤں کی دھندلاہٹیں تھیں۔

”کیسا ہانفہ۔“ وہ ستار کے تاروں کو یونہی پھیرتے ہوئے بولی۔

سب زلفی کی بات پر ہنس دیئے تھے۔

اور اب بھی وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی۔ منصور کے زانو پر سر رکھے زلفی کی بات سے کوئی واضح مفہوم نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ناہید“ منصور اس کے بالوں کی لٹ سلجھاتے ہوئے بولے۔

”جی۔“ اس نے شیریں لہجہ میں جواب دیا۔

”وعدہ یاد ہے۔“ وہ اب بھی اس کے گھونگھریالے بالوں میں بڑی محبت سے انگلیاں پھیر رہے تھے.....

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی ”یاد ہے.....“

”تو سناؤ پھر۔“ منصور اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ”کوئی ایسا نغمہ کہ مجھوم جائے شاب تیرا.....“

ناہید نے اک توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس کا قیامت خیز بدن اک قربانی تناؤ کے بعد ڈھیلا پڑ گیا۔ منصور کے بازوؤں کے سارے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج اس نے بڑی جذبات انگیز لباس پہنا تھا۔ سفید جھیلے لمبے گاؤن کی باریک ریشمی ڈوریاں اس کے ہر بندہ مرمریں شانوں پر بڑی خوبصورتی سے بندھی تھیں۔ اس کا مین جالی کا دوشہ سائے کی طرح اس کے بالوں اور پشت پر پڑا تھا۔ ہیروں کا ایک بیش قیمت سیٹ پہن رکھا تھا۔ سڈول کلائیوں پر خوبصورت جڑاؤ چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ گلے میں نفیس لاکٹ تھا۔ اور کانوں میں ہیرے کی سفید بالیاں آج اس نے جی بھر کر سنگار کیا تھا۔ بالوں کو کسی انوکھی وضع سے سنوارا تھا۔ اور اس انوکھے سنگار اور اچھوتے لباس میں وہ نظر فریب تخلیق معلوم ہو رہی تھی۔ جس کی شراب جوانی کا ساغر پھلک رہا تھا۔

یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔

آج فیروز کے چلے جانے کے بعد وہ خود کشی کا مسم ارادہ کر چکی تھی۔ منصور کی قربت میں یہ آخری رات وہ جی بھر کے منانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس رات کے ایک ایک لمحے سے وہ داد و عشرت وصول کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگ رہی تھی۔ اور منصور کی آغوش میں سپردگی کے انداز میں سائی ہوئی تھی۔ یہ لمن کی آخری اور مختصر رات تھی۔ اور دل کی حکایتیں بڑی طویل تھیں۔

ناہید اک ادائے دلربانہ سے انھی۔ منصور نے پیچھے پڑی ہوئی ستار لاکر اس کے سامنے رکھ دی۔ ستار پر جھکی ہوئی وہ کسی شاعر کا روٹاںی تخیل معلوم ہو رہی تھی۔ منصور مسکراتے ہوئے اس کے جمال کی تجلیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کارواں رواں اک کیف و زامست سے سرشار تھا۔ گاؤں بکھنے پر دونوں کہنیاں نکائے اپنے ہاتھوں پر چہرہ تھا وہ اسے بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر اس کے رخ روشن پر تھی۔ اور روخ سمت کر سماعت بن گئی تھی۔

ناہید گاری تھی۔ نغمہ ہوا کی لہروں پر قہر قہرا رہا تھا۔ اس کی سوز بھری آواز ساکن رات کے سینے میں

”مان گئے سرکار مان گئے۔“ منصور مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھے۔ ان کا دل ابھی تک متاثر

تھا۔

”گھنڈہ کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ چلئے اندر چلیں۔“ انہوں نے نکتے پر پڑا ہوا شنیل کا سفید خوبصورت سا شال اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اک ہلکے سے جھٹکے سے بالوں کی بیقرا لٹوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے وہ ٹھنڈی توڑی دیر بعد وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

زینے کے قریب پہنچ کر منصور رک گئے۔ زینے کا بالائی حصہ روشن تھا۔ آخری پکڑ پر ایک عورت کا خوبصورت مجسمہ ایسا تہ تھا۔ جس کی آنکھوں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر زینے کے سرخ قالینوں پر پڑ رہی تھی۔ سنہری رینگ چمک رہی تھی۔

”ناہید یاد ہے یہ جگہ۔“ منصور بڑی عقیدت سے زینے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

ناہید کے دماغ میں جھگڑے چل رہے تھے۔ مایوس حسرتوں کا مقابلہ کرتے کرتے وہ ہار گئی تھی۔

”اس جگہ..... اس جگہ.....“ وہ بھلائی۔

”ہماری محبت نے جنم لیا تھا۔“ منصور نے اس کی ہنستے ہوئے بات پوری کر دی۔ ”میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب ملاقات یاد آ جاتی ہے۔ وہ چند لمبے غیر فانی نقش چھوڑ گئے۔“

”میں مرجاؤں تو مجھے میں دفن کر دیجئے گا۔“ وہ بڑی سوگوار آواز میں بولی۔

منصور کو وہ رات یاد آ گئی۔ جب یاسین نے اسے ان سے متعارف کرانے کے لئے روک لیا تھا۔ اس دن بھی اس نے اک مایوس سا نغمہ سنایا تھا۔ اور رات تک اتنی بے چین رہی تھی کہ بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ منصور نے اسے ہسانے کے لئے کہا۔

”کوئی ایسی وصیت کیجئے کہ وہ عالم جو بندہ پوری کر سکے۔“

منصور زینے پر تھے۔ اور ناہید رینگ کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

”یہی ہے میری وصیت۔“ اس نے اسی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”میں کوئی آپ کی لاش دفن توڑتا ہی کروں گا۔ حوطہ کروا کے اپنے کمرے میں رکھوں گا۔“

”سبھی۔“ انہوں نے پیار سے اسے گھورا۔

معائنہ کو یاد آ گیا۔ کہ وہ آج رات جی بھر کے ہنس ہنس کے منانے کا تہیہ کر چکی ہے۔ زندگی کی آخری رات۔ گھٹی ہوئی آرزوؤں اور دم توڑتے ہوئے ارمانوں کی آخری رات۔ منصور کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے خوبصورت دانت چمک اٹھے۔

”اگر میں واقعی مر گئی..... تو“ اس نے ہنس کر منصور سے پوچھا۔

”بندہ رودھو کر اپنی بد قسمتی پر شاکر ہو رہے گا۔“ منصور نے شوخی سے کہا۔

”بس۔“ وہ ہنسی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”اچھا بھی پاگل ہو جاؤں گا۔ اس سے بھی زیادہ چاہتی ہیں۔ تو اسی زینے سے کود کر ہلاک ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ ناہید کو سننا ہی پڑا۔

منصور اس کی طرف بڑھے اس کے گلابی گال پر پیار سے چپٹ لگاتے ہوئے بولے۔

”آئندہ ایسی باتیں منہ سے نکالیں تو بس یاد رکھیے گا۔“

دونوں ہنس دیئے۔

خواب گاہ کے باہر ان کی طرف منہ پھیرے خاندانی معرور محمد الدین کھڑا تھا۔ ناہید منصور کی گرفت سے نکل کر اندر چلی گئی۔

”کون ہے۔“ منصور نے پوچھا۔

”میں ہوں سرکار۔“ محمد الدین نے ان کی طرف منہ کر لیا۔

”تم یہاں۔ اس طرف۔“ منصور حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”سرکار۔“ منصور نے حیرت سے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ کے نام خط ہے۔ بڑے سرکار دے گئے ہیں۔“

”کون۔ زلفی بچا۔“

”جی سرکار۔“

منصور نے حیرانگی سے لفافہ دیکھا۔ بھاری نیلے لفافے پر صرف ناہید لکھا تھا۔

”کب آیا تھا۔“ منصور نے پوچھا۔

”کوئی گھنڈہ بھر ہوا ہو گا سرکار۔“ وہ بولا۔ ”جانے سے پہلے دے گئے تھے۔“

”جانے سے پہلے۔“ منصور کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ”جی سرکار۔“

”کہاں گئے۔“

”کچھ بتایا نہیں تھا۔ بار بار یہی تاکید کرتے تھے کہ خط بیگم صاحبہ کو دے دینا۔“

”تم نے ان کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“ منصور مسکرا کر بولے۔ وہ کچھ گھبرا گیا۔

”نہیں سرکار۔“ وہ ادب سے بولا۔ ”بات یہ ہے سرکار کہ وہ کچھ پریشان سے تھے۔ بڑے

پریشان تھے۔ ان کی آنکھیں پتہ نہیں کیسے نظر آ رہی تھیں سرکار۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”کیا کہہ رہے ہو محمد الدین۔“ منصور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

ہوا لاکٹ دل کے تیز دھڑکنے پر بری طرح لرز رہا تھا۔

چچ کی آواز پر منصور نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ ناہید صوفے کے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔ منصور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹے۔

”ناہید۔“ انہوں نے گہرا کر اس کے نیچے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔

وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نیلے رنگ کا لٹافہ قریب میز پر پڑا تھا۔ اور خطا اس کی مٹھی میں بھینچا تھا۔ منصور بے حد گھبرا گئے۔

ناہید کو بڑی آہستگی سے ہاتھوں پر اٹھایا۔ اور چھپر کھٹ پر لٹا دیا۔ بلوریں صراحی سے اس میں پانی ڈال کر وہ اس کے منہ پر چھینٹے دینے لگے۔ نیلے رنگ کا خط ابھی تک اس کی مٹھی میں تھا۔ منصور کی سمجھ سے معاملہ بالاتر تھا۔ وہ جلدی سے جلدی ناہید کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں چھپکائیں۔ اور پھر کھول دیں۔

”ناہید۔“ منصور کی آواز میں محبت کی لرزش تھی۔

وہ کچھ دیر یونہی پڑی رہی۔ منصور رومال سے اس کے ہیکے ہوئے چہرے کو پونچھتے رہے۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ دبائے۔ دوسرے لمبے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”کچھ تو کہئے ناہید.....“ منصور نے گہرائی ہوئی بے چین آواز میں کہا۔ وہ اس کے پیلو میں چھپر کھٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور لمبے سفید سنہری حاشے والے گاؤں میں کوئی یونانی دیوتا دکھائی دے رہے تھے۔

ناہید نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانڈوں پر نظر ڈالی۔ وہ اٹھی۔ کانڈ منصور کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اس کے آنسو تیزی سے بنے لگے۔ اس کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔ اس نے بے تاب ہو کر منصور کے کندھے پر اپنا سر نکا دیا۔

جوں جوں منصور خط پڑھ رہے تھے۔ ان کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ چہرے کا رنگ پیلے بن رہا تھا اور اس کے بعد ضرورت سے زیادہ سرخ ہو گیا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور بڑے بے تاب نظر آرہے تھے۔ خط ختم کر کے انہوں نے ناہید کو دیکھا۔ جو سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پھر انہوں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے۔

”روٹی کیوں ہیں ناہید۔“ انہوں نے اسے تھمتھایا۔ لیکن ان کی آواز بھرا گئی۔ اور ان کی آنکھوں کے گلابی ڈورے سرخ ہو گئے۔ وہ اٹھ کر بے تابانہ ٹپٹنے لگے۔

”اسی وقت جانا چاہئے۔ کہیں زلفی بچا.....“ وہ جانے کیوں رک گئے۔ شاید وہ کوئی منحوس بات منہ

”سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے آج تک انہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ بار بار یہی کہتے تھے۔ صبح خط دیتا۔ کوئی بات ضرور ہے سرکار۔ غلام نے انہیں اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا آخر میری بھی اتنی عمر یہیں گزری ہے۔ کوئی بات ہے۔“ وہ بار بار ہاتھوں کو مل رہا تھا۔ ”جاتے وقت مجھ سے ہاتھ ملا کر گئے ہیں۔ یہ ساری عمر میں پہلا اتفاق ہے حضور۔“ محی الدین کی بوڑھی آنکھوں میں جانے کیوں آنسو آگئے۔

”جاؤ۔“ منصور بولے۔ اور لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اندر چلے گئے۔

ناہید چاندنی کی زد میں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ جی جانے خود نہ جلائی تھی..... یا جلائے کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ شاندار چھپر کھٹ کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ جو دھیمے دھیمے اندھیرے میں اسے مدفن کی طرح نظر آرہی تھی۔ ”کل کیا ہو گا۔“ اس نے سوچا۔ ماس چھپر کھٹ پر میری لاش ہوگی۔ اور منصور۔“ وہ ان کی حالت کا تصور بھی کرتے ہوئے گھبرائی۔ دونوں ہاتھوں سے سر قہام لیا۔ منصور نے دور سے اسے دیکھا۔

تیزی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولے۔

”پھر خراب ہو گئی طبیعت۔“

ناہید نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ”نہیں ٹو۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”آپ کے نام خط ہے۔“ منصور نے ناہید کے ہاتھ میں لفافہ دے دیا۔

”میرے نام۔“ وہ تعجب سے لفافے کو دیکھنے لگی۔

”زلفی بچا آپ کے نام خط دے گئے ہیں۔“ کہتے ہوئے منصور نے ہٹن دیا۔ کمرہ تیز برقی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ ناہید کو یوں محسوس ہوا جیسے منصور نے خط نہیں اس کے ہاتھ میں ہم کڑا دیا ہو۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ منصور اسے سارا دے کر روشنی کی طرف لے آئے۔

”یہاں بیٹھ کر پڑھئے۔“ انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ ناہید کا دماغ سن ہوتا رہا تھا۔ اس کی رگوں میں جیسے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ لفافہ منصور کے سامنے کھولتے ہوئے پچکپا رہی تھی۔

منصور نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔

”پڑھئے نا۔“ وہ لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے بولے۔

ناہید نے اک گہرائی ہوئی نگاہ منصور پر ڈالی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑے باغی کی ادھمتی ہوئی فضا کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے اپنے منتشر حواس کو بڑی مشکل سے یک جا کیا۔ اور بڑی ہمت کر کے لفافہ چاک کیا۔

نیلے رنگ کے کانڈ پر اس کی نظریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ شدید طور پر کانپ رہے تھے۔ اور اس کے چہرے کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ گلے میں پڑا

اتر آیا۔ اور کپڑے سیٹھے لگا۔ یوں میری ملاقات زربہ سے ہوئی۔ پہلی نظر میں محبت کا قائل نہیں تھا۔ لیکن زربہ کو دیکھ کر میرا برسوں کا نظریہ باطل ہو گیا۔

زربہ ایک متوسط الحال خاندان کی لڑکی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں کے ناجائز دباؤ اور اس کے ناروا سلوک سے وہ اپنی گھریلو زندگی سے مطمئن نہ تھی۔ وہ اپنے ماحول سے باغی نظر آتی تھی۔ تم اپنے سارے زیورات اتار دو۔ ان جھلملاتے ہوئے ملبوسات کی جگہ سادہ سے کپڑے پہن کر آئیے میں جھانکو۔ تمہیں آج سے بیس برس پہلے کی زربہ نظر آئے گی۔ تمہاری شکل و شبابت کس قدر اپنی ماں سے مشابہت رکھتی ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد دو دن تک میں انہیں خیالات میں الجھ رہا ہوں۔ میری پریشانی کا اندازہ شاید تم کبھی بھی نہ کر سکو۔

زربہ کے والدین کسی تقریب کے سلسلہ میں دوسرے شہر گئے زربہ دو تین چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر ہم نے اپنی محبت کی بات کے لئے چپکے چپکے شادی کر لی۔

نکاح کے وقت میرے تین دوست اور ایک مولوی صاحب تھے۔ جنہیں میرے ایک دوست جانے کہاں سے لائے تھے۔ منصور کے دوست غزالی کے والد میرے عزیز دوست اور میری اس شادی کے معنی شاہد تھے۔

تین دن کے بعد اس کے والدین آگئے۔ اور میں زربہ کو اک سہانے اور خوش گوار مستقبل کی امید دلا کر اس سے جدا ہو گیا۔ کالج بند ہوا۔ تو میں گھر آیا۔ زربہ مسرور تھی کہ شادی ہو جانے سے وہ سوتیلی ماں کی دست برد سے باہر ہو گئی ہے۔ اور میں خوش تھا کہ شادی کر کے ہم دینی اور دنیاوی طور پر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی یہ بندھن نہ توڑ سکے گی۔

میں شاداں و خرم ہوا گھر آیا۔ والدین کے سامنے اپنی شادی کا ذکر کیا کیا۔ والدین کا وقار اور نسلی تفاخر سمجھ مجھ پر چھٹ پڑے۔ میں رویا۔ چیخا۔ چلا یا لیکن میرے منہ میں ظاہری آن اور جھوٹی عزت ٹھونس دی گئی۔ یہ بات اندر ہی اندر دبائی گئی کیوں کہ اس سے ایک بہت بڑے خاندان کی عزت کو بندھ لگنے کا امکان تھا۔ میرے احتجاج کے باوجود میرا بڑا خاندان اک عام خاندان کی معمولی لڑکی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ جاہ و جلال کی ہنگ تھی۔ یہ آن بان کی توہین تھی۔

میری فریاد پر کسی کا دل نہ بچا۔ میری اس قدر کڑی نگرانی کی گئی کہ میں بے بال و پر پرندے کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ مجھے تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ اور اتنی مہلت بھی نہ دی گئی کہ میں زربہ کو لمحہ بھر کے لئے دیکھ بھی سکتا۔

دل کی آگ سلتی رہی۔ اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اگلے سال واپس آکر زربہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔ ماں باپ سرپٹکتے رہیں۔ خاندان تملاتا رہا۔ ہم دونوں جائز طور پر میاں بیوی تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہ

سے نکالنا نہ چاہتے تھے۔ ”اٹھئے۔ جلدی سے لباس تبدیل کیجئے۔“ وہ اس کے سڈول بازوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ اٹھ اٹھ سے بولے۔ ”میں بھی تیار ہوتا ہوں۔ دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

ناہید نے آنکھیں پونچھ لیں۔ لیکن آنسو اب بھی اسی طرح بہہ رہے تھے۔ منصور کے سارے وہ چہرہ کھٹ سے اتری۔ اور اپنے ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی خاص ملازمہ اس کا لباس تبدیل کروا رہی تھی۔

منصور کپڑے بدل کر آگئے تھے۔ وہ نیوی بلوسٹ میں ملبوس تھے۔ ناہید ابھی تک ڈرائنگ روم سے باہر نہ آئی تھی۔ وہ چہرہ کھٹ پر پڑے ہوئے خط کو اٹھا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

عزیز روح

میرے طرز خطاب پر شاید تمہیں حیرت ہو۔ لیکن جس بڑی حقیقت کا میں انکشاف کرنے والا ہوں۔ وہ جان لینے کے بعد تمہیں تمہاری حیرت کا جواب مل جائے گا۔

کچھ اور لکھنے سے پہلے فیروز کے بارے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اب کبھی تمہاری متاثرہ زندگی میں خار بن کر نہ کھٹکے گا۔ وہ دوسو سو بن کر تمہاری حیات کا خون چوس لینے کے لئے آیا تھا۔ یہ دوسو سو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دو۔ وہ اب کبھی بھی نہیں آئے گا۔ رات میں نے تمہیں کھانے پر یہی یقین دلا یا تھا۔ لیکن تمہاری آنکھوں سے عدم اعتمادی چمک رہی تھی۔ اور تم ضرورت سے کچھ زیادہ گھبرا رہی تھیں۔

ناہید۔ آج وہ بد بخت انسان تم سے مخاطب ہے۔ جس نے شادی کی۔ اور ایک بچی کا باپ بھی بنا۔ لیکن جسے ازدواجی زندگی کی تین راتوں کے معاوضے میں زندگی بھر کی جلن دے دی گئی۔ اور جو اتنا بھی نہ جانتا تھا۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے بھی ایک بچی لاوارث اور ناجائز قرار دی جا رہی ہے۔

اس دن رونمائی کے وقت جب یاسین نے تمہارا گھونگھٹ الٹا تو جیسے میری گزشتہ زندگی کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ ایک نکتہ میرا ذہن آج سے بیس برس پہلے کی دیکھی ہوئی دھندلی دھندلی تصویر کی جانب گھوم گیا۔ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ کر تمہارے ہاتھوں پر گر گیا۔ تمہاری انگلی میں وہی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ جو میں نے شب زفاف زربہ کی انگلی میں اپنی محبت کی یادگار کے طور پر پہنائی تھی۔ لیکن حالات نے اس طرح پلٹے کھائے کہ محبت کی معصوم یادگار کو عصمت کی قیمت سے تعبیر کیا جانے لگا۔

بیس برس پہلے میں پرکے ہوئے شل کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ بجائے کا آخری سال تھا۔ موٹی سی فلسفہ کی کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ کھڑکی عمارت کے پچھلی طرف ایک چوڑی گلی میں کھلتی تھی۔ ٹھوکر لگنے سے ایک پندرہ سالہ حسین لڑکی گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے گر کر ریشمی کپڑے پھیل گئے۔ جانے کیوں میں کو دکر گئی میں

کر سکتی تھی۔

سال بھر بعد میں واپس آیا۔ تو ہنگامہ سوچا تھا۔ مجھ پر عائد کی ہوئی تمام پابندیاں بھالی گئی تھیں۔ دوسرے ہی دن میں دل میں تینوں کے پاس گیا۔ لیکن..... وہاں زینہ کہاں تھی۔ میری حسرتوں کے جنازے اٹھ چکے تھے۔ میری امیدوں کے حزاروں پر جلنے والے چراغ تک بھج چکے تھے۔ زینہ بیچ و پکار کے باوجود کسی کو اپنی شادی کا یقین نہ دلا سکی تھی۔ اسے اس کی سوتیلی ماں نے ایک بد معاش کے ہاتھ سوپ دیا۔ اسے بیچ ڈالا۔ اس کی فریاد پر اس پر پھٹکار برسی۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ لہن طعن کرنے والے بھی تھے۔ زینہ میرے لئے گیا وقت تھی جو ہاتھ نہ آ سکے۔

وہ دنیا کی نظروں میں کنواری تھی۔ اور ایک کنواری لڑکی کا حاملہ ہونا ناقابل معافی جرم تھا۔ کسی نے اس کے بیان کی تصدیق نہ کی۔ اسے جنم میں دھکیل دیا گیا۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اسے ایک بد معاش کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ چند دن مجھ پر مجنونانہ سی کیفیت طاری رہی۔ مجھے کھوکھلی تسلیاں دی گئیں۔ میرے زخموں کا علاج ایک حسین صورت اور عالی خاندان کی لڑکی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میں سب کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر انگلیںڈ چلا گیا۔ مجھے اس سرزمین سے نفرت ہو گئی..... جہاں دو معصوم دلوں کو خاندانی آن پر قربان کیا گیا تھا۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی کردہ گناہوں سے زیادہ سزا دی جاتی تھی۔ اور اگر منصور اور یاسمین کی کشش میرا دامن نہ کھینچتی تو شاید میں اس جگہ ایک بار بھی لوٹ کر نہ آتا۔

وقت گزر گیا۔ اور میں نے اپنے زخموں کے منہ پر پھاہار کھ دیا۔ زندگی کی تمام تلخیوں کو قہقروں میں ڈبو دیا۔ لیکن دن کو ہنسنے ہنسانے والا زلفی رات کی تاریکیوں میں منہ چھپا چھپا کر روتا رہا۔

میں برس گذر گئے۔ مجھے زینہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس دن رونمائی کے وقت تمہیں دیکھ کر میرا دماغ چکر اٹھا۔ تمہارے ہاتھ میں میری انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اور تمہارے چہرے پر زینہ کا پرتو۔ دودن میں نے جس اضطراب میں کانٹے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ ذہنی الجھاؤ نے مجھے خوف ناک حد تک پریشان رکھا۔ کبھی سوچتا تھا۔ کہ تم میری ہی اولاد ہو۔ اور کبھی خیال آتا۔ زینہ کی شادی کر دی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے تمہارا باپ کوئی اور ہی ہو۔ یہ کوئی معمولی چرکا نہ تھا۔ میرے دل کے گھاؤ گہرے ہو گئے۔ زخموں کے منہ پھر سے کھل گئے۔ اور ان سے جو لہو نچکا وہ میری زندگی کا نچوڑ تھا۔

آج چائے پر میں تم سے سارے حالات تفصیل سے پوچھنے کا تہیہ کر کے تمہارے پیچھے ہی چن سے اٹھ کر آیا۔ تم مجھے دیکھ کر اس قدر گھبرا گئیں کہ میں پریشان ہو گیا۔ اس وقت تمہاری گھبراہٹ میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن اب میں تمہارے احساسات کو جانتا ہوں۔

الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ ملازم نے تمہارے خاندانی نوکر کے آنے کی اطلاع دی۔ فیروز کے

نام پر تمہاری حالت اس قدر غیر ہو گئی کہ میں معاملے کی عجیب و غریب نوعیت سے پوری طرح نہ سہی کسی حد تک سہی، آگاہ ضرور ہو گیا۔ اور جب فیروز کمرے میں آیا تو تم اس قدر سہم گئیں کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا۔ تم کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤ۔ تمہیں باتیں کرنے کا موقعہ دے کر میں باہر نکل گیا۔ میں نے اس دن دانستہ طور پر اخلاقی جرم کیا۔ اور تم دونوں کی باتیں دروازے کے قریب کھڑے ہو کر سنیں۔

یقیناً نونا ہید۔ اگر زینہ میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیتی تو مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا فیروز کی زبانی یہ سن کر ہوا کہ زینہ طوائف بن گئی تھی۔ حالات نے اسے یہ ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک مرد کے وعدہ فردا پر نوانیت کا پیر بن جھیر جھیر کر دیا گیا تھا۔ اک معصوم اور بھولی لڑکی میری کوتاہی سے جنمی شعلوں کی لپیٹ میں آکر جھل گئی۔ کاش میں اس وقت ماں باپ کے دباؤ میں آکر انگلیںڈ نہ جاتا۔ زینہ ایک عورت تھی۔ حالات کی چکی میں پس کر رہ گئی۔ لیکن آفرین ہے اس کی ہمت پر۔ اتنے مخدوش حالات میں بھی اس نے میری دی ہوئی امانت کو جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اسے اس آگ کی تپش نہ لگنے دی جس آگ میں وہ دن رات جل رہی تھی۔

فیروز سے میں نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ زینہ نے تمہیں اپنے ماحول سے الگ رکھ کر پالا ہوا۔ تمہاری تربیت تمہارے شان شایاں کی۔ اور جب فیروز جیسے خونی بھڑیئے نے تمہاری طرف نگاہیں اٹھائیں۔ تو وہ سینہ سپر ہو کر سامنے آ گئی۔ تمہیں بچانے کے لئے اس نے جان کی بازی لگادی۔ خود مر گئی۔ لیکن اپنی نظروں کے سامنے تمہیں اس رسوا اور ذلیل ماحول میں آنے نہ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد معتد آیا تمہاری پاکیزگی کو محفوظ نہ دیکھ کر تمہیں لے کر بھاگ نکلی۔

ثرین کے حادثے میں زخمی ہو کر تم سلطان پور پہنچیں۔ منصور کے پاس ملازمت کر لی۔ یہ سارے حالات مجھے یاسمین نے سنائے تھے۔ اس وقت میں نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن آج..... کاش میں اپنا سینہ چر کر تمہیں بتا سکتا۔

تمہاری باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنے حالات سے منصور کو باخبر نہیں کیا۔ اپنی ماں کی طوائفیت کو ان کے سامنے عیاں کرتے ہوئے تمہارے بلند کردار اور غیور طبیعت کو ٹھیس لگتی تھی۔ اسی لئے تم نے شادی سے انکار بھی کر دیا تھا۔ لیکن منصور کی بیماری کے بعد تم مجبور ہو گئیں۔ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ تمہارا ڈر بے بنیاد تھا۔ منصور جیسے عالی حوصلہ انسان تمہیں قبول کر چکے تھے۔ یہ بات ان کی بے مثال محبت پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔

فیروز نے باتوں ہی باتوں میں تمہاری معصومیت سے فائدہ اٹھا کر معلوم کر لیا کہ تم نے منصور کو اپنے

داوانہ کر سکا۔ اور جس سے تم نے شاید ہمیشہ نفرت کی.....

تمہارا گناہ گار باپ

ذوالفقار علی خان

منصور نے خط تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اور بے قراری سے کمرے میں ٹٹلنے لگے۔ ملازمہ کے سہارے ٹاہید آگئی۔ منصور چہرے پر بے اشتہار پیدا کرتے ہوئے اس کی طرف آئے۔ ملازمہ ادب سے سمت کر باہر جانے لگی۔

”شکوہ“ منصور نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جی سرکار۔“ وہ کچھ جھک کر بولی۔

”بابی سے صبح کہہ دیتا۔ ہم دولت آباد جا رہے ہیں۔ ان سے کتنا گھبراہٹیں نہیں فرصت میں دولت آباد پہنچ جائیں۔“

”بہت بہتر۔“ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ منصور نے بازو بڑھایا۔ ٹاہید ان کے سہارے باہر آگئی۔ اس کے چہرے کا رنگ کچھ آنسوؤں سے اور کچھ اندرونی کیفیت سے گلابی ہو رہا تھا۔ گمرے سبز شنیل کے خوب صورت لباس میں اس کا بیار سا چہرہ بڑا پرکشش نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شاندار رولس راکس دولت آباد جانے والی سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ چاند مسکرا رہا تھا۔ رات بید حسین تھی۔ منصور کا بازو ٹاہید کی کمرے کے گرد حائل تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ شیرنگ تھامے تھے۔ وہ اس وقت آج کے عجیب و غریب انکشاف کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ٹاہید سے ملاقات۔ اپنی لازوال محبت۔ ٹاہید کا انکار۔ اور پھر خود ہی چلے آنا۔ شادی۔ اس کے بعد ضمیر کی جھجھک۔ ٹاہید کی طبیعت کا بار بار خراب ہونا۔ سب ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

اور

ٹاہید ان کے شانے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے خیالات ابھی تک الجھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اب کی حالت اس کھلاڑی کی سی تھی۔ جسے زندگی کی دوڑ میں اس مشکل سے جیت نصیب ہوئی ہو کہ اسے اپنی فتح کی خوشی منانے کا بھی ہوش نہ رہا ہو۔

”ٹاہید“ منصور نے اپنے گال اس کی خمیریں زلفوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔

”جی“ وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

”آپنے سب کچھ پہلے کیوں نہ بتا دیا۔ کیا مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ انہوں نے محبت آمیز گلہ کیا۔

”اعتقاد“ ٹاہید کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نم آلود آنکھوں سے منصور کو دیکھ کر کہا ”اس

حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ بڑا بد طبیعت انسان ہے۔ تمہارے اس کے ہاتھوں بچ نکلنے سے جو اسے نقصان پہنچ چکا تھا، اب وہ اس کی تلافی کروانا چاہتا تھا۔ وہ تم سے اس راز کے اخفاء کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرنے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن اب اس کی طرف سے تم مطمئن رہو۔ وہ کبھی نہیں آسکتا۔ تمہارے کمرے سے باہر آنے کے بعد میں نے ٹھنڈے بھرا سے اپنے کمرے میں رکھا۔ اور پھر وہ ڈرتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ تمہاری ماں کے الفاظ کو وہ ہمیشہ جھوٹ سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ لیکن میرا نام سننے کے بعد اور میرے اعتراف حقیقت پر وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ کبھی اب تمہارے پاس آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

فیروز کے جانے کے بعد جانتی ہو۔ میرے دل میں کیا خواہش چلی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر تمہیں سینے سے چٹالوں۔ اتار دوں اتار دوں کہ برسوں کی سینے میں جلتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ غائبانہ نفرت..... تم نے فیروز کو کہا تھا۔ ”اس مرد کا میرے سامنے نام نہ لو جس نے میری شریف ماں کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا اور جو میری تباہی کا موجب بن رہا ہے۔“

تم مجھے خطا وار سمجھنے میں حق بجانب ہو۔ میری ہی وجہ سے تمہاری ماں نے قہر ذلت میں سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ میری ہی وجہ سے تم نے ایک لمحہ چین کا نہ گذارا۔ میری ہی وجہ سے تم تمام عمر اک تذبذب میں گرفتار رہیں۔ اف..... میں تمہارا اور تمہاری ماں دونوں کا گناہ گار ہوں۔ شکر ہے۔ کہ تم اپنے صحیح مقام پر پہنچ گئی ہو۔ ایک بد نصیب باپ کے لئے یہی باعث تسکین ہے۔ خدا کرے۔ تم منصور کے ساتھ زندگی کی بہاریں لوٹو..... رحمت کے سہارے ہمیشہ تمہیں اپنے داموں میں پناہ دیں۔

میں غلت میں سب کچھ لکھ رہا ہوں۔ میرے سینے میں مدوجزر کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہیں۔ میں نے زرینہ کے بعد کسی عورت کی طرف ایک مرد کی طرح نگاہ تک نہ اٹھائی تھی۔ یہ میں نے اپنی دانست میں اپنے آپ کو سزا دی تھی۔ لیکن شاید یہ سزا کافی نہ تھی۔ اس سے بھی ایک سزا قدرت نے میرے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ یہ سزا مجھے آج ملی ہے۔ ایک باپ کے لئے اس کی اپنی اولاد کا شکر..... یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

میں دولت آباد جا رہا ہوں۔ چند ضروری امور کے سلسلہ میں سیکرٹری کو ملانے ہوتا تو یہ کھیل آج یہیں ختم ہو جاتا۔ میں اپنی سادھی جاگیر، محل اور دیگر اشیاء تمہارے نام پر چھوڑ رہا ہوں۔ گو یہ دولت ان مصائب اور تکالیف کا ازالہ تو نہیں کر سکتی جو میری ذات کی وجہ سے تمہیں پہنچے۔ پھر بھی اس سے مجھے تسکین ہوگی۔ صبح جب تمہیں یہ خط ملے گا۔ ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ آچکا ہو گا..... مجھے اس بات کا دکھ نہیں.....

ٹاہید اس بد قسمت انسان کو کبھی کبھی دے خیر سے یاد کر لیا کرتا۔ جو باپ ہوتے ہوئے بھی تمہیں بیٹی نہ کہہ سکا۔ جو تمہاری پیشانی پر ایک بار بھی شفقت آمیز بوسہ نہ دے سکا۔ جو تمہیں سینے سے لگا کر اپنے دکھوں کا

وقت تو اعتماد مجھے اپنے آپ پر بھی نہیں تھا۔

”اور اب؟“ منصور نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اب؟“ اس نے سر اٹھایا۔ اور منصور کو دیکھ کر اس ظالم اداسے مسکرائی کہ منصور کو سٹیئرنگ پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تاہید کاسر زندگی میں پہلی بار اک شانِ نفاخرے اٹھا ہوا تھا۔ منصور کے بازو کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ اور تاہید کی روح کیفِ مسرت سے جھوم اٹھی۔

”آج اگر وہ خود کشی کر لیتی تو۔ اس خیال سے ہی اسے خوف آ گیا۔

منصور تیزی سے کار چلا رہے تھے۔ تاہید ان کے پہلو میں مسکرا رہی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی محبت ادھوری تھی۔ عشق خام تھا۔ اور آج کے انکشاف سے یہ ادھوری محبت مکمل ہو گئی ہے۔ ان کے عشق میں پختگی آ گئی ہے۔

موٹر تیزی گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔

دور یہ اونچے اونچے درختوں سے گھری قصر فردوس کی چوڑی سڑک طے کر کے گاڑی پور نیکیوں میں رکی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر ارغوانی قالین تیز برقی روشنی میں چمک رہا تھا۔ منصور اترے تاہید کے جذبات میں ایک طوفانی ہانپل تھی۔ وہ منصور کے بازو کے سارے جیسے خواب میں چل رہی تھی۔

دونوں خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ زلفی روشن تھی۔ ان کے کمرے میں سے ان سیکرٹری نکل کر دوسری طرف جا رہا تھا پردہ ابھی تک لرز رہا تھا۔ تاہید کے دل کی تیز دھڑکن منصور محسوس کر رہے تھے۔ ہاتھ بدھا کر منصور نے پردہ ہٹایا۔ زلفی کی شاندار خواب گاہ کی ہر چیز تیز روشنی میں چمک رہی تھی میز کے اوپر بچکے وہ تیزی سے کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے پریشان بال پیشانی پر پڑے تھے۔ اور ان کے چہرے پر اک وحشت ناک ویہانی تھی۔

آہٹ پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔ تاہید اور منصور دروازے سے اندر آ رہے تھے۔ زلفی کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ حیرت سے یا مسرت سے۔ یہ وہی مجھے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاہید منصور کے بازوؤں سے اس طرح نگلی جس طرح تیر کمان سے۔

”ابا۔“ زندگی میں پہلی بار اس نے اس لفظ کی چاشنی کو محسوس کیا۔ وہ زلفی کی چھاتی لگ کر بار بار یہی پیارا اور میٹھا لفظ دہرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے اور زلفی کے آنسو اس کے آنسوؤں میں مدغم ہو رہے تھے۔

اور بیس برس کی جلتی ہوئی آگ ان آنسوؤں سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ منصور قریب کھڑے اس حسین ملاپ کو عیتِ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھگ گئے تھے۔